دور جدید میں ہندوستان کا صنعتی ارتقا

سلسلۂ نصابات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

نشان ......

دورِ جدید میں

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

طبع ثانی ۱۹۳۸ء

از

ڈی، آر گیڈگل

ایم اے، ایم ایل (کنٹب)

مترجمۂ

مولوی محمد احمد صاحب سبزواری

ایم اے (جامعۂ عثمانیہ)

۱۳۶۴ھ ۱۳۵۴ف ۱۹۴۵ء

مطبوعۂ

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

دورِ جدید میں ہندوستان کا صنعتی ارتقا

دیباچۂ مترجم

یوں تو معاشی واقعات ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں، اور ان پر گوناگوں اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی ایک خصوصیت رہی کہ یہاں صنعتی حیثیت سے جو کچھ بھی ترقی ہوئی وہ بڑی حد تک گزشتہ جنگ عظیم کی رہین منت ہے، یہ زمانہ ہندوستان میں بڑی صنعتی چہل پہل کا رہا، مگر ان میں سے بعض صنعتیں مثلاً مغنیسہ، شورہ، ابرک، ولفرم وغیرہ کی طلب جنگ کے بعد ختم ہوگئی اور یہ پھر کس مپرسی کے عالم میں پہنچ گئیں، البتہ بعض جدید صنعتیں جو اس دور میں قائم ہوئیں برابر ترقی کرتی رہیں، اور پرانی صنعتوں میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔

گزشتہ جنگ نے ہندوستان کے معاشی حالات میں جو انقلاب پیدا کیا اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد بخوبی ہوجاتا ہے نیز جنگ نے معاشی نظام کو بھی درہم برہم کردیا اور کافی عرصے کے بعد حالات اوسط درجہ پر آئے تھے کہ ایک دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی جو سائنٹفک طریقوں، لڑنے والوں کی تعداد کی زیادتی اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر پہلے سے زیادہ شدید ہے مگر اس سے دور حاضر کے طالب علم کو مماثل حالات کے تقابل کا بڑا اچھا موقع مل جاتا ہے، جنگ عظیم میں جو کچھ ہوا بالکل اسی طرح کے واقعات آج کل پیش آرہے ہیں، مثلاً خاص خاص صنعتوں اور بالخصوص جنگی اغراض والی مصنوعات

میں حیرت انگیز ترقی، اشیائے خوردنی کی قلت، قیمتوں میں اضافہ آسٹریلیا سے گیہوں کی درآمد، معیاری کپڑے کا سوال، بازاروں کی لوٹ مار، نگرانی نرخ اشیا، صنعتوں پر حکومت کی نگرانی، ریلوں اور جہازوں کی قلت، موازنوں میں کثیر خسارے، افراط زر وغیرہ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی جنگ میں یہ چیزیں چھوٹے پیمانے پر تھیں اور اس مرتبہ ان کی شدت اور وسعت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بعض چیزیں مثلاً سائیکلیں، موٹریں، جہاز، رائفلیں، مشین گنیں، ہوائی چھتریاں، المونیم وغیرہ پہلی مرتبہ ہندوستان میں تیار ہورہی ہیں، بعض چیزوں مثلاً لوہے و فولاد کی مصنوعات، کپڑا، جوتے، ربر، شکر وغیرہ کی پیدائش میں بہت کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ اب ہندوستان میں جتنے کارخانے ہیں اتنے پہلے کبھی موجود نہ تھے، اور لازمی طور پر ان میں مزدوروں کی زائد تعداد بھی کام کررہی ہے، اجرتوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے، البتہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ضروریات زندگی کی عام قیمتوں میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے اجرت صحیح بڑھی ہے یا نہیں۔ زراعت میں کوئی بنیادی تبدیلی تو نہیں ہوئی لیکن بعض ناگزیر حالات کے تحت قابل لحاظ تغیر ضرور ہوا اُن گھریلو صنعتوں میں ترقی ہورہی ہے جن کی جنگی ضروریات کے لیے مانگ ہے جیسے کمبل سازی وغیرہ۔

بہرحال اگر گزشتہ جنگ نے ہندوستانی صنعتی ارتقا کی بنیاد ڈالی تو موجودہ جنگ نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی، اور اب ہندوستان بڑی حد تک اپنی ضروریات کی چیزیں خود تیار کرنے لگا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کی اکثر صنعتیں جنگی ضروریات کی تکمیل کررہی ہیں اور شاید لڑائی کے بعد ان کو پھر پہلے کی طرح کس مپرسی کا شکار ہونا پڑے، مگر اس مرتبہ ابھی سے جنگ کے بعد والے مختلف مسائل پر بھی غور کیا جارہا ہے لہٰذا اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ ان میں سے بیشتر چیزیں برقرار رہیں گی۔ لیکن ان پر

تفصیلی تبصرہ تو آیندہ مصنف کا کام ہے۔ فقط

۱۶ ر مارچ ۱۹۴۳ء ۔ محمد احمد سبزواری

طبع سوم پر نوٹ

اعداد و شمار کی جدولوں کو بڑھانے اور کتاب کو تازہ ترین بنانے کے لیے آخری باب میں بعض نئی چیزوں کا اضافہ کرنے کے علاوہ اس مرتبہ کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی۔

جون ۱۹۳۳ء — ڈی، آر، گیڈگل

دیباچہ طبع دوم

پہلی اشاعت کے مقابلے میں صرف چند غیر اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ کتابوں اور مضمونوں کے حوالوں کو میں نے چھوڑ دیا کیونکہ یہ فہرست پہلے ہی ضرورت سے زیادہ طویل تھی اور اگر اب اس میں مزید اضافہ کیا جاتا تو اور زیادہ طویل ہو جاتی۔

دوسری اشاعت میں ہندوستان کے صنعتی ارتقا کے اس خاکے کے تسلسل کو موجودہ دور تک قائم رکھنا ضروری تھا، اس لیے میں نے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ جس میں ۱۹۱۴ء کے بعد سے تمام پہلوؤں

پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ طریقہ میں نے اس وجہ سے اختیار کیا کہ نئی معلومات کو پرانے ابواب میں جگہ جگہ شامل کرنے سے کام بڑھ جاتا اور متن میں بڑی تبدیلی ہو جاتی، جنگ اور مابعد جنگ کے جو اثرات مترتب ہوئے ان کو نتائج کے تحت، ایک نئے باب میں ظاہر کر دیا ہے، ورنہ کتاب کا اہم حصہ دراصل ۱۹۱۴ء تک کے ارتقا کا خاکا ہے۔

اس اشاعت کی تیاری اور طباعت کے سلسلے میں مجھے بہت سے احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر بمبئی لیبر آفس کے مسٹر ایس، آر دیشپانڈے، بی، لٹ (آکسن) ہیں، جنھوں نے مختلف مطبوعات میرے علم میں لا کر میری گرانبہا امداد کی نیز بہت سے مفید اور ناقدانہ مشورے بھی دیے۔

دیباچہ طبع اول

یہ کتاب، جو اب شائع ہو رہی ہے در اصل وہ مقالہ تھا جو جامعہ کیمبرج میں ایم، ل کی ڈگری کے واسطے تیار کیا گیا۔ اور اب اس کو زبان کی چند ترمیموں کے علاوہ بجنسہ مقالے ہی کی شکل میں شایع کیا جا رہا ہے، ان صفحات میں گزشتہ صدی کے پانچویں عشرے سے ۱۹۱۴ء کی جنگ تک ہندوستان کی معاشی تاریخ کے خاکے کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، میں نے اس خاکے کو موجودہ عہد تک لاکر تکمیل نہیں کی کیونکہ جنگ کی وجہ سے عالمی معاشی توازن کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ بہت شدید ہے اور ابھی حالات اس قابل نہیں ہوئے کہ ہم گزشتہ عشرے کے اثرات کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں۔

موضوع بہت وسیع ہے، اور اس معاشی عبوریت کے دور میں سب سے زیادہ ڈرامائی واقعہ غالباً قدیم دستکاریوں کا زوال ہے، ان کا زوال فوری اور مکمل تھا، دوسری صورتوں میں واقعات آہستگی سے تغیر ہوتے رہے اور ان کی رفتار سست رہی، سب سے زیادہ عظیم الشان تبدیلی تجارت کی وسعت اور طریق میں ہوئی اس تبدیلی کی تہ میں گزشتہ صدی کے پانچویں عشرے والی نقل و حمل کی ترقی کام کر رہی تھی۔ ذرایع نقل و حمل کی سہولتوں کا یہ عظیم الشان ارتقا جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا در اصل ہندوستان کے آہستہ اور ایک طرفہ انقلاب کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذرایع

نقل و حمل میں آہستہ آہستہ اضافے نے ہندوستان کی قدیم دستکاریوں کو سانس لینے کا موقع دیا تاکہ وہ اپنی تنظیمی حالت درست کرلیں، اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیں، لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مطلب جمود ہی تھا۔ زرعی دائرے میں سب سے اہم تبدیلی زراعت کی تجاریت تھی۔ لیکن تصویر کا سب سے زیادہ نازک رخ مسئلہ آبادی ہے۔ اگر کسی چیز میں اضافہ ہورہا ہے تو وہ صرف زمین کا بار ہے، اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ کل رقبۂ کاشت میں اضافے کے باوجود اشیائے خوردنی کا رقبہ مستقل رہا حالانکہ گزشتہ چند عشروں میں رقبۂ کاشت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا، نیز یہ امر زرعی اور صنعتی خوشحالی دونوں کو باہم منسلک بھی کردیتا ہے اور اس بات کی ضرورت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ زمین کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے صنعتی ترقی کو تقویت دینا ضروری ہے۔ جن صنعتوں میں ترقی ہوئی ان میں دو کارخانے والی اور ایک محل بند صنعت تھی، ان کے علاوہ ترقی مختصر، غیر مسلسل اور قطعی یک طرفہ تھی۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں جو معاشی حالات ہیں ان میں اور ان حالات میں جو عہد سابق میں مغرب میں رہ چکے ہیں کوئی زیادہ فرق ہے، میں نے رائے زنی کے ذیل میں خاص طور پر مزدوروں کی قلت اور شہری مصنوعات کی تنظیم والے باب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ارتقائی منازل وہی تھیں جو مغرب کے بعض ملکوں میں رہ چکی ہیں۔ البتہ بعض یورپی ممالک میں انیسویں صدی کے درمیان جو فوری صنعتی ترقی ہوئی وہ یہاں ناممکن معلوم ہوتی ہے، رفتار سست رہے گی ایسی بڑی صنعتیں جن میں پیچیدہ مشینوں کی ضرورت ہے یا جن میں ضمنی پیداواروں کا استعمال ہے ابھی پیدا ہونے کی امید نہیں، ترقی صرف ان صنعتوں میں ہوگی جو یا تو زرعی کاموں سے متعلق ہیں یا جو ملک میں پیدا ہونے والی خام زرعی پیداواروں پر کام کرتی ہیں۔

جو موضوع میں نے منتخب کیا وہ بہت وسیع اور مشکل ہے اور

اس کو ایک مقالے کے معینہ حدود میں احاطہ کرنا میرے امکان سے باہر تھا، مجھے بہت سے اہم پہلو مثلاً بنکوں کی ترقی وغیرہ چھوڑ دینا پڑے، اور بعض دوسرے مسائل کا بھی محض سرسری تذکرہ کیا۔ دراصل میں نے یہ کوشش کی کہ جدید معاشی تاریخ کا ایک خاکا پیش کردیا جائے اور ہندوستان کی زرعی اور صنعتی تنظیم میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی وسعت و نوعیت کو ظاہر کردیا جائے مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ خیالات نئے ہیں، نہ ان کی ترتیب و تنظیم میں کوئی جدت ہے، اور مجھے معافی یوں مل سکتی ہے کہ میں نے اس کام کو اس صورت میں شروع کیا جبکہ ہندوستان کی حالیہ معاشی تاریخ پر کوئی کام نہیں ہوا تھا اور مجھے یہ معلوم ہوکر بڑی خوشی ہوگی کہ اگر کوئی جویائے علم اس کتاب سے متاثر ہوکر اس بیس ماندہ مگر اہم مسئلے کو اپنے لیے منتخب کرلے۔

میں مسٹر ایچ، ڈی، ہینڈرسن (کلیر کالج کیمبرج) کا بے حد ممنون ہوں اور الفاظ میں ان کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا، یہ دراصل انھی کی شفقت آمیز ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور میں ان کی تنقید اور مشوروں سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا مجھے مسٹر ڈبلیو، یس، تھیچر (فٹز ولیم ہال) کا بھی ان کے قیمتی مشوروں کے متعلق شکریہ ادا کرنا ہے نیز میں اپنے دوست مسٹر جے، وی، جوشی کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں میری مدد کی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

(1)

تمہید

انیسویں صدی کے درمیان نقل وحمل کے طریقوں میں ایسا زبردست انقلاب ہوا کہ ساری دنیا ایک بازار میں تبدیل ہو گئی، اس سے جو صورت حال رونما ہوئی اس نے گزشتہ معاشی اداروں کو پس پشت ڈال دیا اب تو معاشی حالت میں تبدیلیاں پیدا کرنے والی قوتیں پورے پورے براعظموں پر کارفرما ہوتی ہیں، دنیا کی تاریخ کے اس معاشی عبوریت کے تازہ ترین دور میں ایک چیز بہت نمایاں ہے یعنی یہ تبدیلی جو ابتدا میں دنیا کے صرف ایک حصے میں واقع ہوئی اس نے آہستہ آہستہ دنیا کے سارے معاشی نظام کو متاثر کر دیا، ہندوستان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہ رہا، اس نے ابتدا ہی سے ان قوتوں کے اثرات قبول کرنا شروع کئے اور حتیٰ کہ انیسویں صدی کے دوران میں اس کے معاشی نظام میں خاصی تبدیلی ہونے لگی۔ لیکن اس کا صحیح تعین کرنا کہ کس وقت سے ان قوتوں نے اپنا کام شروع کیا بہت مشکل ہے، کسی ملک کی تاریخ میں کسی دو ادوار کو ایک قطعی حد فاصل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ چیز بہ نسبت دیگر ممالک کے ہندوستان کے لیے بہت زیادہ صحیح ہے۔

معاشی عبوریت کے سلسلے میں جو اثرات کام کر رہے تھے ان میں غالباً سب سے پہلا سبب ہندوستان میں برطانوی راج کا قیام تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ برطانوی مصنوعات کا ہندوستانی صنعت سے مقابلے کا آغاز ہوا، لیکن خود برطانوی راج بہت آہستہ آہستہ اور ایک طویل عرصے میں قائم ہوا، اگر ایک طرف بنگال لارڈ کلائیو کے زمانے میں حاصل کر لیا گیا تو دوسری طرف بالائی برما لارڈ ڈفرن کے عہد میں برطانوی قبضے میں آیا۔ ان دونوں میں سو سال سے زاید کا وقفہ ہے دوسرا اہم سبب انگریزوں کے جاری کردہ نئے طریق مالگزاری کا نفاذ ہے، جس کو ایک کے مقابلے میں متعدد کہنا زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ یہ طریقے مختلف صوبوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اسی کے ساتھ ایک نئے عدالتی نظام کا آغاز بھی ہوا، اگرچہ نظام حکومت میں یہ تمام تبدیلیاں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہوگئی تھیں مگر ۱۸۵۷ء تک بھی ان کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ یہ تغیرات ہندوستان کے معاشی نظام پر بتدریج اثر انداز ہو رہے تھے مگر ان کے مجموعی اثرات کچھ زیادہ اہم نہ تھے۔ خاص اور اہم سبب جس کی بدولت معاشی تغیّر رونما ہوا، ہندوستان میں ریلوں اور سڑکوں اور جہازوں کے نئے راستوں کا کھلنا تھا جس نے ہندوستانی بازاروں اور ہندوستان کے خام مال کو مغرب سے قریب تر کر دیا۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی صنعت و تجارت پر مغربی طریق پیدائش اور طریق مبادلہ کا براہ راست اثر پڑا اور در اصل یہی وہ چیز تھی جس نے ہندوستانی صنعتی نظام کو حقیقی طور پر متاثر کیا۔

اس رابطے کے اثرات کا صحیح اور مناسب تصور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے قدیم معاشی نظام پر ایک نظر ڈالی جائے۔ ہندوستان آج بھی نمایاں طور پر ایک زرعی ملک ہے اور ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے، سارے ہندوستان کی سب سے پہلی مستند مردم شماری ۱۸۷۲ء میں ہوئی اس سے پتا چلتا ہے کہ بالغ مردوں کی آبادی کا ۵۶٫۳

فی صدی حصہ زراعت میں مصروف تھا، اس میں ۲۰۱۳ فی صدی عام مزدوروں کو بھی شامل کر دینا چاہئے جس سے میزان ۵۔۶۸ فی صدی ہو جاتی ہے، گویا اس وقت بھی بالغ مردوں کی اتنی کثیر تعداد اپنی روزی زمین سے کما رہی تھی[1]۔ ایسے کوئی قراین موجود نہیں جن سے یہ سمجھا جاسکے کہ زرعی کاموں میں آبادی کا اس سے کم تناسب مشغول رہا ہو، لیکن محض یہ اعداد ہندوستان میں زراعت کی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ کیونکہ دیہی آبادی کا بیشتر وہ حصہ بھی جو صنعتی پیشوں میں مصروف تھا ضمنی پیشے کی حیثیت سے زراعت کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں سب سے اہم ادارہ گاؤں تھا اور ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کا رقبہ مختلف اور گوناگوں تھا میدانی علاقوں میں متوسط گاؤں کافی بڑا ہوتا تھا یعنی اس کی حیثیت قریب قریب انگلستان کے قصبوں کے مساوی تھی، اس کے برخلاف پہاڑی اور بنجر علاقوں میں یہ بہت چھوٹا ہوتا تھا، ایسی صورت میں اس کو قریہ یا چند منتشر مکانوں کا مجموعہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ہندوستان کی کل آبادی میں کاشتکاروں ہی کی اکثریت تھی، انیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی حالات کے اختلافات کی وجہ سے سارے ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت یکساں نہ تھی، بمبئی دکن کے علاقے میں ایک معمولی کاشتکار اتنا ہی مطمئن تھا جیسا کہ اس کا معاصر انگلستان میں[2] لیکن ہندوستان کے اکثر دوسرے حصوں میں ڈاکوؤں کی لوٹ مار اور ملک کی عام افراتفری کی وجہ سے ان کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ بحیثیت مجموعی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں کاشتکاروں کی عام حالت اچھی نہ تھی، بنگال کا دوامی بندوبست

۴

[1] یہ تخمینہ خود بہت کم تھا جیسا کہ بعد کی مردم شماریوں سے ظاہر ہوا۔

[2] جی، کیٹنگ۔ بمبئی دکن کی دیہی معیشت، باب اول (۱۹۱۲ء) دکن کی جانب یہ اشارہ ۱۸۰۲ء کے ہلکر کے حملے اور اس کے بعد والے قحط سے قبل کا ہے۔

چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو زمینداروں کے مظالم سے محفوظ رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی انگریزوں کی تشخیص کردہ مالگزاری بہت زیادہ تھی[1]، اس کا بہت تباہ کن اثر پڑا مثلاً بمبئی دکن کے شاداب علاقے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں کے زیرِ نگیں آجانے کے بعد گویا مرجھا کر رہ گئے[2]۔ ۱۸۳۶ء میں ان کو بعض مراعات دی گئیں مگر کاشتکاروں کو مالگزاری کے سابقہ بوجھ اور اس کے تباہ کن اثرات سے پنپنے کے لیے تقریباً پچیس سال لگ گئے۔ صوبۂ مدراس میں بھی کاشت کاروں کی حالت اچھی نہیں کہی جاسکتی اور وہاں بھی مطالبات مالگزاری بہت شدید تھے[3]۔ کاشتکاروں کی اس زبوں حالی کی وجہ سے حکومت بعد میں شرح مالگزاری میں کمی کرنے پر مجبور ہوئی اور دوسرے اسباب کے علاوہ اس تخفیف سے بھی کاشتکاروں کی حالت تھوڑی بہت سنبھل گئی[4]۔

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں ہندوستان کے اندرونی ذرایع نقل وحمل کی حالت بہت ہی ناقص تھی، ملک کے اکثر حصوں میں سڑکیں بالکل نہ تھیں اور جہاں تھیں وہاں ان کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ سندھ وگنگا اور ان کے معاون ہی صرف ایسے دریا تھے جن میں کسی بڑی حد تک کشتی رانی ہوسکتی تھی۔ ان دریاؤں اور چند بنی ہوئی سڑکوں کی بدولت ہی سارا کام چلتا تھا۔ جنوبی ہند کی طرح شمالی ہند میں ذرایع

---

[1] آر، سی، دت۔ ہندوستان وکٹوریا کے عہد میں۔ حصۂ اول۔

[2] پونا اور احمد نگر کے بلووں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، باب دوم (۱۸۷۵ء)۔

[3] ایس ایس راگھویان گر۔ صوبۂ مدراس کی گزشتہ پنجاہ سالہ ترقی کی یادداشت۔ فصل سوم (۱۸۹۳ء)۔

[4] آر، بیرڈ اسمتھ ۱۸۳۲ء میں صوبجات شمال ومغرب کے کاشتکاروں کی حالت کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ مالی نظام بہت ہی غیر منصفانہ اور تباہ کن تھا۔ بالخصوص مالگزاری اور عدالتی نظام کے طریقوں نے کاشتکاروں کے عزیز ترین حقوق کو پامال کردیا تھا، جس کی وجہ سے کاشتکار نہ صرف غیر مطمئن بلکہ بڑی پریشانی کی حالت میں تھے صوبجات شمال ومغرب اور پنجاب کے ۱۸۶۰-۶۱ء والے قحط کی

نقل وحمل کچھ بڑے نہ تھے، جنوب کا کچھ اندازہ حکومت مدراس کے مقرر کردہ کمشنران امورِ عامہ کی رپورٹوں سے ہو سکتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ صدی کے اوائل میں صوبے میں سڑکیں تقریباً بالکل موجود نہ تھیں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے حالات کو بہتر بنانے کی کچھ کوشش کی مگر صوبے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں، کمشنروں کے مندرجۂ ذیل بیان سے سڑکوں کی حالت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے "تمام بنی ہوئی یا پختہ سڑکیں جیسی کہ وہ کہلاتی ہیں محض اس حد تک بنائی گئی ہیں کہ ان پر سے بیل گاڑیاں گزر سکیں۔ خشک موسم میں بیل گاڑیاں ہلکے وزن کے ساتھ بڑی سست رفتار سے ان پر چھوٹے چھوٹے فاصلے طے کر سکتی ہیں لیکن چونکہ ان سڑکوں کا بڑا حصہ بغیر پلوں کا ہوتا ہے اس لئے جب کوئی نالا سڑک پر سے گزرتا ہے تو معمولی بارش کا ایک تیز جھلا نقل وحمل کے سلسلے کو منقطع کر دیتا ہے، اکثر جگہ وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ گیلی زمین پر پہیوں کے بوجھ کو برداشت کر سکیں۔ اور برسات کے مہینوں میں مویشی اور پیدل چلنے والے مسافروں کے علاوہ ان سے اور کوئی کام نہیں لیا جا سکتا[1]۔ اس لئے یہ کچھ زیادہ تعجب خیز بات نہیں کہ زرعی پیداواروں کے لیے بیل گاڑیوں کے کرایے بہت زیادہ تھے، اس وجہ سے تجارت بہت کم ہوتی تھی خراب سڑکوں کی وجہ سے ملک کے اکثر حصوں میں جو گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں وہ بھی پرانے طرز کی ہوتی تھیں، اور خراب سڑکوں کی وجہ سے ناقص گاڑیاں استعمال کرنے کا ثبوت اس طرح بھی ملتا ہے کہ جب ۱۸۶۰-۶۵ء کے درمیان صوبۂ متوسط کی سڑکوں کی حالت اچھی ہوگئی تو فوراً ہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ رپورٹ صفحہ ۲۱۔

[1] مدراس کے کمشنران امورِ عامہ کی پہلی رپورٹ (۱۸۵۲ء)۔ ۱۸۴۶ء میں صوبۂ مدراس میں ان بنی ہوئی سڑکوں کا طول بھی صرف ½۳۱۱۰ میل تھا۔

اچھی قسم کی گاڑیاں استعمال ہونے لگیں[1]۔ ذرائع نقل و حمل کی اس کمی کا اثر کسی ملک کی تجارت برآمد کی مقدار پر تو اہم ہوتا ہی ہے مگر اسی کے ساتھ اندرونی تجارت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے بھاری اور ارزاں چیزوں کا منتقل کرنا تو تقریباً ناممکن تھا۔ اور تجارت عام طور پر ملکی اور قیمتی اشیا تک محدود تھی[2]۔ لیکن ان چیزوں کی تجارت میں بھی وسعت نہ تھی۔ ڈاکٹر برڈ وڈ مرکزی عجائب گھر کے متعلق اپنی رپورٹ بابت ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں کہ "کوفت گری اور آگرے کے نازک ابرقی سامان سے بمبئی اس وقت تک قطعاً ناواقف تھا جب تک کہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے یہ چیزیں عجائب گھر روانہ نہیں کیں[3]۔" یہ بات اس لیے اور زیادہ تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ مرہٹوں کی حکومت کے زمانے میں دکن اور شمالی ہند کے درمیان بڑی اچھی تجارت ہوتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ شمالی ہند کی بہت سی نادر اشیا سے جنوبی ہند ناواقف تھا۔ اور اس کا لازمی اثر یہ تھا کہ بہترین اور عمدہ خصوصیات رکھنے والی مقامی اشیا کا بازار بہت ہی محدود ہو گیا تھا[4]۔ اس طرح جہاں تک اشیائے تجارت کی اقسام اور فاصلے کا تعلق تھا انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں ہندوستان کی تجارت بہت ہی محدود ہو گئی تھی۔

---

[1] ہندوستانی قحط کمیشن کے سامنے سٹرنگوس کی شہادت (۱۸۸۰ء) فصل متعلق زرعی ترقی۔

[2] شمالی ہند میں حالات کچھ بہتر تھے اور دریاؤں کے کنارے وزنی چیزوں کی اچھی خاصی تجارت ہوتی تھی وسط ہند کے اکثر حصوں میں بھی یہی حال تھا۔ مثلاً مرزاپور، ناگپور و برار کی روئی کی ایک بڑی منڈی تھا۔ لیکن روئی کا بڑا حصہ گاڑیوں کے بجائے بیلوں پر لے جایا جاتا تھا۔ جے، الف، رائل، ہندوستان میں روئی کی کاشت و تجارت ص ۸۲-۸۳ (۱۸۵۱ء)۔

[3] منقول از جے، ایف، واٹسن، ہندوستان کی صنعتی تحقیق کا خاکا، ص ۵، حاشیہ (۱۸۷۲ء)۔

[4] حوالۂ مندرجۂ بالا ص ۵۔

جب کسی ملک کی اندرونی تجارت کا یہ حال ہو تو ملک کے ایک حصے کی قیمتوں کا دوسرے حصوں کی قیمتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سہل تجارت کا دائرہ اس قدر تنگ ہوگیا کہ قیمتوں اور خصوصاً اشیائے خوردنی کے نرخوں میں فوری اور شدید تغیرات ہونے لگے ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اشیائے خوردنی کی قیمتیں کسی ایک مخصوص سال میں اس سال کی بارش کی نوعیت سے متعین ہوتی ہیں۔ سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر سے پہلے مقامی فصلوں کی تباہی کے بعد رسد کو پورا کرنے والے اضلاع کی عدم صلاحیت کی وجہ سے قیمتوں میں بہت زیادہ تغیرات ہوجاتے تھے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۱۸۱۲ء میں کیرا (گجرات) میں باجرہ روپے کا ۷½ سیر فروخت ہو رہا تھا تو ۱۸۱۵ء میں یہ گر کر روپے کا ۳۱ سیر ہوگیا۔ ۱۸۳۲ء میں [illegible] (مدراس) میں چاول ۷۵ سیری روپیہ تھا لیکن ۱۸۳۳ء میں یہ بڑھ کر روپے کا ۳۳½ سیر ہوگیا۔ اسی طرح دھلیا (خاندیس) میں ۱۸۲۶ء میں جوار ۱۹ سیر فی روپے سے گر کر ۱۸۴۸ء میں ۸۵½ سیر ہوگئی[۱] ملک کے مختلف حصوں میں جو غیر معمولی تغیرات ہوتے تھے وہ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ۱۸۰۲-۳ء میں دکن اور راجپوتانے میں ایک سخت قحط پڑا لیکن گجرات میں باجرے کی قیمت ۲۷ سیری روپے سے زیادہ نہ بڑھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثال یہ ہے کہ ۱۸۳۳ء میں صوبجات شمال ومغرب میں ایک شدید قحط پڑا اس وقت آگرہ میں گیہوں کا بھاؤ ۱۳½ سیر تھا، لیکن اس نے خاندیس کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا جہاں

۶

[۱] میجر جنرل برگس نے پارلیمنٹری مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں کہا کہ خاندیس میں ۱۸۲۳ء میں غلہ ۶ شلنگ سے ۸ شلنگ فی کوارٹر ہوگیا، اورنگ آباد میں یہ ۴۴ شلنگ فی کوارٹر، اور پونا میں ۴۶ سے ۷۰ شلنگ فی کوارٹر کے درمیان تھا۔ لیکن بارش اور سڑکوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے خاندیس کا غلہ پونا نہ پہنچ سکتا تھا، نقل کردہ ڈبلیو آر ایس ہملی کی روئی صفحہ ۲۹۷ (سنہ ۱۸۶۱ء)

اس سال گیہوں کی بہتات تھی اور وہ روپے کا ۶۱ سیر فروخت ہو رہا تھا۔ اس قسم کے حالات میں وہی چیز قحط ہو جاتی تھی جس کو اب ہم مقامی قلت کہتے ہیں اور قحطوں کی وجہ سے بعض وقت اموات بہت زیادہ ہوئیں[1]۔

ہندوستان میں زرعی آبادی ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی مگر اسی کے ساتھ ساتھ صنعتی آبادی بھی دیہات میں پھیلی ہوئی تھی۔ زرعی معیشت کی اس نمایاں فوقیت کا یہ مطلب تھا کہ اس وقت ہندوستان میں شہری آبادی بہت کم تھی اور وہ کسی صورت میں مجموعی آبادی کی ۱۰ فی صدی سے زاید نہیں تھی اور ان میں سے بھی اکثر وہ مقامات جو قصبے کہلاتے تھے در اصل ترقی یافتہ گاؤں تھے[1]۔ ہندوستان کے قصبے زیادہ تر ان تین اسباب پر مبنی تھے۔ اولاً وہ کسی قسم کی زیارت گاہ یا تبرک مقام تھے۔ دوسرے وہ کسی دربار کا صدر مقام یا صوبے کا دار الحکومت تھے یا تیسرے وہ تجارتی مرکز تھے، جن کو تجارتی راستوں پر اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان اسباب میں سے پہلے دو سبب بہت اہم تھے، پہلے سبب کی خاص مثالیں بنارس، الٰہ آباد، پوری، گیا وغیرہ ہیں۔ ان مقامات نے اس وقت تک غیر معمولی ترقی کی جب تک کہ وہ مذاہب مقبول رہے جن کا ان قصبوں سے تعلق تھا۔ چنانچہ بدھ گیا کی صورت میں یہی ہوا کہ جب اس مقام سے تعلق رکھنے والا مذہب غائب ہونے لگا تو اس کی اہمیت بھی گھٹنے لگی، ان مقامات میں بڑی تعداد ہندوؤں کی زیارت گاہیں تھیں[2]۔ ان کی ترقی صدیوں سے قایم تھی اور یہ

---

[1] اعداد و شمار کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ محض ایک قیاس ہے، یہ اعداد اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ یہ تناسب ۱۸۷۲ء کے اعداد سے کچھ زیادہ متجاوز نہیں، حالانکہ انیسویں صدی کے آغاز سے زوال کی مختلف مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً مرشد آباد، یا بعض جگہ اس کے برخلاف اضافہ ہوا مثلاً بمبئی، کلکتہ، کانپور وغیرہ۔

[2] اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے، ہندوستان میں جو دوسرے

انیسویں صدی تک برابر ترقی کرتے رہے، مگر اس قسم کے قصبات کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی اور ان میں غیر محدود ترقی کی صلاحیت بھی نہ تھی۔

درباروں کی وجہ سے وجود میں آنے والے قصبات زیادہ اہمیت رکھتے تھے اور ان کی مجموعی تعداد بھی زیادہ تھی۔ دربار خواہ شاہی ہو یا کسی چھوٹے سے سردار کا جو ایک مختصر سے علاقے پر حکومت کرتا ہو، لیکن دونوں صورتوں میں قصبوں کی صورت ایک ہی تھی[1]۔ مگر ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جب دربار کی شان و شوکت ختم ہو جاتی تو یہ تنزل کرنے لگتے تھے دکن کے چھوٹے چھوٹے خطوں سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پیٹن اور دیوگری کے قدیم پائے تخت ہندوؤں کی طاقت ختم ہو جانے کے بعد ہی غیر اہم ہو گئے، اس کے بعد اسلامی خاندانوں نے احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے میں اپنی سلطنتیں قایم کر لیں، بیجاپور اپنے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے کم نہیں تھا۔ لیکن عادل شاہی خاندان کے زوال کے بعد اس کی ساری شان و شوکت ختم ہو گئی، اور صرف یادگاریں باقی رہ گئیں۔ دراصل ہندوستان میں قصباتی زندگی کی خصوصیات درباروں کے اثرات ہی سے متعین ہوتی تھیں قصبے کا انحصار امرا اور ان کے متعلقین پر ہوتا تھا۔ اور دراصل کبھی کبھی تو یہ محض ایک نیم مستقل کیمپ ہوا کرتا تھا۔

قصبات کی آخری قسم تجارتی قصبوں کی تھی، اور ان کی اہمیت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ مذاہب پیدا ہوئے وہ یا تو بالکل ختم ہو گئے یا انھوں نے تنزل کیا، بدھ مت اور اس کے متبرک شہروں کا یہی حال رہا جینیوں کا متبرک مقام بھی زیادہ اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ بعض مقامات کو مسلمانوں کے دینی پیشواؤں کی بدولت کافی ترقی ہوئی، اجمیر کی شہرت میں ایک مسلمان بزرگ کے مزار کو کافی دخل ہے (مترجم)۔

[1] ڈبلیو، ایچ، سلیمان، سیاحت اور یادداشتیں مرتبہ وی، اے اسمتھ جلد دوم، باب ۸ (۱۸۹۳ء)۔

تجارتی شاہراہوں پر اپنی مخصوص جائے وقوع کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی مرزاپور اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اس کی ترقی کا مدار وسط ہند اور بنگال کی تجارت پر تھا۔ اس راستے پر یہ بڑا اہم مقام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دریائے گنگا پر کشتیاں کھینے کا سب سے اچھا آخری مقام تھا۔ اس لیے وسط ہند کی برآمد ہونے والی روئی کا بڑا حصہ یہاں سے گزرتا تھا مگر اس قسم کے قصبوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی[1]۔ کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کی تجارت بہت زیادہ وسیع نہیں تھی اس لیے ان کی اہمیت بھی محدود تھی۔ لیکن ان قصبوں کے مقابلے میں جو محض درباروں پر منحصر تھے تجارتی قصبوں کی حالت کچھ زیادہ مستحکم اور پایدار تھی۔

معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستانی قصبوں کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کا غیر صنعتی ہونا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ ہندوستانی قصبوں میں کسی قسم کی صنعتیں نہیں تھیں بلکہ یہ کہ محض صنعتیں ان کی اہمیت کا باعث نہ تھیں، ہر مقام پر اس کی نوعیت کے لحاظ سے چند صنعتیں ضرور ہوتی تھیں، مثلاً بنارس میں جہاں زائرین کی آمد و رفت رہتی تھی وہاں ہم کو تانبے، پیتل اور بھرت کی مصنوعات نظر آتی ہیں، یہاں زیادہ تر تبرک ظروف بنائے جاتے تھے جو یا تو گنگا جل کے واسطے استعمال کیے جاتے تھے یا ان سے پوجا پاٹ کی اغراض پوری کی جاتی تھیں۔ ان قصبوں میں جن کا انحصار درباروں پر ہوتا تھا ہم کو آسایشی قسم کی صنعتیں زیادہ نظر آتی ہیں، اور چونکہ قصبوں کی یہ قسم اہم ہوتی تھی اس لیے ان ہی سے شہری صنعتوں کی نوعیت متعین ہوا کرتی تھی۔ تار، لچکا،

[1] مثال کے طور پر ۱۸۹۱ء میں صوبجات شمال و مغرب میں ۲۰ ہزار سے زائد آبادی والے شہروں میں سے صرف چھ تجارت کے رہین منت تھے، اور ان میں سے بھی اکثر مثلاً کانپور نے بہت ہی حال میں اہمیت حاصل کی، صوبجات شمال و مغرب کی رپورٹ مردم شماری (۱۸۹۱ء)۔

پارچہ بافی کی بہترین اقسام، زردوزی، چاندی اور سونے کا بہترین کام، قیمتی پتھر، ہاتھی دانت، لکڑی کی نقاشی، اور بہترین قسم کی دوسری نادر دستی مصنوعات ان ہی قصبوں میں نفاست اور عمدگی کے اعلیٰ معیار پر پہنچ گئیں لیکن بازاری اور عام استعمال کی چیزیں جو عوام کے لیے ضروری تھیں وہ سب کی سب دیہات میں تیار ہوتی تھیں، قصبوں میں صرف ایک ہی قسم کی صنعت تھی یعنی فنی اور تعیشاتی اشیا جن کا انحصار درباروں اور امرا کی سرپرستی پر ہوا کرتا تھا صنعتوں کی بقا کے لیے درباروں کا وجود ناگزیر تھا۔ شہری صنعتیں بلا دربار کے زندہ نہیں رہ سکتی تھیں یہی وجہ تھی کہ دربار کے خاتمے کے بعد قصباتی زندگی کا سارا معاشی نظام تنزل پذیر ہو جاتا تھا انیسویں صدی میں اس قسم کے تنزل کی دو مثالیں نظر آتی ہیں۔ پہلی صورت لکھنؤ کی ہے جو نوابانِ اودھ کا دارالحکومت تھا، ۱۸۵۶ء میں یہ صوبہ انگریزی عملداری میں شامل کیا گیا اور نواب کے دربار کا خاتمہ ہو گیا۔ مسٹر ہوئے[1] ان اثرات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ "یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد، چند سالوں کے اندر لکھنؤ کی آبادی میں فوری کمی ہو گئی، صوبے یا ہندوستان کے وہ تمام لوگ جن کو ملازمت یا سرپرستی کا شوق لکھنؤ لے آیا تھا یہاں سے چلے گئے، آبادی کا وہ حصہ جو مقامی حکومت کی وجہ سے مخصوص تجارت میں مصروف تھا اس نے بھی شہر کو خیرباد کہہ دیا"۔ دوسری مثال تنجور کی ہے، ذیل کا بیان ۱۸۹۱ء کی مدراس کی رپورٹ مردم شماری سے لیا گیا ہے۔ "اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تنجور اپنے آخری راجہ کی وفات سے جو ۱۸۵۵ء میں ہوئی، مائل بہ زوال ہے دربار کا وجود (خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو)[2] قصبے کی آبادی پر بڑا اہم اثر ڈالتا ہے کیونکہ یہ مختلف پیشوں کے لوگوں

---

[1] ڈبلیو، ہوئے، شمالی ہند کی تجارت اور مصنوعات پر ایک رسالہ، حصۂ دوم، صفحہ ۲۹ (۱۸۸۰ء)

[2] قوسین کے الفاظ مصنف کا اضافہ ہیں۔

کو اپنے یہاں کھینچ کھینچ کر بلاتا ہے، اور ہندوستان میں خصوصیت سے ایسے مقاموں پر برہمنوں کی بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔"

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں ہندوستان کی معاشی حالت کی جو خصوصیات اوپر بیان کی گئیں وہ اکثر ملکوں میں صنعتی ارتقا کے مماثل مدارج میں پائی جاتی ہیں مگر ہندوستان کی ایک خاص خصوصیت یہاں کی دیہی جماعت ہے جس کا تقابل کہیں اور نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیہی جماعتی ادارہ ایک زمانے میں سارے یورپ اور ایشیا میں مروج رہا ہے مگر ہندوستان میں اس کی نوعیت عجیب ہے، یہاں سوائے بنگال کے شرقی حصے اور آسام کے علاوہ، ہندوستان کی ۹۰ فی صدی آبادی دیہات میں رہتی ہے اور اس لئے یہاں کے معاشی دستور میں دیہی نظام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دیہی جماعت نے ہندوستان کی ترقی کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا۔ مثلاً یہ دراصل دیہات کے خود کفالتی نظام کی عجیب وغریب خصوصیت ہی تھی جس نے مختلف حملوں، حکومتوں اور فرمانرواؤں کی تبدیلیوں کے باوجود بھی ہندوستانی تہذیب وتمدن کو قایم رکھا[1]۔ لیکن ہمارا تعلق صرف ان نمایاں خصوصیات کو ظاہر کرنا ہے جن کا معاشی نظام سے تعلق ہے۔

بیرونی دنیا سے ذرایع نقل وحمل کی دشواریوں کی وجہ سے ہندوستانی گاؤں قریب قریب ایک خود کفالتی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جماعت ۱۰ کی تمام ضروریات مقامی طور پر پوری ہو جاتی تھیں اور صرف بعض مخصوص چیزوں مثلاً نمک کے لیے بیرونی بازار پر نظر ڈالنا پڑتی تھی، یا چھوٹے دیہات میں بعض تعیشاتی اشیا مثلاً زیورات خود گاؤں میں تیار نہیں ہو سکتے تھے،

[1] ان جماعتوں میں حکومت کے تمام ضروری اجزا چھوٹے پیمانے پر موجود ہوتے تھے، اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ اگر دوسری تمام حکومتوں کا خاتمہ ہو جائے تو یہ اپنے ارکین کی حفاظت بخوبی کر سکتی تھیں۔ الفنسٹن۔ دکن وغیرہ پر رپورٹ، نقل کردہ سی، آر، دت، حوالۂ گزشتہ۔

ایک تمثیلی گاؤں کا اندازہ مندرجۂ ذیل بیان سے ہو جائے گا" وہ تمام صنعتیں جو دیہاتیوں کی سادہ ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری تھیں خود گاؤں میں موجود تھیں، پنجابی گاؤں تقریباً خود کفیل تھا وہ اپنا غلہ خود پیدا کرتا، اپنے آلات بناتا، اور اپنے گھریلو برتن خود تیار کرتا تھا، اس کا پروہت اسی کی چار دیواری میں رہتا تھا، البتہ وہاں ڈاکٹر نہیں ہوتا تھا اور اس کو نمک، مسالے، تہواروں کے لیے کپڑوں اور مالگزاری کی ادائی کے لیے سکوں کے علاوہ اور کسی چیز کے لیے باہر نظر ڈالنے کی ضرورت نہ تھی[1]" یہاں جو کچھ پنجاب کے گاؤں کے متعلق کہا گیا ہے وہ تقریباً ہندوستان کے ہر گاؤں کے لیے صحیح ہے، اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب مالگزاری زر نقد میں ادا کرنے کا رواج نہ تھا تو گاؤں اس تصویر سے اور زیادہ دور افتادہ تھا جو اوپر دکھائی گئی ہے۔

محض گاؤں کی دور افتادگی کوئی نمایاں خصوصیت نہیں، اور نہ یہ بات کچھ عجیب ہے کہ تمام صناع دیہات میں رہتے تھے بلکہ ہندوستانی گاؤں کی دیہی جماعت کی سب سے ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ صناعوں کی اکثریت گاؤں کی خدمت گار ہوا کرتی تھی۔ عام طور پر مختلف صناعوں کے پاس اپنی زمینیں ہوتی تھیں، جن پر یا تو مالگزاری معاف ہوتی یا مروجہ شرح سے کم ہوتی تھی اور ان کی آمدنی کا خاص ذریعہ یہ تھا کہ ہر کاشتکاران کو سالانہ پیداوار میں سے ایک معینہ حصہ ادا کیا کرتا تھا۔ اور اس کے معاوضے میں ان کو کاشتکاروں کی چند مخصوص خدمات انجام دینا پڑتی تھیں[2]۔ مثلاً بڑھئی نہ صرف تمام زرعی آلات کی مرمت کیا کرتا

---

[1] ڈی ابیٹسن، پنجاب کی رپورٹ مردم شماری صفحہ ۱ (۱۸۸۱ء)۔

[2] یہ انتظام ان دیہات میں تھا جہاں آزاد کاشتکاروں کی جماعت تھی، لیکن زمینداری دیہات میں کچھ فرق تھا جس کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔

تھا بلکہ وہ کاشتکاروں کے زرعی آلات بلاکسی معاوضے یا قیمت کے تیار کیا کرتا تھا۔ صرف بعض چیزوں مثلاً شکر کے کولھو یا گاڑی وغیرہ کے سلسلے میں اس کو کچھ مزید اجرت ادا کی جاتی تھی گاؤں کے خدمت گار صناعوں کی اس جماعت کے فرائض اور حقوق ملک کے مختلف حصوں میں مختلف تھے[1] مگر اس اختلاف کے باوجود ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ یہ ہر جگہ گاؤں کے خدمت گزار تھے۔ گاؤں کے تمام خدمت گزار صرف صناع ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر حصوں میں اس گروہ میں مقدم، پجاری، اور پٹواری بھی شامل ہوتا تھا۔ اور نہ تمام صناعوں کے لیے خدمت گزار ہونا لازمی تھا، مثلاً جلاہا کہیں بھی خدمت گزار نہ تھا۔ لیکن وہ تمام صناع جن کی خدمات کی دیہی جماعت کو مسلسل ضرورت رہتی تھی دیہی کمینوں کے گروہ میں شامل تھے۔

اس نظام نے ہندوستانی دیہی جماعت کو مخصوص طریقے پر مشترک کر دیا۔ اور اسی وجہ سے اس میں بیرونی حملوں کی مدافعت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ دیہی صناعوں کی خدمات موروثی ہوتی تھیں اور اس نے گاؤں کی ساری زندگی کو ایک مخصوص شکل میں ڈھال دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک طرح یہ اس بات کی بڑی اچھی ضمانت تھی کہ گاؤں والوں کی تمام ضروریات اور بالخصوص بدامنی کے

---

[1] نہ صرف فرائض اور خدمات میں اختلاف تھا بلکہ خود ان صناعوں میں بھی اختلاف تھا جو گاؤں کے خدمت گزار تھے، ایک صناع جو ملک کے ایک حصے میں دیہی خدمت گزار ہوتا تھا ملک کے دوسرے حصے میں ایک آزاد صناع ہو سکتا تھا، اختلافات کے لیے ملاحظہ ہو، ڈبلیو کروک صوبجات شمال و مغرب، بیڈن پاول حوالۂ گزشتہ صد ۴۱، ۴۰، گرانٹ ڈف مرہٹوں کی تاریخ۔ مرتبۂ ایس، ایم ایڈورڈس، جلد اول ——— جنوب میں یہ تقسیم مختلف تھی یہاں ”پنچال“ میں پانچ کمین شامل ہوتے تھے، یہ صناع اس میں سے جو پیشہ چاہیں اختیار کر سکتے تھے، ملاحظہ ہو میسور کی رپورٹ مردم شماری، لیکن شمال میں اس قسم کی منتقلی جائز نہ تھی۔

زمانے میں برابر پوری ہوتی رہیں گی۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے صناعوں کے کام میں دشواریاں پیدا کر دیں۔ مثال کے طور پر وہ صناع جو ایک گاؤں میں مختلف قسم کی خدمات انجام دیتا تھا وہ کسی فن میں مخصوص مہارت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا تھا تقسیم عمل بہت ہی محدود تھی، لہذا یہ توقع کرنا غلط تھی کہ صناع اپنے متعلقہ فن میں بہت ہوشیار ہوگا[1]۔ اس نے صناع کو بڑی حد تک بیرونی مسابقت سے بھی محفوظ رکھا، کیونکہ اس کا امکان نہ تھا کہ کاشتکار اپنی ضرورت کے برتن بیرونی کمہار سے خرید لے، خواہ اس کا سامان بہتر ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ وہ اپنے گاؤں کے کمہار کو ان کی فراہمی کا معاوضہ ادا کر رہا ہو۔ اس بیرونی مسابقت کی کمی کی وجہ سے ہندوستان میں تخصیر صنائع کا رواج نہ ہو سکا، سوائے ان نازک ترین اشیا کے جو قصبوں میں تیار کی جاتی تھیں ہندوستان میں کسی قسم کی صنعت کی تخصیر نہ تھی[2]۔ صرف ذرائع نقل و حمل کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ برما میں جہاں نقل و حمل کی دشواریاں بہت بڑھی ہوئی تھیں وہاں پھر بھی کسی حد تک ملحقہ دیہات کے ایک چھوٹے سے گروہ میں تخصیر صنعت کا رواج تھا[3]۔ لیکن ہندوستان

۱۲

---

[1] بعض اوقات طریق کار اس قدر برا ہوتا تھا کہ اکثر جگہ جب ذرائع نقل و حمل میں اضافہ ہوا تو یہ طریق ختم ہو گیا۔ چھتیس گڑھ کے نجاروں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آلات اس قدر بھدے استعمال کیے جاتے ہیں کہ عموماً کاشتکار خود اپنے آلات تیار کر لیتے ہیں یا مجبور ہو کر قریبی قصبے کا رخ کرتے ہیں صوبجات متوسط کی رپورٹ مردم شماری (سنہ ۱۹۱۱ء)۔

[2] بنائی کے سلسلے میں تھوڑے سے استثنیٰ کی ضرورت ہے، ملک کے بعض حصوں میں ایسے مرکز تھے جو اپنی مخصوص تیار کردہ چیزوں کے لیے آس پاس کے علاقوں میں مشہور ہو گئے تھے۔

[3] ہندوستانی دیہات اور روسی گاؤں جن کا اکثر مقابلہ کیا جاتا ہے ان کا فرق دلچسپ ہے۔ میور لوہاروں اور تارکشوں کے پورے پورے دیہات کا تذکرہ کرتا ہے، ہندوستان میں یہ ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ان کی پیداواریں فروخت کے واسطے بھیجی جاتی تھیں۔

میں تو یہ سرے ہی سے مفقود تھی۔ اس طرح معمولی تقسیم عمل اور مختلف مقامات کی پیداواروں میں تخصیص کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہندوستانی دیہی صنعت بہت ہی پست حالت میں تھی۔

ہندوستان کی معاشی زندگی میں دیہی جماعت اپنے مخصوص دستور کے ساتھ کافی اہم اور نمایاں حیثیت رکھتی تھی، قصبات کا کوئی خاص اثر نہ تھا اور وہ ملک کی عام زندگی سے کچھ الگ تھلگ سمجھے جاتے تھے، اس طرح ہندوستان کی یہ خصوصیت رہی کہ وہ بیرونی دنیا سے بالکل منقطع رہا، اور خود ملک میں خودکفیل اکائیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو ایک دوسری سے بہت کم تعلق رکھنے کے علاوہ بیرونی دنیا سے قطعاً بے خبر تھیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ دیہی مصنوعات کی تخصیص نے اس چیز کو ضروری کر دیا اور بازار کی وسعت اور تجارت کی سہولتوں نے اس کو ممکن بنا دیا۔ (ص ۵۳۰) جے میور، روس کی معاشی تاریخ جلد اول کتاب سوم، باب سوم، کاشت کاروں کی اس قسم کی مصنوعات نہ تو ہندوستان میں تھیں اور نہ پیدا ہو سکتی تھیں۔

برما کے لیے دیکھیے برما کی رپورٹ مردم شماری (۱۹۱۱ء) نیز بیل کا رسالہ، برما میں لوہا و فولاد (۱۹۰۸ء) لوہاروں کی صنعت کی مثال منداں کے گاؤں میں ملتی ہے جہاں لوہاری پر تقریباً ہر گھر کا انحصار تھا۔

۱۳

باب دوم

مزارعین ۱۸۶۰-۸۰ء

اگرچہ ہندوستان کے روابط اور تجارت مغربی ملکوں سے کئی صدی پہلے سے شروع ہو چکی تھی مگر اس نے انیسویں صدی تک ہندوستان کے معاشی نظام کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ لیکن یکے بعد دیگرے ایجادات کے بعد میکانی طاقت مصنوعات کے واسطے استعمال ہونے لگی اور اس درجے پر آکر انگریز صناعوں نے ہندوستانی دستکاروں پر ایک نمایاں فوقیت حاصل کر لی۔ اور تقریباً یہی وہ زمانہ تھا جبکہ انگلستان ہندوستان کے بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اور ملک میں نیا نظام حکومت اور عدالتی طریق رائج کیا گیا ان آخر الذکر چیزوں نے ملک کے اکثر حصوں میں رعایا کی حالت کو تباہ کر دیا۔ نیز پرانے اداروں مثلاً دیہی جماعت جو کہ ایک خود کفیل انتظامی اکائی تھی، اس کے اثرات کو کم کر دیا۔ لیکن انھوں نے صنعتوں اور ہندوستانی صنعتی نظام کو وہیں رہنے دیا جہاں وہ پہلے تھا۔ انگریز صناعوں کی مسابقت اس سلسلے میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ غیر ملکی صناع ہندوستانی دستکاروں کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں مگر ان کو ہندوستان کے اندر ذرائع نقل و حمل کی کمی کی وجہ سے

بڑی دشواری پیش آئیں اور انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں جن صنعتوں کو بیرونی مسابقت سے نقصان پہنچا وہ ڈھاکے کی ململ، بنگال کا ریشم[1]، اور بمبئی و بنگال کی صنعت جہاز رانی تھی۔ اس کے باوجود یہ امر مشتبہ ہے کہ اول الذکر دونوں صنعتوں کے زوال کو کس حد تک بیرونی مسابقت کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ نئی صنعتوں کے قیام اور زراعت کی ترقی کے سلسلے میں اس تعلق نے کچھ زیادہ اثرات نہیں ڈالے۔ ۱۴ اس قسم کے اثرات میں ۱۸۳۰ء میں بنگال میں برآمد کے واسطے جوٹ کی کاشت میں توسیع، اور اسی کے ساتھ روئی کی برآمد کی ابتدا اور چند بدیسی اقسام کی ترویج تھی۔ آبادی کا بڑا حصہ عام طور پر ابھی تک اس سے غیر متاثر تھا۔ انھوں نے غیر ملکی حکومت، زائد شرح مالگزاری اور پرانے اداروں کے زوال کو محسوس کیا لیکن وہ بیرونی مال کی مسابقت یا دوسرے خارجی اثرات کو محسوس کر کے اپنے طریق کار یا تنظیم میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔

یہ اثر ۱۸۵۰ء تک محسوس نہ ہو سکا جب جہازوں کی ترقی اور اندرون ملک سڑکوں کی توسیع کی وجہ سے ہندوستانی تجارتِ خارجہ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوا۔ ابتدائی پانچ عشروں میں ہندوستان میں ریلوں کی ابتدا ہوئی اور آخری عشرے میں ہندوستان کا بڑا حصہ براہ راست برطانوی حکومت کے تحت آگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہو گئی اور ہندوستانی حکومت تاج میں منتقل ہو گئی۔ یہ عشرہ واقعی غیر معمولی

[1] ریشم کی صنعت خصوصیت سے ایک ایسی صنعت تھی جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوششوں کی بدولت ترقی کی مگر یہ ترقی بیگاری نوعیت کی تھی۔ نپولیانی جنگوں کے زمانے میں جب اطالیہ سے انگلستان کو خام ریشم کی رسد منقطع ہو گئی تو کمپنی نے بنگال میں اس صنعت کو ترقی دی، اس کی مصنوعی ترقی کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب ۱۸۳۶ء میں کمپنی نے اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تو یہ فوراً ہی تنزل کرنے لگی، ملاحظہ ہو، گیو گھاگن، ہندوستان کے ریشم کی

واقعات کا حامل تھا، اور اہم واقعات پیدا کرنے والی تبدیلیوں کا آغاز
یہیں سے ہوا جن کی ہندوستانی معاشی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔

مغربی دنیا کا سب سے پہلا واقعہ جس نے ہندوستان پر دفعتہً
اثر کیا اور جس کا بڑا زبردست معاشی اثر پڑا وہ امریکا کی خانہ جنگی تھی۔
اب پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ ہندوستان مغربی بازاروں
سے کس قدر قریب ہو گیا ہے۔ اور یہی وہ پہلا اہم واقعہ تھا جس نے
کاشتکار کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان بازاروں کا وجود کس قدر اہمیت
رکھتا ہے۔

ہندوستان میں روئی کی کاشت کی تاریخ ایک طویل داستان
ہے، اگرچہ ہندوستان میں روئی کی کاشت بہت ہی ابتدائی زمانے
سے کی جا رہی تھی مگر خام روئی کی برآمد ہندوستان کے لیے معتابلۃً
ایک نئی چیز تھی۔ انیسویں صدی سے قبل ہندوستان دنیا کی
مہذب ترین قوموں کو نازک ترین سامان برآمد کیا کرتا تھا[1]۔ کتائی
اور بنائی کے لیے مشینوں کی ایجاد اور اس کی بدولت ارزاں مال کی
مسابقت نے ہندوستان کی اس نازک ترین سامان کی برآمد کو
بہت کم کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ہندوستان خام روئی
پیدا کرنے والا ایک اچھا ملک ہے، سنہ ۱۸۲۰ء تک امریکا خام روئی
پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا
مگر اس عشرے سے اور بالخصوص اٹھنے کی نئی دندانہ دار روئی　　۱۵
اوٹنے کی مشین کی ایجاد کی بدولت ۱۸۳۰ء میں امریکا ترقی پذیر انگریزی صنعت
کو روئی فراہم کرنے والا ایک خاص ملک بن گیا۔ اس تاریخ تک
ہندوستانی روئی کی برآمد کی مقدار بہت کم تھی، ڈاکٹر رائل لکھتے ہیں کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ رپورٹ (۱۸۶۶ء)۔

[1] جے ایف، رائل، ہندوستانی روئی کی کاشت و تجارت ص ۲ (۱۸۵۱ء)۔

انگلستان کی درآمد میں اس کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ بین جزو چین کا ہے، لیکن جتنا مال ملک میں پیدا ہوتا ہے اس کے لحاظ سے یہ دونوں مقداریں غیر اہم ہیں۔ کیونکہ اس کی کاشت چھوٹے چھوٹے قطعات میں بڑی وسعت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور بعض صوبوں میں تو کل خریف یا تری کا ایک چوتھائی حصہ روئی پر مشتمل ہوتا ہے اور کاشتکار کی آمدنی کا یہ اہم ذریعہ ہے[1]۔ ۱۸۶۰ء تک اگرچہ برآمد کی مقداریں بحیثیت مجموعی اضافہ ہوتا رہا لیکن اس میں بڑے اختلافات ہوتے رہے۔ لیکن اب برطانوی کارخانہ داروں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ ہندوستان ان کی صنعتوں کے لیے خام سامان مہیا کرنے والا ایک اچھا ذریعہ ہے[2]۔ ۱۸۶۱ء میں جب امریکا میں روئی کی فصل تباہ ہوگئی تو انھیں اس ذریعے کے غیر مستقل ہونے کا احساس ہوا اور انھوں نے فوری ضرورت کے واسطے متبادل ذریعے پر نظر ڈالنا شروع کی۔ رائل ہندوستان کی قدیم مصنوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آج کل اکثر ہندوستان کا مفہوم صرف اس کی روئی کی کاشت سمجھا جاتا ہے، یعنی اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب انگلستان مطالبہ کرے تو وہ اسے خام پیداوار مہیا کرے اور اس کے بدلے میں اس کی مصنوعات جتنی مقداروں میں وہ بھیجنا چاہے قبول کرے۔ لیکن چند اسباب مثلاً ہندوستانی روئی کا چھوٹے ریشے والی ہونا روئی

---

[1] حوالۂ متذکرۂ گزشتہ ص۱۸۱۔

[2] ہندوستانی روئی کی رسد کے مسئلے پر جو دلچسپی لی جا رہی تھی اس کا اظہار ان کتابوں سے ہو سکتا ہے جو اس زمانے میں اس موضوع پر شایع ہوئیں۔ چاپ مین جو گریٹ انڈین پننسلا ریل کا بانی مبانی تھا اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ ریلوں کی فوری ترقی کے لیے بھی ہندوستانی روئی کی فراہمی پر قابو پانا بیحد ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو چاپ مین۔ ہندوستان کی تجارت اور روئی (۱۸۵۱ء)۔

[3] رائل حوالۂ گزشتہ ص۲۰۔

میں مٹی کی آمیزش، اور وسائل نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے ہندوستان سے برآمد ہونے والی روئی کی مقدار بہت زیادہ نہ بڑھ سکی[1]۔ اس کے بعد امریکی خانہ جنگی شروع ہوئی، جنوبی بندرگاہ بند ہوگئے اور لنکا شائر میں روئی کا قحط ہو گیا۔ لہٰذا لازمی طور پر انگریز کارخانہ داروں کی نظریں ہندوستان پر پڑنے لگیں[2]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی روئی کی ایک فوری طلب پیدا ہوگئی، حکومت نے بھی اس معاملے میں دلچسپی کا اظہار کیا اور بمبئی اور صوبۂ متوسط میں روئی کے واسطے کمشنر مقرر کئے اور ساتھ ہی ساتھ سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے۔ اور کاشتکار بھی مزید فائدہ اٹھانے کے اس موقع سے نہ چوکے۔ روئی کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور روئی کی کاشت دفعتہً کافی نفع بخش ہوگئی۔ ہندوستانی روئی کی قیمت میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

ہندوستانی روئی کی قیمت فی پونڈ

(آنوں میں)

۱۸۵۹ء	۱۸۶۰ء	۱۸۶۱ء	۱۸۶۲ء	۱۸۶۳ء	۱۸۶۴ء	۱۸۶۵ء	۱۸۶۶ء
۲-۷	۳-۷	۴-۲	۶-۴	۱۰-۵	۱۱-۵	۷-۱	۶-۳

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سال کے عرصے میں ہندوستانی روئی کی قیمت تگنی ہوگئی۔ اعلیٰ قیمت کی وجہ سے خام روئی کی برآمد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، اور سلطنت متحدہ کو برآمد ہونے والی روئی کی قیمت

---

[1] حوالۂ متذکرۂ بالا، نیز ملاحظہ ہو ڈبلیو، آر کیسل حوالۂ گزشتہ۔

[2] ہندوستان میں روئی کی کاشت کے متعلق مراسلت، (۱۸۶۳ء)۔ (پارلمنٹری دستاویز)۔

ان چار سالوں میں دوگنی ہوگئی۔

ہندوستان سے سلطنت متحدہ جانیوالی روئی کی مقدار

(گٹھوں میں)[1]

سنہ ۱۸۵۹ء	سنہ ۱۸۶۰ء	سنہ ۱۸۶۱ء	سنہ ۱۸۶۲ء	سنہ ۱۸۶۳ء	سنہ ۱۸۶۴ء	سنہ ۱۸۶۵ء
۵،۹۰،۶۹۵	۵،۶۲۲،۷۳۸	۹،۸۶،۲۸۰	۱۰،۷۱،۷۶۸	۱۲،۲۹،۹۸۴	۱۳،۹۹،۵۱۴	۱۲،۶۶،۵۱۳

قیمتوں میں اضافے اور روئی کی مقدار برآمد بڑھ جانے کی وجہ سے برآمد کی مالیت میں بہت اضافہ ہوگیا اور سنہ ۱۸۶۴ء کے چند سال بعد تک اس کی مجموعی مالیت ہندوستان سے برآمد ہونے والی کل اشیا کی مالیت کے نصف کے قریب رہی۔

۱۷ مسٹر ریورٹ کرناک کی قیمتی رپورٹوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ امریکی خانہ جنگی کے اثرات خصوصیت سے روئی پیدا کرنے والے علاقوں پر کیا پڑے صاحب موصوف صوبجات متوسط و برار میں روئی کے کمشنر تھے۔ وہ سنہ ۱۸۶۰ء سے قبل روئی کی کاشت کی گوناگوں دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یکایک تمام دشواریاں اور دقتیں اس طرح ختم ہوگئیں گویا کہ کسی نے جادو کر دیا سنہ ۱۸۶۴ء میں وسط ہند میں جو روئی کی تجارت ہوتی تھی اس کا اطلاق بمشکل فریلی کاروبار کے طور پر ہوتا تھا جیسا کہ آج کل ہمارے بازاروں میں ہوتا ہے۔ ریلیں آہستگی مگر تیقن کے ساتھ ملک کے اندر بڑھ رہی تھیں اور کاشتکار کی حالت میں ایک بیّن تبدیلی ہو رہی تھی۔ بندوبست مالگزاری

---

[1] یہ اعداد جی، واٹ کی لغت ہندوستان کی معاشی پیداواروں کے مضمون روئی (گوسی پیوم) سے لیے گئے ہیں

کے طریق نے اس کو مدت کاشت کی تمام فکروں سے نجات دلادی' امریکا کی خانہ جنگی نے روئی کی قیمتوں میں اضافہ کردیا اور رعایا کے ہاتھ میں ان گنت دولت آنا شروع ہوگئی۔ اس نے سوائے ان چند بے پروا اور فضول خرچ لوگوں کے عام کاشتکاروں کو مہاجنوں کے جال سے آزادی دلانا شروع کردی[1]۔ صوبۂ متوسط میں روئی کے کمشنر نے روئی کی توسیع کے حسب ذیل اعداد[2] بتائے ہیں۔

سال	ایکڑ	سال	ایکڑ	
سنہ ۱۸۶۱-۶۲ء	۳،۷۵،۶۲۳	سنہ ۱۸۶۵-۶۶ء	۵،۸۷،۳۹۸	
سنہ ۱۸۶۲-۶۳ء	۴،۲۷،۱۱۱	سنہ ۱۸۶۶-۶۷ء	۵،۹۸،۸۰۱	
سنہ ۱۸۶۳-۶۴ء	۴،۸۸،۴۳۶	سنہ ۱۸۶۷-۶۸ء	۷،۳۵،۶۳۳	ان میں ایک لاکھ ایکڑ زمینداری رقبہ بھی شامل ہے۔
سنہ ۱۸۶۴-۶۵ء	۶،۹۱،۱۹۸	سنہ ۱۸۶۸-۶۹ء	۷،۵۰،۸۷۵	

امریکی جنگ کے ان فوائد سے کم وبیش تمام روئی پیدا کرنے والے علاقے مستفید ہوئے[3]۔ مدراس کے صرف ایک ضلع بلاری ہی میں رعایا نے روئی کی فروخت سے امریکی جنگ کے تین سالہ دور میں ½ ۱ ملین اسٹرلنگ کمالیے[4]۔ صوبۂ بمبئی میں اس کے اثرات یوں بیان کئے جاتے ہیں۔ "روئی کی قیمتوں میں اضافہ اور اس کے بعد امریکی ناکہ بندی کی وجہ ۱۸

۱؎ صوبجات متوسط و برار کے روئی کمشنر کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۸۶۶-۶۷ء ص ۱۳۲۔
۲؎ حوالۂ گزشتہ سنہ ۱۸۶۸-۶۹ء ص ۳۔
۳؎ سارا ہندوستان ان فوائد سے برابر مستفید ہو رہا تھا اور اس وقت سوائے بنگال کے تمام ہندوستانی صوبوں میں روئی کے تحت وسیع علاقے موجود تھے۔
۴؎ رکھا دیا نگر، حوالۂ گزشتہ ص ۳۹۔

سے سنہ ۱۸۶۲ء میں غیر معمولی خوشحالی کا دور شروع ہوا ان سالوں میں مسلسل پانچ سال تک بارش کی قلت کی وجہ سے عام حالات میں رعایا بڑی تباہ ہوئی مگر پیداوار کی غیر معمولی قیمت نے[1] خشک سالی کی فصلوں کو اچھے موسم کی عمدہ فصلوں کے برابر کر دیا۔

لیکن ہندوستان کے معاشی دائرے میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ روئی کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا بلکہ ہمارے کاشتکار پر یہ بات واضح ہو گئی کہ جو فصلیں وہ بوتا ہے ان کی نوعیت اور وسعت کا انحصار مقامی ضروریات کے علاوہ دوسرے اسباب پر بھی ہونے لگا ہے مختصراً یہ وہ واقعہ تھا جس نے بڑی وضاحت اور تمثیلی طریقے پر ہندوستانی معاشی کفالت کے تار پود بکھیر دیے۔

انگلستان سے جو روئی کی طلب تیزی سے شروع ہوئی تو ہندوستان اس کو ترقی یافتہ طریقے استعمال کر کے ہی پوری کر سکتا تھا۔ چنانچہ گزشتہ عشرے میں ہندوستان میں مختلف طریقے اختیار کیے گئے جن میں سے خاص ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر تھی۔ سنہ ۱۸۵۰ء سے قبل ذرایع نقل و حمل کی حالت بیان کی جا چکی ہے۔ سنہ ۱۸۴۵ء سے قبل ہندوستان میں سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں جو کوشش ہوئی وہ بہت معمولی تھی اس تاریخ کے بعد صوبۂ مدراس میں سڑکوں کی تعمیر کے واسطے ایک خاص رقم منظور کی گئی۔ اگرچہ یہ رقم صرف کر دی گئی مگر کمشنروں کی رپورٹ تک (۱۸۵۲ء) سڑکوں کی حالت میں تھوڑی بہت ہی اصلاح ہوئی۔ بمبئی سے آگرے تک ایک سڑک کی تعمیر سنہ ۱۸۴۰ء میں شروع ہوئی۔ لیکن خود صوبے کے اندر سوائے بھور گھاٹ سے پونا والی سڑک کے اور کوئی کام نہیں ہوا۔ شمال میں ٹرنک روڈ صرف کلکتے سے بنارس تک بھی مگر اس کی حالت بھی خراب تھی[2]۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں اس سڑک کو دہلی تک

---

[1] دکن کے بلووں کی کمیٹی کی رپورٹ وغیرہ ص ۲۱۔
[2] تاریخ فرشتہ اور اکثر دوسری تاریخی کتابوں میں اس سڑک کا بڑا حصہ شیر شاہ کے نام سے موسوم ہے

تعمیر کرنے کا آغاز ہوا جو ۱۸۵۳ء میں ختم ہوا لیکن سڑکوں کی اصل ترقی کا کام لارڈ ڈلہوزی کی زوردار گورنر جنرلی کے عہد میں امورِ عامہ کے نئے محکمے کے توسط سے شروع ہوا۔ دہلی تک ٹرنک روڈ مکمل ہو کر پشاور تک اس کی توسیع کا کام تیزی سے شروع ہوا[1]۔ سڑکوں کی تعمیر کا کام پانچویں عشرے میں شروع کیا گیا۔ ۱۸۵۸ء کے بعد فوجی اغراض اور بڑی ریلوں کی شاہراہوں کی معاونت کے واسطے سڑکوں کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور بعد والے عشرے میں ہندوستان میں سڑکوں میں کافی توسیع ہوئی۔

مگر یہ کام ایک اور اہم کام یعنی ریلوں کی توسیع کی وجہ سے پس منظر میں چلا گیا۔ ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر کا مسئلہ ۱۸۴۵ء میں چھڑ چکا تھا لیکن جب خانگی کمپنیاں قائم ہوئیں تو سرمایہ فراہم نہیں ہو رہا تھا۔ اس طرح وہ طویل سلسلے والی گفتگو جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری کمپنیوں کے مابین حکومت کے ضمانتی طریق کے مسئلے پر شروع ہوئی[2] اس کے اثرات لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت تک برآمد نہیں ہوئے لارڈ ڈلہوزی کو ہندوستان میں ریلوں کی وسعت سے خود خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے اس موضوع پر دو قابل قدر یادداشتیں تیار کیں، جن میں سے ایک میں وہ راستے دکھلائے گئے تھے جو ہندستان میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- مگر معاشیات کی انگریزی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی حالت خراب ہو مگر اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ "اس (شیر شاہ) کے زمانے میں بنگالے اور سنار گاؤں سے دریائے سندھ تک جو ایک ہزار پانچسو کوس کی راہ ہے پختہ سڑک بنوائی گئی —— ہر کوس پر ایک سرا، ایک کنواں اور ایک پختہ مسجد تعمیر کرائی گئی۔" تاریخ فرشتہ جلد دوم، ترجمہ مولوی فدا علی ص ۲۸۲ (مترجم)۔

[1] جے، برگس، ہندوستان اور یورپ کا تقابل باب اول، حصۂ سوم، (۱۸۵۷ء)۔

[2] ایچ، بیل ہندوستان میں ریلوں کی حکمت عملی، باب اول۔

شاہراہ لائنوں کو اختیار کرنا چاہتے تھے[1]۔ ۱۸۴۹ء میں کلکتے کے قریب ایک تجرباتی پٹری کا آغاز ہوا اور ۱۸۵۴ء میں بمبئی اور تھانے کے درمیان ہندوستان کی پہلی ریل آمد و رفت کے واسطے کھولی گئی۔ اس کے بعد یہ کام تیزی سے شروع ہوا اور ۱۸۵۷ء تک جاری رہا مگر اس سال اس میں عارضی طور پر رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ بعد کے آنے والے دس سال میں ہندوستان میں ریلوں میں کافی ترقی ہوئی اور ریلوں کی توسیع کا کام برابر جاری رہا اور پٹریوں کے طول میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ریلوں کا طول ۴۳۲ میل تھا تو ۱۸۶۹ء میں ۵۰۱۵ میل ہوگیا۔

یہاں پر اس ضمانتی اور انتظامی طریق کے متعلق بحث کرنا غیر ضروری ہے جس کے تحت ہندوستان میں ریلوں کی ابتدا ہوئی۔ ریلوں کا پہلا بدیہی اثر یہ ہوا کہ مسافت تیز تر ہوگئی اور طویل سفر بہت ارزاں ہوگئے۔ یہ سبب بہت اہم تھا، کیونکہ ریلوں اور سڑکوں کی توسیع کی وجہ سے روئی کی بڑی بڑی مقداریں کھیتوں سے بندرگاہوں تک پہنچنا آسان ہوگئیں۔ لیکن ۱۸۶۰ء کے عشرے میں ایک اور اثر ہوا جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں عارضی مزدوروں کی کوئی جماعت موجود نہ تھی، اور یہ اس لیے نہ تھی کہ اس کی کوئی طلب نہ تھی۔ قدیم زمانے میں مفادِ عامہ کے چھوٹے چھوٹے کام مثلاً چھوٹی نہریں وغیرہ عام طور پر اس خاص خطے کے باشندوں کے اشتراک اور باہمی محنت سے انجام دیے جاتے تھے۔ بڑے اور اسی قسم کے دوسرے کام مثلاً منادر، یادگاریں[2] وغیرہ عموماً اس علاقے کے آس پاس کے کاشتکاروں

[1] ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر، "مارکوئس آف ڈلہوزی" باب ہشتم (۱۸۹۰ء)۔

[2] ہر یادگار یا تاریخی عمارت کے متعلق یہ کلیہ صحیح نہیں ہوسکتا، بالخصوص مغل بادشاہ جو فن تعمیر میں بڑی نزاکتیں اختیار کرتے تھے بیگار سے ایسا اچھا کام نہیں کرا سکتے تھے۔ تاج محل کے لیے دور دراز سے مزدور، مشاق کاریگر اور صناعوں کو بلایا گیا اور ان کو معقول اجرت دی گئی۔ (مترجم)۔

سے بیگار کے طور پر کرائے جاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں امور عامہ کے بڑے کاموں کی تعداد نسبتہً کم تھی لیکن لارڈ ڈلہوزی کے محکمۂ امور عامہ کے قیام اور خاص طور پر ۱۸۵۹ء کے بعد ان میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔[1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں معمولی غیر ماہر مزدوروں کی بڑی تعداد کو روزگار کے ذرایع مہیا ہو گئے۔ خاص طبقے میں سے یہ مزدور بھرتی کیے جاتے تھے زرعی مزدور یا غریب کاشتکار ہوتے تھے جو خوشی خوشی فرصت کے اوقات میں اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے ان میں شامل ہو جاتے تھے ان میں دیہی صناعوں اور بالخصوص جلاہوں کی کچھ تعداد بھی شامل ہو جاتی تھی جنھوں نے اب بیرونی مسابقت کے اثرات کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ غیر مہارت والی محنت کی فوری طلب کا یہ نتیجہ ہوا کہ اجرتوں کی شرح میں ایک عام اضافہ ہونے لگا۔ اجرتوں میں یہ اضافہ بہت معقول تھا۔ دکن کے بلووں کی کمیٹی اپنی رپورٹ میں بتاتی ہے کہ[2] "محنت کے مقابلے نے عوام یا رعیت کے لیے یہ بات بہت آسان کر دی کہ وہ پندرہ روز کام کر کے ایک معمولی قطعۂ زمین کی رقم مالگزاری کما لیا کریں" اس کے بعد تفصیل ہے کہ "رعیت مسابقت کی وجہ سے بڑی رقم کما لیتی ہے وہ ترک وطن کر کے بمبئی یا پونا چلی جاتی ہے جہاں مزدوروں کو غیر معمولی گراں اجرت پر رکھ لیا جاتا ہے بمبئی میں ایک عام قلی کی اجرت ۱۸۶۰-۶۲ء میں ۷ روپے ۱۲ آنے تھی تو ۱۸۶۳ء میں بڑھ کر ½۱۳ روپے ہو گئی۔ ریلوں کی تعمیر کے زمانے میں تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ فساد کے دیہی رقبے میں صرف کیا گیا" اور جو ضلع

---

[1] ان میں مختلف قسم کی چیزیں مثلاً ریلیں، سڑکیں، ذرایع آبپاشی، سرکاری عمارات اور فوجی بارکیں وغیرہ شامل تھیں۔

[2] حوالۂ گزشتہ ص۲۱۔

ہی میں رہے گا[1]۔ ضلع سے باہر لیکن صرف ۶۰ میل کے فاصلے پر بھورگھاٹ کے کام نے ہزاروں مزدوروں کو روزگار سے لگادیا۔ ۱۴ میل لانبی ریل کی پٹری پر ایک گتہ دار کے پاس تقریباً چالیس ہزار مزدور کام کر رہے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد امورِ عامہ کے کاموں میں مزید اضافہ ہوا اور ۶۹-۱۸۶۸ء میں صرف پونا کے اکیلے ضلع میں اس پر ۳۱ لاکھ روپیہ صرف ہوا[2]۔ مندرجۂ بالا بیان سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے کہ جن اضلاع میں ریلوں یا امورِ عامہ کا کوئی اور کام شروع ہوا وہاں کی اجرتوں پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ اسی کے ساتھ اس عشرے میں حکومت کے غیر معمولی اخراجات کے اضافے کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ صوبۂ مدراس میں "غیر زرعی مزدوروں کی حالت میں نمایاں تبدیلی ہوئی، اور اس کی وجہ مختلف ریلوں اور دوسرے کاموں کی تعمیر تھی۔ محنت کی طلب کثیر اور مسلسل تھی اور اجرتوں میں اضافے نے اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ توازن قائم رکھا[3]۔

اس وقت قیمتوں میں بھی اضافے کا ایک رجحان نظر آتا ہے۔ گزشتہ ۵۰ سال میں اشیائے خوردنی اور دوسری پیداواروں کی قیمت ہندوستان کے تمام حصوں میں متغیر ہوتی رہی، لیکن ان تمام تغیرات میں ایک رجحان مشترک تھا اور وہ قیمتوں کی تخفیف تھی، اس واقعے کی عام تسلیم شدہ تشریح یہ ہے کہ ملک میں معیشت زر کا رواج ہوگیا تھا۔ بالخصوص حکومت کی رقم مالگزاری اب نقد روپوں کی شکل میں ادا ہونے لگی تھی، ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کی بہتات کبھی نہیں رہی۔ اس لیے انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ملک میں زر کی دھاتوں کی مقدار

ا۔ یہی وہ رقبہ تھا جس میں بعد میں بلوے ہوئے۔

۲۔ حوالۂ گزشتہ صفحات ۸۰-۸۳۔

۳۔ رگھاوَیانگر حوالۂ گزشتہ ص ۳۹۔

کم رہی۔ لیکن یہ قلیل مقدار تجارتی اغراض کے لیے کافی ہوتی تھی۔ کیونکہ بہت سے کاروبار اشیا کے مبادلے سے ہو جایا کرتے تھے، اور دھاتوں کے توسط سے ہونے والی تجارت کی مقدار بہت کم تھی۔ لیکن حکومت کو زر کی شکل میں مالگزاری ادا کرنے کی صورت میں اور خصوصیت سے فصل کے زمانے میں روپے کی طلب بڑھنے لگی۔ اس طرح ملک کی مقدارِ زر پر بہت زیادہ بار پڑنے لگا اور اس وجہ سے عام چیزوں کی قیمتوں میں تخفیف ہونے لگی۔ قیمتوں میں عام تخفیف کا یہ حال کم و بیش وسط صدی تک جاری رہا اس کے بعد متضاد رجحان پیدا ہونے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آسٹریلیا اور کیلیفورنیا میں سونے کی کانوں اور میکسیکو میں چاندی کی کانوں کی دریافت نے دنیا کی قیمتی دھاتوں کی رسد کو ایک دم بڑھا دیا اور یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی تجارتِ خارجہ دن دونی اور رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان قیمتی دھاتوں کے بڑے حصے نے ہندوستان کا رخ کیا اور ملک میں داخل ہو کر قیمتوں میں اضافے کا ایک عام رجحان پیدا کر دیا[1]۔ مندرجہ ذیل صوبہ واری اوسطوں[2] سے اس رجحان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔　۲۲

اشیائے خوردنی کی قیمتیں

(سیروں میں بحساب فی روپیہ)

سال	چاول بنگال	گیہوں صوبجاتِ شمال و مغرب	گیہوں پنجاب	جوار مدراس	باجرہ بمبئی
سنہ ۱۸۶۱	۲۷،۰۷	۱۸،۴۵	۱۹،۲۳	۲۵،۵۴	۲۱،۵۵
سنہ ۱۸۷۰	۲۲،۷۴	۱۵،۵	۱۵،۱۳	۲۲،۶۸	۱۳،۲

[1] مبریڈر، قیمتوں کے متعلق یادداشت، حوالہ گزشتہ۔

[2] جے، ای، اڈکنور ہندوستان کی قیمتوں اور اجرتوں پر تبصرہ ([illegible])۔

دوسرا رجحان جو اسی طرح اہم تھا وہ یہ تھا کہ مختلف صوبوں کی قیمتوں میں ایک ہم آہنگی پیدا ہونے لگی اور ایک حصے کی قیمتوں کے تغیرات کا اثر دوسرے حصے پر پڑنے لگا' اور خصوصیت سے یہ چیز قحطوں کے زمانے میں ظاہر ہونے لگی' چنانچہ مسٹر ہین ولے ان سہولتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جن میں ۶۹-۱۸۶۸ء کے قحط زدہ علاقوں کو ملک کے دوسرے حصوں سے اشیائے خوردنی کی رسد فراہم کی گئی لکھتے ہیں کہ' اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ ریلوں اور نقل وحمل کے دوسرے آسان ذرایع نے مقامی قحطوں کے خطرات کو دور کر دیا ہے' ساتھ ہی ان رقبوں کو بھی وسیع کر دیا ہے جن میں قیمتیں اعلیٰ رہتی ہیں[1]۔ لیکن اس سے صرف قحطوں کے زمانے میں قیمتوں کی مساوات کا رجحان نظر آتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہ عشرہ نسبتہً قحطوں سے محفوظ رہا۔ ہندوستان میں قحطوں کی نوعیت بڑی اہمیت رکھتی ہے' پہلے اور کم و بیش کچھ بدلی ہوئی صورت میں آج بھی یہ ہندوستانی معاشی زندگی کی ایک اہم خصوصیت ہے' ہندوستانی قحطوں کے متعلق تقریباً تمام مصنفین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قحط میں غذا کی اتنی قلت نہیں ہوتی جتنی کہ بے روزگاری کی شکایت ہو جاتی ہے' لیکن یہ بیان ان قحطوں کے حالات پر منطبق نہیں ہوتا جو ہندوستان میں ذرایع نقل وحمل کی ترقی سے پہلے پڑ چکے تھے' اس وقت قحط کا مطلب غذا اور بے روزگاری دونوں کی قلت ہوتا تھا' چنانچہ ۱۸۶۸ء کے راجپوتانے والے قحط کے زمانے تک لوگوں کو رسد کی قلت کی وجہ سے بلا غذا کے رہنا پڑا حالانکہ ان کے پاس غذا خریدنے کے کافی ذرایع تھے۔ اس بات کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ اکثر قحط زدہ علاقوں سے لوگ ترک وطن کرکے ان

۲۳

[1] ہین ولے' صوبجات شمال و مغرب کی خشک سالی اور قحط کا بیان' بابت ۱۸۶۸ء ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء۔

اضلاع میں چلے جاتے تھے جہاں غذا کی فراوانی ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے تمام قحطوں میں یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ چونکہ ان کو اپنے اضلاع میں غذا نہ ملتی تھی لہذا وہ ان اضلاع میں چلے جاتے تھے جہاں غذا کی کثرت ہوتی تھی۔ چنانچہ سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء کے صوبجات شمال و مغرب کے قحط میں جبکہ پہلے کے مقابلے میں ذرائع نقل و حمل بہت اچھی حالت میں تھے۔ بہت لوگوں نے نقل وطن کیا۔ اور اگرچہ اس علاقے میں بحیثیت مجموعی اناج استعمال کے لائق بہت کافی تھا۔ لیکن پھر بھی ان اضلاع میں جہاں قحط شدید تھا یہ بھیجا نہ جا سکا۔ اور اس وقت یہاں عملی سوال یہ نہیں تھا کہ غلہ کس طرح فراہم کیا جائے بلکہ یہ کہ کس طرح قحط زدہ لوگوں کو غلے تک یا غلے کو ان تک ارزاں اور ممکنہ تیزی کے ساتھ پہنچایا جائے۔[۱] لیکن اس صورت میں اس خطے کی نوعیت اور ذرائع نقل وحمل کی نسبتہً اچھی حالت کی وجہ سے غلہ لوگوں تک پہنچا دیا گیا، لیکن راجپوتانے جیسے علاقوں میں کیا ہو سکتا ہے جہاں مصیبت تو عام ہوتی ہے مگر نہ سڑکیں ہیں اور نہ دریا کہ جن کی مدد سے دور دراز علاقوں سے پیداوار لاکر ہر شخص کے دروازے تک پہنچائی جا سکے، یہاں انسانی کوششوں سے جو چند جانیں بچ جاتی ہیں ان کی تعداد ضایع ہونے والی جانوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔[۲] سنہ ۱۸۶۹ء میں جو حال راجپوتانے کا تھا وہی صورت سنہ ۱۸۵۰ء سے قبل سارے ہندوستان کی تھی۔

سنہ ۷۰-۱۸۶۰ء کے درمیان جہاں معاشی نظام میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں وہاں ہندوستانی قحطوں کی نوعیت بھی بدل گئی۔ اب ہندوستانی قحط کا مطلب قلت غذا نہیں رہا بلکہ قیمتوں کی گرانی اور عام بے روزگاری کا نام قحط قرار پایا۔ اس عشرے میں جو قحط پڑے اگرچہ ان میں اموات

۱۔ از، بیرڈ اسمتھ، حوالۂ گزشتہ فصل پنجم، صہ ۱۲۔

۲۔ ہین ولے، حوالۂ گزشتہ صہ ۹۷۔

بہت زیادہ ہوئیں خصوصیت سے ۶۹-۱۸۶۸ء والے قحط میں مگر یہ زیادہ وسیع اور شدید نہ تھے، نیز شرح اموات میں بھی بڑی کمی ہو سکتی تھی اگر حکومت کے عہدہ داروں کے پاس قحط کے وہ امدادی ذرایع ہوتے جو اواخر صدی میں حاصل ہو گئے۔

امریکی خانہ جنگی کی وجہ سے روئی کی قیمت میں جو اضافہ ہوا اس سے روئی کی کاشت کرنے والوں کو تو خوب نفع ہوا، بلکہ کسی حد تک ملک کے سارے کاشتکار اس سے مستفید ہوئے اسی کے ساتھ امور عامہ کے اخراجات مزدوروں کی اجرت بڑھا رہے تھے لیکن کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی حالت اجرتوں یا اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافے کے باوجود بہتر نہ ہو سکی کیونکہ ان کو حق الخدمت جنس میں ادا کیا جاتا تھا۔ ۲۴

خوش حالی کے اس دور کا ردعمل ۱۸۶۵ء میں مدراس سے شروع ہوا، ضلع گنجام میں ایک معمولی سا قحط پڑا، یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ روئی کی گرم بازاری کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا ان مفوضہ اضلاع میں جہاں روئی کی کاشت ہوتی تھی انھوں نے خشک سالی کو محسوس نہیں کیا، حالانکہ عام حالات میں وہ اس کو شدت سے محسوس کرتے، مدراس کے قحط کے بعد ۶۹-۱۸۶۸ء میں راجپوتانے میں قحط پڑا، اس قحط میں شرح اموات بہت زائد رہی، اور ان کا تناسب دوسرے تمام جدید قحطوں سے اونچا رہا۔ ۱۸۶۸ء میں خریف کی فصل بالکل تباہ ہو گئی اور صورت حال اس سے اور زیادہ بدتر ہو گئی کہ دوسرے سال ٹڈی دل نے حملہ کر دیا۔ خوش قسمتی سے یہ قحط بہت زیادہ وسیع نہ تھا اور راجپوتانے اور صوبجات شمال و مغرب کے ملحقہ اضلاع تک محدود رہا۔ مگر دشواریاں اس سے بڑھ گئیں کہ راجپوتانے کے اندرونی علاقے میں ذرایع نقل و حمل بالکل موجود نہ تھے، غالباً یہ ہندوستان میں سب سے آخری قحط تھا جس میں قلت غذا کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ قدیم ہندوستانی قحطوں کی

تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں، راجپوتانے کے لوگوں کی بڑی تعداد غذا کام اور اپنے مویشیوں کے لیے چارے کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئی، صوبجات شمال و مغرب کے قریبی شہر مثلاً آگرہ اور دہلی راجپوتانے کے قحط زدہ علاقے کے لوگوں سے بھر گئے۔ غذا کی اس تلاش کی بھگدڑ میں بہت سی جانیں ضایع ہوگئیں، لیکن مویشیوں کی ہلاکت اس سے بھی زیادہ رہی، اندازہ ہے کہ راجپوتانے کے مویشیوں کی بڑی تعداد ہلاک ہوگئی[1]۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے قحط پڑے، پہلا قحط بنگال اور بہار و اڑیسہ میں ۱۸۷۳-۷۴ء میں پڑا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امداد قحط کے جدید ترین طریقوں کو اس مرتبہ پہلی دفعہ آزمایا گیا، تمام اضلاع میں امدادی کام جاری کیے گئے۔ اور امداد مفت دی گئی۔ عہدے دار راجپوتانے کے انسانوں اور مویشیوں کی ہلاکت سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے طے ۲۵ کر لیا کہ کوئی آدمی امداد سے محروم نہ رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ امدادی کام مبالغہ آمیز طریقے پر بڑھ گیا، قحط زدہ اضلاع کی تقریباً ۲۶ فی صدی آبادی کو امداد دی گئی اور بعض صورتوں میں یہ اوسط ۵۰ اور ۶۰ فی صدی کے درمیان رہا، حکومت نے اس علاقے سے غلہ باہر جانے کی ممانعت کر دی، اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ خانگی تجارت زیادہ بار آور نہیں ہے تو حکومت نے اپنے خرچ سے غلے کی بڑی مقدار درآمد کی۔ امداد قحط پر بہت زیادہ رقم صرف ہوئی، لیکن یہ سہرا حکومت کے سر ہے کہ فاقوں کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا[2]۔

اس عشرے کے آخری حصے میں ہندوستان میں قحطوں کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا، جس میں جنوبی ہند کا قحط سب سے شدید تھا جو ۱۸۷۶-۷۸ء

[1] ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء) حصۂ دوم، گزشتہ قحطوں کی تاریخ۔
[2] حوالۂ بالا۔

میں پڑا، یہ بمبئی اور مدراس کے صوبوں کے بڑے حصے، ممالک محروسہ سرکار عالی اور میسور کے علاقوں پر مشتمل تھا اسی کے ساتھ صوبجات شمال و مغرب اور اودھ میں ایک معمولی سا قحط پڑا، جیسے کہ ہندوستانی قحطوں کی خصوصیت ہے ان علاقوں میں گزشتہ کئی سالوں سے بارش کی کمی اور بے قاعدگی رہی۔ اس کے بعد اصل قحط کا آغاز ہوا، اس لیے کہ غلے کے محفوظ ذخیرے بہت کم تھے، صوبجات شمال و مغرب میں جہاں ابتدائی چند سال اچھے گزرے تھے وہاں کے ذخیروں میں یورپ کو گیہوں چلے جانے کی وجہ سے کمی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اب ریلوں کی توسیع کی وجہ سے گیہوں کی تجارت میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ جب قحط پڑا تو ملک اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اور لوگوں کی مصیبتوں میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ جبکہ ہندوستان کے عام قحطوں کی طرح چارے کی بھی قلت ہوگئی۔ لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوا اس کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ کاشتکاروں کے اصل کا بڑا حصہ مویشیوں ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ سارے ملک میں بڑے پیمانے پر امدادی کام شروع کئے گئے، لیکن اس کے باوجود جنوبی ہند کے تمام حصوں سے لوگوں کی بڑی تعداد برابر مغربی گھاٹوں پر منتقل ہوتی رہی۔ یہ توطن راجپوتانے والے قحط کے توطن سے متضاد نوعیت رکھتا تھا کیونکہ اس وقت لوگ غذا کی تلاش کے بجائے مغربی گھاٹ کے جنگلوں میں چارے کی تلاش میں پہنچے تھے۔ غذا کی قلت نہ تھی، ریلوں اور غلے کے بیوپاریوں کی کوششوں سے غلہ سارے ملک میں تقسیم ہوگیا تھا۔ صرف ان چند حصوں مثلاً بمبئی کرناٹک کے علاقے میں جہاں ریلیں ابھی تک تعمیر نہیں ہوئی تھیں غلے کی قلت کو تھوڑا بہت محسوس کیا گیا، یہ قحط اس قدر وسیع اور شدید تھا کہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اس کو ہندوستان میں انگریزی راج کے قیام کے بعد سے سب سے شدید قحط بتایا ہے۔[1]

۲۶

[1] امدادی کاموں کی تفصیلات، مختلف مباحث اور بالخصوص تخفیفی یا شکنجی اجرت کے لئے ملاحظہ ہو

۱۸۷۰-۸۰ء کے درمیان جو قحط پڑے ان کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، چونکہ قحطوں کے معاشی اثرات ہندوستان میں بہت اہم ہوتے ہیں اس لیے اس عشرے میں بھی ان کی یہ خصوصیت برقرار رہی، ۱۸۵۰ء کے بعد ہندوستان ایک طویل عرصے تک قحطوں سے محفوظ رہا اور جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے اس کی وجہ سے تجارت اور زراعت دونوں کی حالت میں کچھ خوش حالی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

قحط کے سب سے اہم اثر ملک کے اضافہ رفتار آبادی پر پڑا۔ ۱۸۷۲-۸۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی مجموعی حیثیت سے ۶،۸۵ فی صدی بڑھی[1] لیکن یہ اضافہ بہت ہی بے قاعدہ تھا، کیونکہ ۱۸۷۲ء سے پہلے کوئی باضابطہ مردم شماری نہیں ہوئی تھی اس لیے مختلف صوبوں میں اضافے کی رفتار کا اندازہ لگانا مشکل ہے، لیکن قحط زدہ صوبوں کے اعداد اس بات کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ ان پر قحطوں کا اثر ہوا۔

بمبئی (برطانوی علاقہ)۔ ۹ سال کے اندر ۲،۰۵ فیصدی اضافہ ہوا۔
صوبہ مدراس۔ ۹ سال کے اندر ۱،۳۵ فی صدی کمی ہوئی۔
میسور۔ دس سال کے اندر ۱۹،۱۷ فی صدی کمی ہوئی۔
ریاست کوچین۔ ۶ سال میں ۱،۱۴ فی صدی تخفیف ہوئی۔

چونکہ ۱۸۷۲ء میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی مردم شماری نہیں ہوئی اس لیے یہاں کے اعداد موجود نہیں، صوبۂ بمبئی میں حقیقی اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ صوبے کا شمالی حصہ قحط سے بالکل محفوظ رہا، لیکن یہ اعداد بھی پورے اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے ناکافی ہیں، مثلاً صوبۂ مدراس میں ۱۸۵۶-۷۶ء تک کا درمیانی عرصہ بڑی خوش حالی کا زمانہ تھا۔ اس اثنا میں آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا، ڈاکٹر کورنش کے بیان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ڈبلیو، ڈگبی۔ جنوبی ہند میں امداد قحط۔

[1] ڈبلیو، سی، بلوڈن، ہندوستان کی رپورٹ مردم شماری (۱۸۸۱ء)۔

کے مطابق اس بیس سالہ عرصہ میں صوبۂ مدراس کی آبادی ۳۰ ر ۲ لاکھ سے بڑھ کر ۵ اور ۳ لاکھ ہوگئی[1]۔ ۱۸۷۱ء کے اعداد میں چند استثنیات بھی ہیں، اس لیے آبادی کی اصل رکاوٹ اس سے زیادہ ہے جتنی اعداد ظاہر کر رہے ہیں، ایک دوسری بات جو اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آباد گانوں کی تعداد اور آباد مکانوں کے تناسب میں کمی ہوگئی۔ صوبۂ مدراس میں ۱۸۷۱ء میں غیر آباد مکانوں کی تعداد ۱۱٫۶ فی صدی تھی تو ۱۸۸۱ء میں ۱۷٫۱۱ فی صدی ہوگئی۔ آبادی میں یہ تخفیف فاقوں کی وجہ سے اموات کی بنا پر نہیں ہوئی کیونکہ فاقوں کی وجہ سے واقعی اموات کی شرح ۱۸۷۶-۷۷ء کے قحط میں نسبتہً کم تھی، دراصل آبادی کو روکنے والے حقیقی موانعات دو تھے جو قحط زدہ علاقوں میں لوگوں کو کم خوراک ملنے کی وجہ سے پیدا ہوئے، قلت غذا نے قحط کے زمانے میں شرح پیدائش گھٹا دی، اور اسی کمزوری نے لوگوں کو نحیف و نزار کر کے ہیضہ، بخار وغیرہ کا لقمۂ تر بنا دیا جو ہندوستان میں قحطوں کے ساتھ ناگزیر ہیں۔

لیکن قحط کا دوسرا اثر جو ہندوستانی خوش حالی کے لیے بہت مضر ثابت ہوا وہ زرعی ترقی کی رفتار میں رکاوٹ تھی، جیسا کہ شدید قحط کی صورت میں ہوتا ہے، اور اس کا بدیہی ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ ہندوستان کے جن حصوں میں بارش کی کمی رہی وہیں طریق کاشت سب سے بُرے تھے، اس خیال نے کہ چند سال بعد قحط آنا ناگزیر ہے کاشتکار کو اپنی زمین اور مویشیوں سے غافل کر دیا۔ مویشی کے مسئلے نے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں کاشتکار کے اصل کا بڑا حصہ مویشیوں ہی کی شکل میں تھا، اور شکل اصل کے ذرائع میں بھی ایک چیز ایسی تھی جس پر قحط کے زمانے میں سب سے زیادہ تباہی آتی تھی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۷۶-۷۷ء کے درمیان لوگ عام طور پر مغربی گھاٹوں میں

[1] پل، میکیور، صوبۂ مدراس کی رپورٹ مردم شماری (۱۸۸۱ء)

چارے کی تلاش میں جاتے رہے، حکومت نے محفوظ جنگلوں کو عام چراگاہ کے واسطے استعمال کی اجازت دے کر اور گھاٹوں کے خاص خاص راستوں پر جاری رہے کے گودام کھول کر ملک کے مویشیوں کی بڑی تعداد کو ہلاکت سے بچانے میں امداد کی، مگر حکومت اور عوام دونوں کی کوششوں کے باوجود اس قحط میں مویشیوں کا بڑا حصہ ضایع ہوگیا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوستان میں اس عشرے میں قحطوں کے اثرات بہت ہی اہم رہے، اور ان کی وجہ سے تباہی پھیلی، لیکن اس تباہی کے ذمہ دار بعض دوسرے اسباب بھی تھے، جنھوں نے کاشتکاروں کی حالت کو تباہ کرنے میں مدد دی، وہ اسباب جنھوں نے اس عشرے میں ایک عارضی خوش حالی پیدا کی ان کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، اور یہ خوشحالی متعدد اسباب پر مبنی تھی، کم از کم بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں اس میں روئی کی بڑھی ہوئی قیمت کو خاص دخل تھا، چنانچہ جب امریکی خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد روئی کی قیمت گرنا شروع ہوئی تو اس کا رد عمل ظاہر ہونے لگا۔ جیسے ہی پھر امریکا نے روئی کی برآمد شروع کی ویسے ہی ہندوستانی روئی کی طلب میں تیزی سے کمی ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ بمبئی کی عام تجارت میں بڑی ابتری پھیل گئی اور بہت سے اچھے کاروباری آدمی تباہ ہو گئے۔ کاشتکار بھی دور خوش حالی کے منافعوں سے محروم ہونے لگا اور عام حالات میں جو روپیہ اس نے کمایا وہ سب فضول خرچی سے صرف کر دیا تھا[1]۔ بعض صورتوں میں تو کاشتکار نے اپنی ساکھ بڑھ جانے کی وجہ سے اپنے قرضے کو بڑھا لیا تھا اور جب روئی کے بازار میں قیمتیں گرنا شروع ہوئیں تو کاشتکار کی حالت دفعتاً بہت خراب ہو گئی۔

۲۸

اسی کے ساتھ ساتھ کاشتکاروں نے اور بالخصوص جنوب میں شرح مالگزاری کے بار کو غیر معمولی طریقے پر زائد محسوس کرنا شروع کیا۔

[1] ایسٹ انڈیا فینانس کمیٹی کے سامنے مسٹر نوروجی فریدون جی کی شہادت (۱۸۷۲ء)

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ بندوبست مالگزاری کی ترمیم کا زمانہ عین اس وقت آیا جبکہ کاشتکار خوش حالی کے دور سے گزر رہے تھے، مالگزاری کے عہدے داروں نے اس منافع کو جو اس وقت کاشتکار حاصل کر رہے تھے بنیاد قرار دے کر عام شرح مالگزاری میں اضافہ کر دیا۔ لیکن جب خوش حالی کا دور گزر گیا تو کاشتکاروں کو مالگزاری ادا کرنے میں بڑی دقتیں پیش آنے لگیں اور انھوں نے ادائی کی غرض سے قرض لینا شروع کر دیا[1]۔

اس کے علاوہ ملک کی عام تجارت میں کساد بازاری پھیل گئی، اور بعض صنعتیں فرانسیسی جرمن لڑائی کے اثرات سے خاص طور پر متاثر ہوئیں، غلے کی قیمتیں جو گزشتہ عشرے سے مسلسل بڑھ رہی تھیں وہ سوائے قحط زدہ علاقوں کے اب عام طور پر ہر جگہ معین ہو گئیں یا ان میں تھوڑی بہت تخفیف ہو گئی۔ حکومت اب بھی امورِ عامہ کے کاموں پر کثیر رقم صرف کر رہی تھی، لیکن اب صرف یہی ایک ذریعہ نہیں تھا جس پر رقم صرف ہو رہی تھی، ۱۸۷۵ء میں لارڈ نارتھ بروک کے استعفا کے بعد حکومت ہند نے ایک نیا مسلک اختیار کیا جس کا مقصد فوجی اخراجات اور استحکامات پر کثیر سے کثیر روپیہ صرف کرنا تھا، اسی کے ساتھ محاصل کا بار عوام کو زیادہ سے زیادہ دبا رہا تھا۔

۲۹ ان تمام اسباب نے قحطوں کے ایک مسلسل سلسلے سے مل کر ایک ایسی عام تباہی مچا دی جو لوگوں نے کافی عرصے سے محسوس نہیں کی تھی، اس تباہی کا ایک نتیجہ دکن کے بعض اضلاع میں مزارعین کے بلوؤں کی صورت میں نمودار ہوا، صوبۂ بمبئی کے اضلاع پونا اور احمد نگر میں اکثر جگہ مزارعین نے فساد کیے اور مہاجنوں کو لوٹ کر ان کے

[1] دکن کے بلوؤں والی کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۷۵ء)

مکانوں کو تباہ کر دیا بعض موقعوں پر اس سے بھی زیادہ شدید صورتیں اختیار کی گئیں، بیشتر مقامات پر مزارعین کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کے قرضے کے تمسکات واپس کر دئے جائیں، گوناگوں اسباب نے یہ صورت پیدا کی سنہ ۱۸۶۰ء میں ان اضلاع میں امورِ عامہ کے کاموں کی وجہ سے کثیر رقمیں صرف ہوئیں تھیں، مگر اب یہ کام مکمل ہو چکے تھے، یہی وہ علاقہ تھا جہاں کاشتکار نے یہ محسوس کیا کہ روئی کی گرم بازاری کی وجہ سے اس کی ساکھ میں اضافہ ہو گیا ہے اور اس نے اپنے قرضوں کی مقدار بڑھا کر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان خطوں میں روپے کے لین دین کا کام مارواڑیوں کے ہاتھ میں تھا جو اس صوبے میں اجنبی تھے اور جن کا شمار "کٹر" مہاجنوں میں ہوتا تھا، ہنگامہ آسانی سے فرو ہو گیا، لیکن تحقیقاتی کمیٹی نے بتایا کہ ان میں بعض اور بنیادی خرابیاں بھی کارفرما تھیں، یہ ایک مسلمہ چیز ہے کہ ساری دنیا کے مزارعین آسانی سے قرضے کے جال میں پھنس گئے، ہندوستان میں یہ خصوصیت سے اس لیے ہوا کہ یہاں بڑے پیمانے پر زراعت کا رواج نہیں ہے، انگریزوں کی آمد سے قبل یہ طریقہ مختلف باتوں کی وجہ سے دشوار تھا، مثلاً انتقال اراضی پر بندشیں تھیں اور بعض مقامات پر حکومت مہاجنوں کو اپنے قرضے واپس حاصل کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتی تھی۔[1]
انگریزوں نے انتقال اراضی کو آزاد کر دیا، رعیت داری علاقوں میں خاص طور پر کاشتکاروں کو مطلق ملکیت عطا کر دی گئی، جو پہلے کبھی ان کو حاصل نہ تھی، اس کے ساتھ ہی جو عدالتی نظام اختیار کیا گیا اس نے مہاجنوں کو اپنے قرض داروں پر غیر معمولی اختیارات دے دیے اور آخر میں قانون حدبندی نے قرضے کے تمسکوں کی کچھ مدت کے بعد تجدید لازمی قرار دے کر مزارعین کی حالت کو اور

[1] حوالۂ گزشتہ۔

۳۰ تباہ کردیا[1]۔ دراصل محض کاشتکار کا قرض دار ہو جانا کچھ ایسا بُرا نہ تھا، لیکن اس کے ساتھ جو دوسرے اسباب کام کر رہے تھے انھوں نے قرضدار کو غلامی کی حالت میں تبدیل کر دیا۔ تجارت کی عام وسعت اور اس وجہ سے کہ کاشتکار کی فصلوں نے سارے ملک میں ایک خاص بازاری قیمت حاصل کرنا شروع کر دی ہے اس کی ساکھ کو بڑھا دیا۔ عدالتوں کے ذریعے سے جس آسانی سے رقم واپس لی جاسکتی تھی اس نے مہاجنوں کو قرض دینے کے لیے پہلے سے زیادہ آمادہ کر دیا۔ خوش حالی کے زمانے میں یہ طریقہ جاری رہا، اور کاشتکار نے یہ کبھی نہ سوچا کہ وہ کہاں جارہا ہے لیکن جب ردعمل شروع ہوا اور مہاجنوں نے کاشتکاروں پر اپنی گرفت مضبوط شروع کی تو کاشتکار کو اپنی اصلی حالت کا احساس ہوا۔

یہ طریقہ کم وبیش ہندوستان کے تمام حصوں میں جاری رہا[2]، جو اسباب اوپر بیان کیے گئے اور ان کے جو نتائج ہوئے وہ بڑے اہم ہیں، گویا اس عشرے میں زمین آہستہ آہستہ اصل کاشتکاروں کے ہاتھ سے نکل کر زیادہ تر مہاجنوں کے قبضے میں جانے لگی، یہ طریقہ مفید ہوسکتا تھا اگر زمین اراضی رکھنے والوں یا تجربہ کار کاشتکاروں کے ہاتھ میں منتقل ہوتی، لیکن ملک کے عام حصوں میں صورت حال یہ نہیں رہی، مثلاً دکن میں مارواڑی زمین پر قبضہ رکھنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ اکثر صورتوں میں انھوں نے قانونی طور پر زمین اپنے نام منتقل نہیں کرائی

---

[1] حوالہ گزشتہ باب پنجم۔

[2] ملاحظہ ہو حوالہ گزشتہ ضمیمہ الف، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں مزارعین کی قرضداری کے متعلق مقالہ (۱۸۷۵ء) پنجاب میں اس کے مماثل حالات کے لیے دیکھیے ایس ایس تھارن برن مسلمان اور مہاجن (۱۸۸۶ء) اور انتقال اراضی اور ہندوستان کی زرعی قرضداری والانوٹ ۱۸۹۵ء نیز ہندوستان کی زرعی قرضداری کے متعلق شہادت، ہندوستانی قحط کمیشن کی

بلکہ وہ بدستور قدیم کاشتکار کے نام سے رہی، لیکن مارواڑی اپنے تمسکوں کی بنا پر زراعت کے سارے منافع کے مالک بن بیٹھے، کاشتکار سال بھر سخت محنت کرتا مگر سال کے غلہ پر اس کے گزارے کا انحصار مارواڑی کے رحم و کرم پر ہوتا تھا، اس طرح دکن کے کاشتکاروں کا بڑا حصہ غلاموں میں تبدیل ہو گیا۔ دراصل اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے انتقال اراضی پر بندشیں عاید کرنے کے لیے قانون سازی کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس کا آغاز ۱۸۷۹ء کے دکنی مزارعین کے امدادی قانون کے نام سے ہوا۔ ۳۱

یہاں اس قانون کی خاص خاص دفعات کا تذکرہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اولاً قرضے کی وجہ سے قید یا حوالات منسوخ ہو گئی۔ یہ ایک بڑی مفید بات ہوئی کیونکہ دراصل یہی وہ قانونی گر تھا جس کی دھمکی کے اثر سے مہاجن نے کاشتکار پر زبردست قابو پا لیا تھا۔ اگر چند چیزوں کی تشفی کر دی جاتی تو کاشتکار دیوالیہ قرار دیدیا جاتا تھا اور وہ آیندہ کی دین داریوں سے بچ جاتا تھا۔ کاشتکار کی دیانت کا ایک بڑا اچھا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اس دفعہ سے بہت کم فایدہ اٹھایا۔ دیہی منصفوں اور مصالحت قرضہ کی مجالس کا طریقہ رائج کیا گیا، یہ چھوٹی چھوٹی رقموں کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر اگر ممکن ہو سکتا تھا تو واجبی اصولوں پر قرضے کا چکوتا کرا دیں۔ عدالتوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ مزارعین کے سلسلے میں قرضے کی گزشتہ تاریخ کی بھی تحقیقات کیا کریں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۰ء کے عشرے میں سارے ہندوستان میں کاشتکاروں نے جو کچھ ترقی کی وہ سب کھو بیٹھے بعض حصوں میں یہ صورت بہت طویل عرصے تک کافی بری رہی[1]۔ مگر اس سلسلے میں کوئی عام بیان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ رپورٹ ۱۸۸۰ء۔

[1] جھانسی کے بلوے کے متعلق ملاحظہ ہو زرعی قرضداری کی بابت شہادت، ہندوستانی قحط کمیشن کی

نہیں دیا جاسکتا۔ رقبۂ کاشت اور فصلوں کی اقسام پر بھی قحطوں کا اثر پڑا لیکن رقبۂ کاشت میں کہاں اضافہ ہوا اور فصلوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں ان کے متعلق زرعی اعداد و شمار کی عدم موجودگی کی وجہ سے کچھ نہیں کہا جاسکتا[1] اور اس قسم کی بیرونی شہادتیں بھی موجود نہیں جن سے یہ فرض کیا جائے کہ ایسی تبدیلیاں ہوئیں تھیں، البتہ ایک بات یقینی ہے اور اس کا ثبوت مالی کمیٹی، قحط کمیشن اور دوسرے ذرایع سے بھی ملتا ہے کہ اس دور کے آخر میں کاشت کار کی حالت غربت کی انتہائی حدود پر پہنچ گئی تھی۔
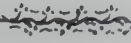
بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ رپورٹ (سنہ ۱۸۸۰ء)

[1] سی، اے، ایلیٹ، ہندوستان کے زرعی اعداد و شمار پر ایک نوٹ، حوالۂ گزشتہ، ضمیمہ دوم۔

باب سوم

دستکاریوں کا زوال

انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہندوستان کی شہری مصنوعات کا بڑا حصہ ان دستکاریوں پر مشتمل تھا جن سے رؤسا کے لیے بہترین قسم کے کپڑے یا تعیشاتی چیزیں تیار کی جاتی تھیں، اگرچہ اس طرح شہری صنعت اپنی وسعت و نوعیت کے اعتبار سے محدود تھی، تاہم ایک طرح سے وہ بڑی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ منظم صنعت یہی تھی اور اسی نے اپنی نوعیت کے لحاظ سے سب سے پہلے بیرونی مسابقت کے اثرات کو محسوس کرنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان دستکاریوں میں ہندوستان کی شہری صنعت، نفاست کے اعلیٰ معیار پر پہنچ گئی تھی، ہندوستانی مصنوعات ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکی تھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی دور میں بنگال کے چھپے اور کڑھے ہوئے کپڑے ہندوستانی تجارت میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، ان صنعت کارانہ اشیا کی نفاست میں کوئی کلام نہ تھا۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ جہاں ان کا معیار صنعتی نقطۂ نظر سے بہت بلند تھا وہیں ان میں افادہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔[1] ڈاکٹر واٹسن

[1] جے، لیف، رائل، "ہندوستان کی دستکاریاں اور مصنوعات" ۱۸۵۱ء کی نمائش عظیم کے لکچروں

کہتے ہیں کہ "زیبائشی کاموں میں ہندوستانیوں کا ذوق بہت ہی لطیف ہے اور لطف یہ ہے کہ نہ تو ان کی زیبائش میں کوئی چیز ضایع ہوتی ہے اور نہ ان پر جو کثیر مصارف کیے جاتے ہیں اس سے ان کے آرام دہ ہونے میں کوئی کمی آتی ہے"[1] ام، بلان کوئی ایک فرانسیسی نے ۱۸۵۱ء کی نمایش عظیم میں جب ہندوستانی شعبہ کو دیکھا تو اس نے ہندوستان کے صناعوں کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ "مصنوعات میں ہندوستانی مشرق کے فرانسیسی ہیں"[2]

درحقیقت خاص صنعت، پارچہ بافی کی دستکاریاں تھیں، اور ان میں روئی کی صنعت سب سے اول تھی، دستکاریاں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں[3]. اور ان میں ڈھاکے کی ململ زیادہ مشہور اور بہترین تھی، یہی وہ ململ تھی جس کے متعلق مانچسٹر کے ایک کارخانہ دار نے، جب وہ اس کی نفاست اور عمدگی کا مقابلہ نہ کرسکا تو جل کر کہا کہ "یہ کوئی شے نہیں بلکہ اس کا عکس ہے"۔ ۱۸۸۰ء میں بھی ڈھاکے میں ململ تیار ہوتی تھی، مگر اس کی نفاست میں بڑا فرق آگیا تھا، اور صنعت میں مجموعی حیثیت سے تنزل کے آثار پیدا ہوگئے تھے، یہ ایک ایسی صنعت تھی جس کا سارا دارومدار اعلیٰ اور پرشکوہ درباروں پر منحصر تھا، مسٹر مکرجی کے بیان کے مطابق بیس گز لمبا اور ایک گز چوڑا عمدہ ململ کا ٹکڑا ایک انگوٹھی کے درمیان سے گزر سکتا تھا، اور اس کی تیاری میں چھ ماہ صرف ہوتے تھے[4]۔ درباریں

۲۲

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کا سلسلہ حصۂ اول۔

[1] جے، ایف، واٹسن، ہندوستانیوں کے ملبوسات اور سوتی مصنوعات" ص ۵ (۱۸۶۶ء)

[2] رائل، حوالہ متذکرۂ بالا ص ۵۳،۵۴ ۔

[3] ہندوستان کی دستکاریوں کی عام تفصیل و تقسیم کے متعلق ملاحظہ ہو" رائل، حوالۂ صدر، سرجی، برڈوڈ ہندوستان کے صنعتی فنون (۱۸۸۰ء) اور ٹی، این، مکرجی، "ہندوستان کی فنی مصنوعات۔

[4] ٹی، این، مکرجی، ہندوستانی مصنوعات پر اجمالی نظر، (۱۸۸۳ء) ۔

اس کی مسلسل اور اچھی خاصی مانگ رہتی تھی، اور اس کے بغیر اس کا تنزل لازمی تھا، ڈھاکے کے علاوہ کرشنا گر، چندیری اور دوسرے مقاموں پر بھی ململ تیار ہوتی تھی۔

اہمیت کے لحاظ سے ململ کے بعد تمام دوسرے قسم کے بہترین سوتی کپڑے تھے جو سارے ہندوستان میں تیار کئے جاتے تھے، شمالی مغربی صوبوں میں لکھنؤ اپنی چھینٹوں کے لیے مشہور تھا، احمد آباد کی دھوتیاں اور ڈوپٹے مشہور تھے، صوبجات متوسط میں ناگپور، امریر، اور پیاونی اپنے ریشمی حاشیے دار کپڑوں کے لیے شہرت رکھتے تھے، صوبۂ مدراس میں پالم پوری صنعت مخصوص تھی[1] مدورا اور اکثر دوسرے مقامات کے کپڑے بھی کافی مشہور تھے۔

دراصل سوتی کپڑوں کی صنعت بہت زیادہ عام اور وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اس کے بعد ریشمی کپڑوں کا درجہ تھا، ان میں سب سے زیادہ مشہور مرشد آباد کے چھاپے، بند دانہ[2] اور کورے کپڑے تھے، اور بنگال کے دوسرے قصبوں کے مال کی، برآمد کے لیے زیادہ مانگ تھی[3] بنارس اور احمد آباد وغیرہ میں پھول دار کامدانی کا کام ہوتا تھا اور دو رنگی سوتوں کی بناوٹ کا کام پونا، یولا اور دوسرے مقامات پر ہوتا تھا۔

اونی مصنوعات میں سب سے زیادہ نفیس چیز کشمیر کی شالیں تھیں، جو خاص طور پر کشمیر، امرتسر، لدھیانہ اور پنجاب کے دوسرے قصبوں میں

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون "جنوبی ہند کے فنون کا زوال" از پنڈت نٹیسا شاستری، جنرل آف انڈین آرٹ، (۹۰-۱۸۸۹ء) صوبۂ مدراس میں پالم پور ایک قصبہ ہے، جہاں پھول دار پلنگ پوش وغیرہ بنتے تھے، اور یہ صنعت اپنے قصبے کے نام ہی سے مشہور ہو گئی (مترجم)۔

[2] ایک ریشمی کپڑا ہوتا ہے، جس کے بندکیوں دار رومال کچھ عرصے پہلے تک ملک میں بڑے مقبول تھے (مترجم)

[3] جے، گیو ٹھاگن، حوالۂ گزشتہ۔

تیار ہوتی تھیں، ۱۸۸۰ء کے قریب اس صنعت میں تیزی سے زوال ہو رہا تھا، اور رفتار زوال اس قدر تیز تھی کہ ۱۸۹۵ء میں یہ صنعت محض ایک روایت، یا عہد گزشتہ کی یادگار رہ گئی[1] اس صنعت کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے اور اس سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے کہ مختلف دستکاریوں کو قلیل عرصے میں کن مدارج سے گزرنا پڑا، جبکہ ان کو نئے حالات سے دوچار ہونے کا موقع آیا۔ یہ صنعت کشمیر میں محدود رہتی مگر کشمیری شالیں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں، اور تمام درباروں میں ان کی مانگ تھی، ۱۸۳۰ء میں ایک سخت قحط پڑا، جس نے بہت سے شال بننے والوں کو پنجاب میں ڈھکیل دیا۔ یہ لوگ پنجاب کے قصبوں میں بس گئے اور یہیں اپنا کام شروع کر دیا۔ اس طرح امرتسر شالوں کی تجارت کا بڑا مرکز بن گیا، لیکن اس وقت یعنی وسط صدی میں اس صنعت میں ایک بڑا تغیر ہو رہا تھا، شالیں یورپ اور بالخصوص فرانس میں بہت مقبول ہو رہی تھیں، اور فرانسیسی تجار اس صنعت پر آہستہ آہستہ قابض ہو رہے تھے، چھٹے عشرے میں انھوں نے اس پر بالکل قبضہ کر لیا۔ انھوں نے بافندوں کو پیشگی رقمیں دینا اور تیار شدہ مال خریدنا شروع کر دیا تھا، البتہ اس سلسلے میں ان کی تعریف کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ملاوٹ کو روکنے کی کوشش کی اور کیمیاوی رنگوں کے استعمال کو رائج نہ ہونے دیا۔ کیونکہ تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستانی پارچہ بافی کی دستکاریوں کے زوال کا بڑا خاص سبب یہی چیز ہے[2] لیکن اس کے لیے فرانسیسی جرمن لڑائی ایک حادثہ تھی

۲۴

[1] سر ڈبلیو، آر، لارنس "وادیٔ کشمیر" ص۳۷۵ اور متعاقب

[2] لیکن سر جی، برڈوڈ کی رائے میں فرانسیسی تاجروں کے مختلف یورپی نمونوں کے رواج نے جو اس وقت فیشن ایبل سمجھے جاتے تھے، اس صنعت کی فن کارانہ خوبیوں کو زائل کرنے میں تیزی سے مدد کی۔ ملاحظہ برڈوڈ حوالۂ گزشتہ۔

اور یہ دھکا ایسا سخت لگا کہ پھر یہ صنعت جاں بر نہ ہو سکی، جنگ نے فرانسیسی طلب کو بالکل ختم کر دیا۔ اور لڑائی کے بعد بھی فرانس میں فیشن کی تبدیلی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اس کی مانگ دوبارہ پیدا نہ ہو سکی، چھٹے عشرے میں غالباً شال کی صنعت پنجاب کی سب سے زیادہ شاداب دستکاری تھی لیکن دوسرے ہی عشرے میں اس کی حالت بڑی ابتر ہو گئی، ملاوٹ کی خرابیاں اور کیمیاوی رنگوں کے استعمال کے نقصان دہ اثرات برابر کام کر رہے تھے ارزان اور ناقص مال بازار میں لانے کی تحریص نے اس کی شہرت کو خاک میں ملا دیا، بافندوں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، اور شال کی صنعت ایک بیگاری صنعت بن کر رہ گئی، اس کے ساتھ ہی ساتھ پیرس میں ارزاں نقلی شالیں تیار ہونے لگیں، یہ آخری اور مہلک صدمہ تھا، یہ صنعت اس اثر سے بالکل مغلوب ہو گئی، اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے نویں عشرے میں یہ محض ایک روایت رہ گئی[1]

۳۵

سوتی اور بنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ یہاں دھاتوں کا کام بھی ہوتا تھا، سارے ہندوستان میں بنارس پیتل، تانبے اور بھرت کے برتنوں کے لیے مشہور تھا، اس صنعت کے دوسرے مرکز صوبۂ بمبئی میں ناسک اور پونا اور جنوب میں حیدر آباد، وزگا پٹم اور تنجور تھے وہ صنعت جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی یہ اس کے چند مشہور مرکز تھے، دھاتوں کے دوسرے مختلف کام مثلاً مینا کاری، پچی کاری، اور بیدری کام بھی اعلیٰ ترین معیار پر پہنچ گئے تھے، سونے اور چاندی کی پچی کاری عام طور پر اسلحہ اور ڈھالوں کو مزین کرنے کے لیے کی جاتی تھی۔ یہ کام کچھ، سندھ، اور پنجاب کے مختلف شہروں مثلاً سیالکوٹ، کوٹلی

---

[1] لارنس، حوالۂ تذکرہ گزشتہ۔ اور ڈی، سی جان اسٹون، پنجاب کی ادنیٰ مصنوعات کا مقالہ بابت ۱۸۸۶ء۔

اور لاہور میں ہوتا تھا۔

راجپوتانے کے شہر بھی مختلف صنعت کارانہ کاموں کے لیے مشہور تھے، بالخصوص میناکاری، زیورسازی، اور سنگ تراشی یہاں کی خاص صنعتیں تھیں، اس قسم کی دستکاریاں جو ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں، بہت زیادہ تھیں، اور زیادہ تر صنعت کارانہ دست کاریاں ایک یا دو مقاموں پر جمع ہوجایا کرتی تھیں، ان دستکاریوں میں تقسیم عمل کی بھی بڑی حد تک گنجایش تھی، اگرچہ یہ تقسیم عمل اس حد تک قطعی اور مکمل نہ تھی جیسی کہ آج کل میکانی آلات کے ترقی کے دور میں پائی جاتی ہے، لیکن اس حد تک ضرور تھی جہاں تک کہ اس زمانے کے آلات اس کی اجازت دیتے تھے، اور کسی خاص شعبے میں بہترین قسم کی مہارت اور برتری حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی تقسیم عمل بے حد ضروری تھی، اس طرح سونے اور چاندی کی تارکشی میں سامان کو کام کرنے والوں کی مختلف ٹولیوں سے گزرنا پڑتا تھا، تقسیم عمل کے ساتھ ہی ساتھ کسی حد تک تحصیر صنائع بھی تھی، لیکن یہ تحصیر بہت ہی نامکمل تھی۔

اس طرح ہر اہم شہر میں تکملے کے لیے مختلف دستکاریاں پائی جاتی تھیں، قدرت کی ان پابندیوں کے تحت جو خام مال کی رسد میں حائل ہیں یا دوسرے اسباب کی بنا پر بعض دستکاریاں ملک کے مختلف حصوں میں تحصیر ہو گئیں، مثلاً شال کی صنعت یا کاغذ کی لبدی کا کام کشمیر تک محدود تھا[1]۔ نیز یہ بھی صحیح ہے کہ قدیم روایات کے اثر یا اسی قسم کے دوسرے متعدد اسباب کی بنا پر بعض پیشوں نے چند خاص شہروں میں اجارے کی حیثیت حاصل کرلی، مثلاً مرمر کا کام آگرے میں محصور ہو گیا[2]۔ پھر ۳۶

---

[1] اس کی دوسری اچھی مثال میسور اور جنوبی کنارا کی صندل کی لکڑی کی نقاشی ہے۔

[2] اس صنعت کی آگرے میں تحصیر کی بڑی وجہ راجپوتانے کی مرمر کی کانوں کی قربت تھی۔

بعض مقامات اپنی خاص پیداواروں کے لیے مشہور ہو گئے مثلاً پولا کی پٹھیانی ساری مرہٹواڑی میں مشہور تھی، احمد آباد کا کمخواب سارے ہندوستان میں مشہور رہا یا شمالی ہند کے بعض شہروں کی گل کاری کا بھی یہی حال تھا مگران مستثنیاتی صورتوں سے اصل مسئلے میں کوئی فرق نہیں ہوتا یہ صرف ایسی مخصوص چیزیں تھیں جن کی تیاری میں خاص مہارت کی ضرورت تھی، اور جن کی مانگ ان کے تیار ہونے والے مقام سے باہر بہت محدود تھی غور کرنے کے قابل خاص بات یہ ہے کہ دستکاریوں کی طلب صرف انھی مقامات تک محدود تھی، جہاں کہ وہ تیار کی جاتی تھیں، استثنائی صورتوں کے علاوہ ان کی بیرونی مانگ بہت ہی غیر اہم ہوتی تھی، طلب کے رتبے کی یہ محدودیت ہندوستانی دستکاریوں میں ایک بڑی رکاوٹ تھی، کیونکہ اس سے ان کی نوعیت کاروبار پر اثر پڑنے کے علاوہ ان کی اندرونی تنظیم کی ترقی میں بھی موانعات پیدا ہو جاتے تھے۔

اگر ہندوستان کی دوسری صنعتوں سے مقابلہ کیا جائے تو شہری صنعت بڑی حد تک منظم نظر آتی تھی، ہندوستان کی صنعتی آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا تھا، لیکن وہ معمولی کاریگر ہوتے تھے جو بیشتر گاؤں کے ملازم ہوا کرتے تھے، یہ اپنے آبائی پیشوں میں معروف تھے اور ان پر بیرونی دنیا کا کوئی اثر نہ پڑا تھا، دیہات میں تخصیص کا سوال نہ تھا اور یہاں کی معاشی تنظیم بہت ہی ابتدائی شکل میں تھی، لیکن بڑے شہروں میں ہر پیشہ پنچایتوں کی شکل میں منظم ہو چکا تھا، یہ پنچایتیں اپنے اراکین کی نہ صرف بہبودی کا خیال رکھتی تھیں بلکہ ان کے کام کی نگرانی بھی کرتی تھیں، بعض اوقات شہر کے سب سے بڑے آدمی کو پنچایت کا اعزازی صدر بنا دیا جاتا تھا مثلاً احمد آباد میں ان کو "نگر سیٹھ" یا "امیر بلد" کہا جاتا تھا، سر جارج برڈ وڈ ان پنچایتوں کی عام تنظیم کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "ہر پنچایت کی ایک علٰحدہ مجلس ہوتی تھی جس میں معززین اور مہاجن ہوتے تھے جن کو "پنچ" کہا جاتا تھا، اگرچہ پنچایتیں

اس پیشے کے تمام لوگ شریک رہتے تھے مگر سیٹھوں اور امرا کو خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا، جو عموماً دو شخص ہوا کرتے تھے، اور ان کی یہ گدیاں آبائی ہوتی تھیں، دوسرا ذمہ دار آدمی تنخواہ دار منشی ہوتا تھا جو گماشتہ کہلاتا تھا۔[1] عموماً ان دستکاریوں میں ہر جگہ آزاد کاریگر کوئی بڑا سرمایہ دار نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنے گاہکوں کی طلب اور انھی کے مہیا کردہ مال کی بدولت کام کیا کرتا تھا؛ لیکن جہاں تک حالات اجازت دیتے تھے ہندوستان کی شہری صنعتیں اچھی طرح منظم تھیں اور جب تک ان کی طلب قایم رہتی وہ برابر پھلتی پھولتی رہتی تھیں، مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں وہ ہندوستان کی معاشی تنظیم میں مناسب حال اور اہم حیثیت رکھتی تھیں، لیکن اس کے باوجود ان دستکاریوں کی معاشی اہمیت اور ان کی صنعت کارانہ عمدگی دونوں کے زوال کا مسئلہ تیزی سے ہمارے سامنے آجاتا ہے، زوال اگرچہ صنعتی صورتوں میں اٹھارھویں صدی کے اختتام ہی سے شروع ہوچکا تھا مگر انیسویں صدی کے وسط میں وہ بہت نمایاں ہوگیا۔

اس زوال کے مختلف اسباب تھے، لیکن ان میں سے اہم یہ تھے کہ پہلے تو مقامی ہندوستانی درباروں کا خاتمہ ہوگیا، دوسرے ملک میں بدیسی حکومت قایم ہوئی جس کی وجہ سے بہت سے بیرونی اثرات ملک میں داخل ہوگئے جیسا کہ عموماً حکومت کی تبدیلی کی صورت میں ہوتا ہے اور تیسرے ان کو کافی ترقی یافتہ اور منظم صنعت سے مقابلہ کرنا پڑا۔

ان میں سب سے پہلے سبب کا یہ مطلب ہے کہ ان دستکاریوں کی طلب کا خاص ذریعہ یا کم و بیش بیشتر ذریعہ بالکل ختم ہوگیا ہم پہلے مسٹر ہوئے کا بیان نقل کرچکے ہیں کہ لکھنؤ کی دستکاریوں پر اس کا کتنا

[1] برڈوڈ، حوالہ متذکرۂ بالا حصۂ اول ص ۱۳۹۔

زبردست اثر پڑا، نواب[1] کے دربار کے خاتمے کا یہ مطلب تھا کہ ان اشیا کی جن کی رؤسا کو سرکاری تقاریب، درباروں یا دوسرے رسوماتی موقعوں پر نمائش کے لیے ضروریات ہوا کرتی تھی، اب قطعی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جہاں بھی دربار کا خاتمہ ہوا وہاں دستکاریوں اور صنعتوں کا زوال شروع ہوگیا، ابتدا میں تبدیلی کی رفتار تیز نہیں تھی کیونکہ اگرچہ دربار ختم ہوگئے مگر رئیسوں کا طبقہ باقی تھا، کسی خاص مقام کی شہرت ایکدم ختم نہیں ہوتی، اور نہ کسی خاص طبقے کی طرزِ رہائش میں ایکدم سے کوئی نمایاں تبدیلی ہوتی ہے، اس طرح درباروں کے خاتمے کے باوجود اکثر مقام پر تعیشاتی اشیا کی مانگ برابر قائم رہی مگر اس میں برابر کمی ہوتی جارہی تھی، نئی پود نے ان درباروں کی شان و شوکت میں پرورش نہیں پائی تھی، انھوں نے صرف روایات سنی تھیں، لہٰذا ان کے سامنے وہ ترغیبات نہ تھیں جن کے تحت پرانے لوگ صنعتوں اور دستکاریوں کی سرپرستی کرتے تھے، اس امر کی ایک اور واقعے سے بھی توجیہ ہوتی ہے، اگرچہ آہستہ آہستہ برطانوی حکومت سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی مگر اکثر مقامات براہ راست اس کے اثر میں نہیں آئے یہاں ان ملکی حکمرانوں کی قیادت تھی جن کی شان و شوکت اور دولت میں اگلی سی بات باقی نہ رہی تھی، چنانچہ اگر ایک طرف برطانوی ہند میں دستکاریوں میں زوال آرہا تھا تو دوسری طرف اکثر ریاستوں کے دارالحکومتوں میں یہ ترقی کر رہی تھیں، اس کی مثالیں کشمیر، راجپوتانہ اور کاٹھیاوار کی ریاستوں اور ممالک محروسہ سرکار عالی میں ملتی ہیں، یہاں ایک بات اور قابل لحاظ ہے کہ ریاستوں میں نہ صرف ان پُر صنعت

---

[1] نوابانِ اودھ بالواسطہ طریقے پر لکھنؤ میں رنگائی کی صنعت کو فروغ دینے کا باعث ہوئے، اس کی وجہ وہ ہدایت تھی جس کی وجہ سے امرا کو سال کے مختلف تہواروں اور دیگر موقعوں پر مختلف رنگ کے کپڑے پہننا پڑتے تھے، ۱۸۵۶ء کے بعد لکھنؤ کی رنگائی کی صنعت میں بہت تیزی سے زوال آگیا۔ یس، یم، ہادی، رسالہ بابت رنگ و رنگائی صوبجات شمال و مغرب (۱۸۹۶ء)۔

اشیا کی مانگ پیدا ہوگئی بلکہ اکثر رئیسوں نے بہترین صناعوں کی مستقل تنخواہ مقرر کرکے ان کو یہ پیشے ترک نہ کرنے دیے[1]۔ اس طرح جب صناعوں کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو وہ فرصت سے اپنی اشیا بنانے اور اپنے خیالات کو ترقی دینے میں مصروف ہوگئے، تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ دستکار صرف اسی صورت میں بہترین چیزیں تیار کرسکتے ہیں جبکہ ان کو اپنی چیزیں بازار میں لانے کی جلدی نہ ہو، اس نکتے کی مزید وضاحت بیکار ہے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ درباروں کے زوال نے ہندوستانی دستکاروں کو پہلا زبردست دھکا پہنچایا۔ کیونکہ اس سے ان کی مصنوعات کی طلب میں مستقل کمی آگئی، اس کا سب سے فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ان بہترین قسم کی چیزوں کی تیاری مسدود ہوگئی جن کی شاہ وقت یا رؤسائے عظام کو بڑے سرکاری موقعوں پر ضرورت ہوا کرتی تھی، البتہ ان کی معمولی طلب درباروں کے خاتمے کے کچھ دنوں بعد تک بھی قایم رہی مگر اس میں بھی رفتہ رفتہ کمی آتی جارہی تھی۔

محض درباروں کے خاتمے کو ان دستکاریوں کی ابتری کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ جہاں دربار قایم رہے وہاں بھی ان میں زوال پذیری شروع ہوگئی اگرچہ اس کی رفتار برطانوی ہند کے مقابلے میں تیز تر نہ تھی، اس کا سبب دوسرا ہے، ملک میں بدیسی حکومت قایم ہوئی اور اس کی بدولت وہ غیر ملکی اثرات جو ان صنعتوں کے وجود کے لیے مضر تھے دیسی ریاستوں میں بھی پھیلنا شروع ہوگئے۔

۳۹ اوپر یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ کس طرح ان اشیا کی مانگ کا خاتمہ ہوا جن کا درباروں کے وجود پر انحصار تھا، لہٰذا اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلب کے نئے ذرایع کیا تھے، دستکاروں کی مصنوعات

[1] بعض اوقات حکومت بڑی مصنوعات گاہیں اپنے صرفے سے چلاتی تھی، ملاحظہ ہو جے سرکار کا مضمون "سلطنت مغلیہ کے عہد میں سرکاری صنعتیں" ماڈرن ریویو نومبر ۱۹۲۲ء۔

کی ضرورت شہر کے رئیس طبقے کو ہوا کرتی تھی لہٰذا قدرتی طور پر اب ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے جنھوں نے برطانوی حکومت کے عہد میں قدیم درباروں کے رئیسوں کی جگہ لی، اس میں کوئی کلام نہیں کہ پرانے شریف خاندانوں کے جانشینوں کے پاس اب تک کافی دولت تھی لیکن یہ بالعموم زمیندار تھے اور جب ان کے سامنے شہروں میں رہنے کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تو یہ اپنی جاگیروں اور زمینداریوں میں چلے گئے قصبات میں ان کی جگہ دو طبقوں نے لے لی، اول یورپی حکام اور دوسرے نئی تعلیم کے علمی اور آزاد پیشے والے۔

حکمراں طبقے کی وجہ سے ہندوستانی اشیا کی جو مانگ باقی تھی اس میں یورپی سیاحوں کی طلب بھی شامل تھی، اس کا اثر ہندوستانی دستکاروں پر دو قسم کا ہوا، پہلے تو یہ طلب مصنوعات کے زوال کو روک نہ سکی، کیونکہ پرانے درباروں کے مقابلے میں موجودہ طلب بہت کم تھی، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے متزلزل عمارت کو ایک دم ڈھیر کرنے کے بجائے آہستہ آہستہ گرایا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یورپی مانگ کی بدولت جو دوسرا سبب پیدا ہوا اس کو دستکاریوں کی معاونت میں کس حد تک دخل ہے، سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ نئی طلب نے مصنوعات کی صنعت کارانہ قدر کو گھٹا دیا، اس کی بڑی مثال کشمیر کی شال کی صنعت میں نظر آتی ہے، جبکہ فرانسیسی کارکنوں نے اس صنعت میں یورپی نمونوں کو داخل کرنا شروع کیا، لیکن ہر جگہ یہی صورت پیش آئی، یورپین لوگوں نے نئی نئی طرزوں اور نمونوں کی ترویج شروع کی جن کو دستکار سمجھ نہ سکتا تھا، انھوں نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے محنت کی، اور توجہ سے ان کی نقلیں بنائیں، لیکن بسا اوقات اصل اور نقل میں بڑا فرق ہوا[۱] لیکن جہاں ان کی نقل اچھی بھی ہوئی

[۱] یورپی طرزوں کی نقل کی گئی مگر بری طرح، ملاحظہ ہوسی، جے ہیلی ملکس، رسالہ پنجاب میں شیشہ د

وہاں بھی ان میں دیسی مصنوعات کی روح اور تاثیر موجود نہ تھی ہر صورت میں اس کا اثر دیسی فن کے لیے مہلک ثابت ہوا، مسٹر میکلیگن، کوٹلی کی صنعت کو فنت گری کے متعلق مختصراً یوں رقمطراز ہیں کہ "نوعیت کار گھٹ رہی ہے، قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ یورپین سرپرستی کی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے[1]"، ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے، بے ربط یورپین سرپرستی ہر جگہ معیار کو گھٹا رہی تھی، یورپین نمونوں کی ترویج اور پرانے طریقوں میں بصیرت کی کمی ہی کوئی خاص چیز نہ تھی، بلکہ سیاحان یورپ کی طلب جواب دے کے ایک خاص سہارا رہ گئی تھی وہ دراصل ارزاں اشیا کی مانگ تھی، وہ ممکنہ طور پر ارزاں قسم ہلکے زیورات اور تحفے وغیرہ چاہتے تھے اور یہ انھیں مل بھی جاتے تھے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خام مال میں بہت زیادہ آمیزش اور تیاری میں جلد بازی دکھائی جانے لگی،

دوسرا طبقہ جو قدیم امرا کا جانشین ہوا وہ نئے تعلیم یافتہ لوگ تھے یہ زیادہ تر شہری اور علمی پیشوں سے تعلق رکھنے والے تھے، اور یہ تقریباً مغرب کے طبقے "بورژوا" سے مماثلت رکھتے تھے[2]۔ اس طبقے سے دستکاریوں کی سرپرستی کی توقع کی جاسکتی تھی مگر ان کی طلب اتنی بھی نہ تھی جتنی کہ یورپین لوگوں کی سوائے چند استثنائی صورتوں کے ان سب نے دیسی فنون سے منھ موڑ لیا تھا، بدیسی حکومت کا سب سے زیادہ مضر اثر یہ ہوا کہ اس نے مفتوحین پر فاتحین کے تصورات کا اثر ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے حالیہ پیدا شدہ طبقہ بورژوا نے انیسویں صدی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ظروف سازی ۱۸۸۵ء

[1] ای، ڈی، میکلیگن کتابچہ "پنجاب کے سونے اور چاندی کے کام" (۱۸۹۰ء)

[2] ہندوستان میں بورژوا طبقے کے عروج کے دلچسپ حالات کے لئے ملاحظہ ہو یم، ین، رائے "ہندوستان جمہوریت میں" باب اول ۱۹۲۲ء۔

آخری دور میں ہر یورپی معیار کو تسلیم کرنا اور ہر ہندوستانی چیز کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا۔ اور فنون کے سلسلے میں تو خاص طور پر یہی صورت پیش آئی یورپ کے فیشن کی تقلید ترقی کی علامت سمجھی جانے لگی، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ دیسی صنعتوں کو نقصان پہنچنا شروع ہو گیا۔ پنجاب کی ریشم کی صنعت کے کتابچے میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ "جیسا کہ سکھوں کے عہد میں دستور تھا یا اب تک مقامی ریاستوں میں باقی ہے اب ریشمی کپڑے پہننے کا دستور نہ رہا۔ یورپ کے سوتی کپڑوں، چھپی ہوئی چھینٹوں اور ارزاں سیاہ بانات نے ریشمی کپڑوں کو میدان سے ہٹا دیا[1]" نیز شمال مغربی صوبوں میں "جب خالص شرقی نمونوں کی کوئی قدر نہیں رہی تو ظروف سازی کی صنعت کارانہ اشیا کی تجارت کا خاتمہ ہو گیا[2]" اکثر سرکاری رسالوں میں صنعتوں کے متعلق جا بجا اس قسم کے بیان ملتے ہیں کہ "طلب خالص یورپین ہے۔"

ہندوستانی برتر طبقے نے جو کچھ کیا اس سے اسی کی توقع رکھنا چاہیے تھی، کیونکہ یہ خالصتہً برطانوی حکومت کی پیداوار تھا، لیکن بیشتر موقعوں پر یوروپین لوگوں کے غیر معقول ضابطے یا دستور یا ان کی ناپسندیدگی کے ڈر سے بہت سے ذوق ان کے سر منڈھ دیے گئے، چنانچہ اس چیز کو مسٹر کپلنگ کارچوبی جوتوں کے زوال کے سلسلے میں یوں بیان کرتے ہیں "کارچوبی جوتوں کے استعمال کو روکنے اور سیاہ چمڑے کے جوتوں کے رواج کو بڑھانے کے لیے کوئی باضابطہ تحریری قاعدہ نہیں بنایا گیا لیکن اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ جب کوئی شرقی شخص اپنے کسی افسر سے ملنے جائے تو اس کے پاؤں میں پیٹنٹ چمڑے کا جوتا اور موزے ہونا چاہئیں، اس دستور نے اس کو پیٹنٹ کے جوتے رکھنے اور

[1] ایچ، سی، کک سن، رسالہ "ریشم کی صنعت" (۱۸۹۲ء)
[2] ڈابس، رسالہ "شمالی مغربی صوبوں میں شیشہ و ظروف سازی" (۱۸۹۵ء)

دیسی جوتوں کو ترک کر دینے پر مجبور کر دیا۔[1] لیکن صرف یہی نامساعد حالات نہ تھے بلکہ بعض صورتوں میں برطانوی راج نے دستکاریوں کو کلیتہً مٹا دیا۔ چنانچہ ہتھیار، اسلحہ اور ڈھالوں پر پچی کاری اور جڑاؤ کام کا اسی طرح خاتمہ ہوا۔ ڈاکٹر رائل[2] کے قول کے مطابق یہ ہنر ۱۸۵۷ء کے آخر تک سارے ہندوستان کے شمال مغربی حصے، کچھ، سندھ اور پنجاب میں عام تھا۔ لیکن ہتھیاروں کے استعمال اور ان کی ملکیت کو قطعی طور پر ممنوع کر دینے کی وجہ سے برطانیہ اس صنعت کو ختم کر دینے میں کامیاب ہو گئی، اور یہ صنعت صرف یورپین سیاحوں اور دوسروں کے لیے ہلکی پھلکی نمائشی اشیا کی تیاری تک محدود ہو گئی۔[3]

برطانوی راج کے قیام نے ہندوستانی دستکاریوں کو ایک اور طریقے سے متاثر کیا یعنی اس نے بالواسطہ طریقے پر پنچایتوں اور دوسرے اداروں کے اثرات کو کم کر دیا جو تجارت کو منضبط اور استعمال ہونے والے مال کی عمدگی کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی نگرانی کرنے والی جماعتیں ہٹنا شروع ہوئیں ویسے ہی ان میں بہت سی خرابیاں داخل ہونا شروع ہو گئیں، مثلاً مال کی آمیزش، نکمّی اور ناقص کاریگری وغیرہ۔[4] ان چیزوں نے مال کی صنعت کارانہ اور تجارتی دونوں حیثیتوں کو گھٹا دیا۔

---

[1] کپلنگ "پنجاب کی صنعتیں" جرنل آف انڈین آرٹ نمبر ۱ (۱۸۸۸ء)۔

[2] راگل، حوالہ گزشتہ۔

[3] ملاحظہ ہو کرجی کی کتاب۔ حوالہ مندرجۂ بالا۔

[4] اکثر وہ تجارتی جتھے جو کام وغیرہ کی عمدگی کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے نسبتہً زمانۂ حال تک موجود تھے، خصوصیت کے ساتھ بہ صورت تارکشی اور گوٹے کی صنعتوں میں تھی، جہاں اس بات کی نگرانی کی سخت ضرورت تھی کہ خام مال میں آمیزش نہ ہو، تاکہ اس مقام کی شہرت برقرار رہے۔ ملاحظہ ہو ای، برڈن، رسالہ "تارکشی و گوٹا کناری" پنجاب (۱۹۰۹ء) اکثر مقامات مثلاً دہلی اور لکھنؤ میں یہ صنعت اسی وقت سے مٹنے لگی جبکہ نگرانی کرنے والی جماعتیں ختم ہو گئیں، ملاحظہ ہو

۴۲

بلا شبہ درباروں کے خاتمے اور بدیسی حکومت کے قیام نے ہندوستانی دستکاریوں کے زوال میں بطور خاص مدد کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ یورپ کی مصنوعات کا مقابلہ بھی اس زوال کا ذمہ دار رہے، بالخصوص یہ صورت پارچہ بافی اور صنعت کے نفیس شعبوں میں بہت جلد ظاہر ہوئی، عام طور پر کاشتکار کو ایسے کپڑے کی ضرورت تھی جو موٹا مگر ارزاں اور پائدار ہو یہ کپڑا یورپ کے کارخانہ دار اس قیمت پر مہیا کرنے سے قاصر رہے، لہذا وہی جولاہا کم وبیش یورپ کی مسابقت سے محفوظ رہا، لیکن شہری جولاہا جو کافی اچھی قسم کا مال تیار کیا کرتا تھا، اس کو سارا بار برداشت کرنا پڑا، جہاں تک اشیا کی عمدگی کا تعلق تھا وہ ہندوستانی صناع خود بہتر سے بہتر بنا سکتا تھا لیکن جب قیمت کا سوال درپیش ہوا تو وہ فیشن کے بنے ہوئے سامان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا اس کے علاوہ ہندوستانی متوسط طبقے کے اس رجحان نے کہ وہ ہر غیر ملکی چیز کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بیرونی سامان کو ہندوستانی کپڑوں سے مقابلہ کرنے میں بڑی مدد پہنچائی فی نفسہ بیرونی مسابقت اتنی سخت نہ تھی، مثلاً ریشم کے مقابلے میں سوتی کپڑوں کی عمومی ترجیح کو، بیرونی سوتی کپڑوں کا، دیسی ریشمی صنعت سے مقابلہ کرنا نہیں کہا جا سکتا، بلکہ در اصل یہ ذوق اور فیشن کی تبدیلی تھی[1]۔ یورپ کی ارزاں تعیشاتی اشیا کا مقابلہ ہندوستانی شہری مصنوعات سے بہت دیر میں شروع ہوا، اور اس وقت دیسی صنعتوں میں زوال پیدا ہو چکا تھا، یہ صحیح ہے کہ بعض

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہوئے حوالہ گزشتہ۔

کشمیر کی مصنوعات میں اس قسم کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو، لارنس حوالہ متذکرہ بالا صفحات ۳۷۳-۳۷۴۔

[1] برما میں جہاں لوگوں کے عام ذوق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہاں ریشم کی صنعت میں بھی کوئی تغیر نہیں ہوا، اگرچہ بعد میں دیسی ریشمی صنعت کو چینی اور جاپانی ارزاں ریشمی کپڑوں کی مسابقت

صورتوں میں کسی خاص صنعت کا زوال محض بیرونی مسابقت کی وجہ سے ہوا، مثلاً رنگ کی صنعت، مگر یہ ایک مستثنیاتی صورت ہے، دراصل تنزل کی اصل وجہ طلب کے خاص ذریعے کا ختم ہو جانا، اور عوام کے مذاق میں تبدیلی کا ہونا ہے[۱]۔ لیکن اس کے ساتھ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر تنزل کی رفتار تیز ہو گئی اور یہ رفتار کس قدر تیز رہی اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بعض دستکاریاں جن کو سر جارج برڈوڈ نے ۱۸۸۰ء میں لاہور میں دیکھا تھا ان کا ۱۸۸۸ء میں کوئی پتا نہ تھا[۲]، زوال صنعتی اور تجارتی دونوں طریقوں سے ہو چکا تھا، صنعت کاری کے لحاظ سے پرانی اور نئی چیزوں میں جو بین فرق پیدا ہو گیا تھا اس کا اظہار ۱۹۰۲ء کی دہلی کی نمائش سے بخوبی ہو جاتا ہے[۳]۔ سبق آموز چیز یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء کی دہلی کی نمائش میں ریاست بھاؤنگر کے شعبے کی بڑی تعریف کی گئی اور اس کی تمام مصنوعات مہاراجہ کے خصوصی احکامات کی بنا پر ان صناعوں نے تیار کی تھیں جو سختی سے پرانے اصولوں پر کام کر رہے تھے[۴]۔ لیکن اس قسم کے کاموں کے لیے فرصت اور طلب دونوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

[۱] کچھ عرصے کے بعد انھی اثرات کے تحت ریاستی باشندوں کے ذوق میں بھی تبدیلی ہو گئی، چنانچہ مسٹر کوکسن ۱۸۹۰ء میں لکھتے ہیں کہ "بنگال صناعی میں بہت پیچھے ہے، عہدِ قدیم کی وہ صنعتیں جو مقامی رئیسوں کی سرپرستی میں فروغ پذیر تھیں انھی کے ساتھ ختم ہو گئیں، موجودہ راجا ملکی مصنوعات کے بجائے بدیسی مصنوعات کی سرپرستی کی طرف مائل ہیں، اور مقامی صناعوں نے اپنے آپ کو موجودہ زمانے کے مطابق نہیں ڈھالا" ای، ڈبلیو، کوکسن "بنگال کی موجودہ دستکاریوں اور صنعتوں کی رپورٹ"، ص۱۱ (۱۸۹۰ء)

[۲] ملاحظہ ہو، کیپلنگ، "پنجاب کی مصنوعات" حوالۂ گزشتہ۔

[۳] جی، واٹ، "دہلی کی دستکاریاں" حوالۂ گزشتہ ص۱۸۔

[۴] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

باتوں کا تیقن بہت ضروری تھا، اور یہ باتیں اب حاصل نہ تھیں قدیم فنون اور پیشوں کے زندہ کرنے کی مختلف کوششیں بہت بعد میں شروع ہوئیں، اس کی کچھ مدد تو فنی مکتبوں نے کی اور مختلف لوگوں مثلاً مینزر ہاویل اور کمار سوامی نے بھی اس تحریک کو آگے بڑھایا، اور ان سے کچھ تھوڑے بہت نتائج بھی پیدا ہوئے، بنگال کی مصوری کا نیا اسکول جس کی بنیاد ہندوستان کی قدیم مصوری کی روایات پر رکھی گئی تھی اسی کی ایک مثال ہے، لیکن دراصل یہ کوششیں ان چیزوں کے لیے ہوئیں جن کو فنون لطیفہ کہا جاتا ہے، لیکن مصنوعات اور صنعت کارانہ دستکاریوں کے لیے کچھ نہیں ہوا، بعض چیزوں میں نئے نمونوں کی ترویج اور نئے طریقوں کا آغاز کیا گیا، لیکن ابھی تک لوگوں کا مذاق بلند نہیں ہوا تھا، دوسرے اس زمانے میں ارزاں بیرونی تعیشاتی سامان کی مسابقت نے قدیم چیزوں کو زندہ کرنے والوں کی کوششوں کو زیادہ بارآور نہ ہونے دیا۔ زوال بدیسی حکومت کے قیام سے شروع ہوا، بیرونی اثرات نے اس کو تقویت پہنچائی اور بیرونی سامان کی مسابقت نے اس کو مکمل کر دیا۔ گزشتہ صدی کے آخر میں ہندوستان کی شہری صنعت کے سامنے دو ہی صورتیں باقی رہ گئیں تھیں کہ یا تو وہ اپنے طریق کار میں تبدیلی کر کے ارزاں سامان تیار کرے، اس طرح یہ ایک بیگاری صنعت ہو جائے گی، جس کی صنعت کارانہ قدر نہ ہوگی لیکن تجارتی نقطۂ نظر سے جاپانی مصنوعات کی طرح کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ یا پھر اپنے پرانے طریقوں پر قایم رہیں اور اس طرح تیز یا سست زوال کا مقابلہ کرتی رہیں۔

ہندوستان کی شہری صنعتیں جو اس زمانے میں ملک میں سب سے زیادہ اہم اور منظم تھیں، ان کی سرگزشت یہ تھی، اس زمانے میں صنعتیں ناگفتہ بہ حالت اور رجعتی دور سے گزر رہی تھیں، آٹھویں عشرے میں ہندوستان ایک ایسے ملک کا تصور پیش کرتا ہے جہاں دستکاریوں

۴۴

کا زوال ہو رہا تھا اور ملک میں کوئی منظم صنعت موجود نہ تھی، اس کا نتیجہ یہ ہو رہا تھا کہ لوگ زمینوں پر گر رہے تھے، شہری صنعتوں کے زوال نے زمین پر دباؤ بڑھا دیا۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ شہروں سے کسی بڑی تعداد میں نقل وطن شروع ہو گیا کیونکہ ایسا تو بالکل نہیں ہوا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا بار بھی زمین پر پڑتا رہا جن کی کچھ عرصے میں شہری صنعتوں میں کھپت ہو سکتی تھی، لیکن آبادی کے اس طبقے کیلئے کوئی راہ نکلنا ضروری تھی، اس طرح ہم اب ان نئی صنعتوں کے مسئلے پر آجاتے ہیں جو اس وقت ہندوستان میں ترویج پذیر ہو رہی تھیں۔

نوٹ۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مندرجۂ بالا باب میں جہاں کہیں دستکاریوں کا لفظ آیا ہے وہ ایک خاص محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس سے مراد وہ تعیشاتی یا نیم تعیشاتی صنعتیں ہیں جو خاص طور پر ہندوستان کی شہری مصنوعات تھیں، اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم مصنوعات دو حصوں میں منقسم تھیں، ایک طرف دیہی صنعتیں، جن میں دیہی کاریگر یا بعض دوسرے لوگ مثلاً جولاہے، سنار وغیرہ شامل تھے، ان کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس قسم کی صنعتیں زیادہ تر روزمرہ کی معمولی اور اشد ضروریات پر حاوی تھیں، اور ان کی تنظیم بھی ابتدائی شکل میں تھی، دوسری طرف نسبتہً منظم حالت کی شہری صنعتیں تھیں جو بہتر قسم کی مصنوعات تیار کرتی تھیں، لیکن یہ تقسیم ادھوری ہے، دیہات میں تعیشاتی صنعت بہت ہی شاذ ہوتی تھی، لیکن اس کے برخلاف قصبوں میں ایسی صنعتیں کافی ملتی ہیں مثلاً معمولی اور موٹی قسم کی بناوٹ، معمولی ظروف سازی وغیرہ جو دیہی صنعتوں سے مماثلت رکھتی تھیں (لیکن ان صورتوں میں شہری کاریگر کچھ زیادہ منظم نظر آتا ہے) یہ دوہری تقسیم بعض صنعتوں میں مغالطہ کن معلوم ہوتی ہے مثلاً تانبہ اور پیتل کا کام کرنیوالے کچھ اعلیٰ قسم کی چیزیں تیار کرتے تھے عادۃً روزمرہ کے استعمال کے معمولی برتن

بھی بناتے تھے، لیکن ان نقائص کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ مصنوعات دو قسم کی تھیں، اگرچہ شہروں میں معمولی کاریگری کی صنعتیں موجود تھیں، لیکن ان میں اہمیت دستکاریوں ہی کو تھی اور یہی ہندوستان کی شہری معاشی زندگی کا اہم شعبہ تھیں۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں بعض اور صنعتیں بھی تھیں جن کو ان دونوں قسموں میں شامل نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ مجموعی حیثیت سے یہ بہت زیادہ اہم نہ تھیں لیکن ان میں بعض اہم مصنوعات ضرور شامل تھیں، اس درجے میں سنگ تراش، چوڑی ساز، شیشے کا کام کرنے والے، کاغذ ساز، اور میسور، چھوٹا ناگپور، صوبجات متوسط اور دوسرے مقامات کے لوہا ڈھالنے والے شامل تھے، یہ قطعی طور پر اوپر کی دونوں قسموں میں داخل نہیں، یہ زیادہ تر وہ مقامی صنعتیں تھیں جو ہندوستان کے کسی نہ کسی خاص مقام پر محصور ہو گئی تھیں، ان میں سے بعض کاموں کے لیے اچھی خاصی مہارت کی ضرورت تھی، اور بعض صورتوں میں طریق کار کی خصوصیات یا دوسرے اسباب کی بنا پر خاص تنظیم کی ضرورت تھی، مخصوص مقاموں پر ان صنعتوں کی تحصیر میں خام مال کی رسد کو بڑا دخل تھا مثلاً لوہے، شورے اور شیشے کی صنعتیں اسی بنیاد پر تحصیر ہوئیں، بعض صنعتیں ملک کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھیں مثلاً لوہا ڈھالنے کی صنعت، جس کا بازار سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، اگرچہ عموماً طریق کار فرسودہ اور غیر معاشی ہوتا تھا لیکن بسا اوقات بہترین اشیا تیار ہوتی تھیں، میسور کے فولاد کی صنعت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ تمام متفرق صنعتیں مردہ ہوتی جا رہی تھیں غیر معقول محصول اور چلی کے نائٹریٹ کی دریافت کی بدولت شورہ کی صنعت کو کافی نقصان پہنچا، لوہا ڈھالنے والی صنعت، کوئلے کی قیمت میں قابل لحاظ اضافہ (جو جنگلات کو محفوظ بنانے اور ریلوں کی توسیع کی بنا پر ہو رہا تھا) اور کچے لوہے کی درآمد کی مسابقت کی وجہ سے نقصان

برداشت کر رہی تھی، شیشے اور کاغذ کی صنعتیں بھی بیرونی سامان کی درآمد کی وجہ سے سسک رہی تھیں، اس طرح ہندوستان کی ترقی تمام دیسی صنعتوں کو فنا کرتی جا رہی تھی۔

باب چہارم

جدید صنعت کا آغاز

فصل اول

نخل بندیاں

اب ہم کو صنعتوں کی ان نئی قسموں پر غور کرنا ہے جو اس وقت ہندوستان میں رائج ہونا شروع ہوگئیں تھیں، یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں ان کی دو شکلیں تھیں، پہلی نخل بندی، جو ممالک یورپ کے منطقۂ حارہ والے مقبوضات میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، اور دوسری کارخانے کی صنعت جو یورپ کے حالیہ معاشی تغیر کی خالص پیداوار تھی۔

نخل بندی پہلی چیز تھی جس کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی یہ صنعت شروع ہی سے بالکل یورپ کے باشندوں کے ہاتھ میں رہی اور یہ یورپ

کے ہاتھوں ہندوستانی ذرایع کے استحصال کی ابتدا تھی، یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک یورپ کے لوگوں نے ہندوستان کی معاشی جدوجہد میں بہت ہی کم حصہ لیا، اس کی وجہ وہ مختلف بندشیں تھیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یورپ کے لوگوں پر ہندوستان میں مستقل طور پر زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں عائد کر رکھی تھیں، دوسرے ۱۸۳۳ء تک کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کا اجارہ حاصل تھا، نیز ملک میں ذرایع نقل و حمل کی کمی، اور ہندوستان میں زرخیز مگر کم آبادی رکھنے والے قطعات زمین کی شدید قلت نے، ابتدا میں اس قسم کی کوششوں کو بڑھنے نہ دیا۔ لیکن جیسے ہی ان میں سے بعض رکاوٹیں دور ہونا شروع ہوئیں ہم کو ہندوستان کی یوروپین صنعتوں میں تیزی سے ترقی نظر آنے لگی، خصوصیت کے ساتھ ۱۸۶۰ء کے درمیان یہ ترقی تیز رہی جیسا کہ چائے، کافی اور جوٹ کی مصنوعات کے قیام سے پتا چلتا ہے۔

البتہ مندرجۂ بالا بیان میں نیل کی صنعت شامل نہیں ہے کیونکہ یورپ کے نخل بندوں نے ہندوستان میں اس کا آغاز اٹھارھویں صدی کے اختتام سے قبل ہی شروع کر دیا تھا، نیل ہندوستان میں عہدِ قدیم سے پیدا ہوتا تھا اور ڈاکٹر واٹس کی رائے کے مطابق گجرات اور مغربی ہندوستان اس کی پیداوار کے خاص مرکز تھے[۱]۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نیل کے رنگ کی تجارت بڑے پیمانے پر کیا کرتی تھی، لیکن اٹھارھویں صدی کے اختتام پر امریکن مال کی مسابقت اور خود رنگ میں، آمیزش کی بدولت اس کی تجارت میں بڑی کمی آگئی، مغربی ہند میں اس صنعت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھانی اور اس مقصد کے لیے جزائر غرب الہند سے نخل بندوں کو

۴۷

---

[۱] جی، واٹ، ''رسالہ متعلق نیل'' (سنہ ۱۸۹۰ء)۔ نمبر ۳ کے لیے ملاحظہ ہو صد ۱۲۔

بلا کر بنگال کے منتخب اضلاع میں آباد کیا۔[1] کمپنی کے عہدہ داروں کو بھی نیل کی تجارت کی اجازت دے دی گئی یہ واقعہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں پیش آیا اور بنگال میں اسی صنعت کے قیام نے گجرات کی صنعت کو مہلک صدمہ پہنچایا۔ آیندہ پچاس سال میں اس صنعت میں بڑی ترقی ہوئی اور سنہ ۱۸۵۰ء تک نیل ہندوستان کی اہم اشیائے برآمد میں شامل تھا، اگرچہ نیل کی تجارت اور بیرونی اشخاص کے منافع دونوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ اس نے مزارعین کی حالت کو کس قدر بہتر بنایا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کی حالت ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں، نیل کے خطوں میں بدتر تھی، لارڈ میکاف سنہ ۱۸۴۲ء میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ " اس میں بڑی خرابیاں تھیں اور بسا اوقات بڑا ظلم کیا جاتا تھا، رعایا کو قانونی ضابطوں یا قانون شکنی کے تحت پکڑ لیا جاتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ کسی صورت میں ان کی حالت نیم غلامی سے زیادہ بہتر نہ تھی"[2] نخل بند درحقیقت ایک ایسی جماعت تھی جو قانون کی ذرا بھی پروا نہ کرتی تھی۔[3] اور حکمران نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ مزارعین کے مفادات کا بہت ہی کم خیال کرتے تھے۔

جس طرح نیل کی کاشت ہوتی تھی وہ کوئی نخل بندانہ طریقہ نہ تھا، ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ نیل تیار کرنے والے، مزدوروں کو اجرت دے کر اپنی زمین پر کاشت کرائیں، عام طریقہ یہ تھا کہ نخل بند اپنی زمین پر جہاں ان کو زمینداری یا تعلقہ داری کے حقوق حاصل تھے، یا دوسرے زمیندار

---

[1] و [2] جی، واٹ، "رسالہ متعلق نیل" (سنہ ۱۹۰۸ء)۔ نمبر ۲ کے لیے ملاحظہ ہو ص ۱۴۔

[3] یہاں کوئی نظم موجود نہ تھا، اکثر نخل بندوں کے پاس غنڈوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو پڑوس کے نخل بندوں اور زمینداروں سے لڑا کرتی تھی، سنہ ۱۸۳۰ء میں بنگال کے نیل کے کارخانے پر کس طرح ایک شخص نے قبضہ کر لیا، اس کی دلچسپ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو یم، یس، ولسن "تاریخ بہار" (سنہ ۱۹۰۸ء) کتاب میں مختلف شدید لڑائیوں کا حال درج ہے، اور اس سے پتا چلتا ہے کہ نخل بند

کے آسامیوں سے معاہدہ کرلیا کرتے تھے کہ وہ اپنی زمین کے ایک معینہ حصے پر نیل کی کاشت کریں، اور نخل بند کو ایک معینہ قیمت پر فروخت کردیں[1]۔ اگرچہ اس طریقے کی خرابیاں بہت عرصے سے ظاہر ہوچکی تھیں مگر کاشتکاروں کی حالت کو درست کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی، عام طور پر کاشتکاروں کو زرعی موسم کے آغاز پر نیل کی کاشت کے لیے قمیں پیشگی دے دی جاتی تھیں، اور اکثر انھیں اس پر مجبور کیا جاتا تھا۔ رعایا جب ایک مرتبہ پیشگی لے لیتی تو وہ تباہ ہوجاتی تھی، نیل کمیشن کے ارکان نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ "اس میں کوئی فرق نہ تھا کہ خواہ رعایا پہلے پیشگی اپنی خوشی سے لے یا مجبوراً" نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی تھا، اور پھر خود مختاری باقی نہیں رہتی تھی[2]۔ بنگال و بہار میں نیل کی کاشت جس وسیع رقبے پر ہو رہی تھی، اس کے متعلق ممبرانِ کمیشن کے ذیل کے اقتباس سے طریقِ کاشت کے پورے نظام کی برائیاں ظاہر ہوجاتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ "فوائد کے مفروضات کے سلسلے میں جو موافق ترین بیانات پیش ہوئے ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ نیل کی کاشت سے عوام کو بہت ہی قلیل فائدہ ہوتا تھا، اور ان ہی بیانات سے یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ اعلیٰ پیداواروں کا تو ذکر ہی کیا، صرف چاول ہی کے مقابلے میں نیل منافع بخش پیداواروں میں سب سے نچلے درجہ پر تھا"[3] جبر و تشدد کی جو شہادتیں کمیشن کے سامنے

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ قانون کا کس حد تک خیال کرتے تھے۔

[1] نجی کاشت یعنی نخل بندوں کی ذاتی کاشت، قلیل رقبے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نخل بند یہی چاہتے تھے کہ کاشتکاران کے لیے نیل کی کاشت کریں، اور یہ ان سے مقررہ قیمت پر خرید لیا کریں (نیل کمیشن کی رپورٹ کے سلسلے میں لفٹنٹ گورنر بنگال کی یادداشت ۱۸۶۱ء)۔

[2] بنگال نیل کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۲۵۔

[3] حوالۂ متذکرۂ بالا صفحہ ۔ لیکن اراکین کمیشن نیز لفٹنٹ گورنر دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ کاشتکاروں کو اس میں ذرا سا بھی نفع نہیں، عام طور پر نخل بند اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ رعیت اپنی کل زمین کے

پیش ہوئیں، ان سے قطع نظر کرلی جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نیل کی کاشت جس طریقے پر کی جارہی تھی، اس کا مزارعین کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہ تھا، نیل کی کاشت کا یہ طریقہ تھا اور یہی مروج رہا۔ ۱۸۶۰ء تک نیل کی کاشت میں جو توسیع ہوئی اس میں آیندہ بیس سال تک کوئی اضافہ نہیں ہوا، گویا نیل کی صنعت اپنی صلاحیت کے بہترین معیار پر پہنچ گئی تھی، اور اس کے بعد اس میں جمود پیدا ہوگیا۔

۴۹

ہندوستان میں چائے کی کاشت نیل کی کاشت کے بہت عرصے بعد شروع ہوئی، آسام میں خود رو دیسی چائے کا پودا ۱۸۲۱ء میں پہلی مرتبہ دریافت ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی اور چند تحقیقاتوں کے بعد ۱۸۳۵ء میں ایک تجرباتی باغ قایم ہوا، پانچ سال تک کام کرنے کے بعد کمپنی نے یہ باغ آسام کمپنی کے حوالے کردیا، جو ہندوستان میں چائے کی پہلی کمپنی تھی، اس کے بعد بارہ سال تک اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، ۱۸۵۲ء میں ایک خانگی باغ قایم ہوا اور اس کے بعد باغوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ چائے کی صنعت کی بنیاد ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان رکھی گئی[1]۔ اس کے بعد باغات کی تعداد اور چائے کی پیداوار

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ۱/۱۲ حصے پر نیل کی کاشت کرے، نقصان کا مقابلہ ذیل کی مثال سے ہوسکتا ہے "یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ وہ کاشتکار جو برطانیۂ عظمیٰ میں کاشت کرتا ہے اور جس کے پاس طویل پٹے پر ۱۶۰ ایکڑ زمین ہے، جس کا لگان ۲ پونڈ فی ایکڑ ہے، اس کو دباؤ ڈال کر مجبور کیا جائے کہ وہ دس ایکڑ زمین پر سن کی کاشت کرے، جو وہ اپنے پڑوسی کارخانے دار کو ۱۴۰ پونڈ سال کے خالص خسارے پر فروخت کرنے کے لیے مجبور رہے" یادداشت لفٹنٹ گورنر صہ۱۲۔

[1] ایڈگر، "بنگال میں چائے کی صنعت پر ایک نوٹ" بنگال میں چائے کی صنعت کے متعلقہ کاغذات صٹ (۱۸۷۳ء)۔

دونوں اعتبار سے ترقی کی رفتار حیرت انگیز رہی ذیل کے اعداد صرف آسام کی تفصیلات کو واضح کرتے ہیں جو اس وقت ہندوستان میں چائے کی صنعت کا سب سے اہم علاقہ تھا۔[1]

سال	مختلف مالکوں کے باغات کی تعداد	رقبہ زیر کاشت (ایکروں میں)	چائے کی پیداوار پونڈ میں
سنہ ۱۸۵۰ء	۱	۱،۸۷۶	۲،۱۶،۰۰۰
سنہ ۱۸۵۳ء	۱۰	۲،۴۲۵	۳،۶۶،۷۰۰
سنہ ۱۸۵۹ء	۴۸	۷،۵۹۹	۱۲،۰۵،۶۸۹
سنہ ۱۸۶۹ء	۲۶۰	۲۵،۱۷۴	۴۷،۱۴،۷۶۹
سنہ ۱۸۷۱ء	۲۹۵	۳۱، ۳۰۳	۶۲،۵۱،۱۴۳

سنہ ۱۸۶۹ء کے اعداد اس بحرانی ترقی کو اچھی طرح ظاہر نہیں کرتے جو سنہ ۱۸۵۹-۶۶ء کے درمیان اس صنعت میں واقع ہوئی، صنعت کے اس رخ کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس وقت یہ صنعت کس طرح چلائی جاتی تھی، آسام میں بیشتر قطعات اراضی چائے کی کاشت کے لیے پانچویں عشرے میں، آسام کے جنگلات صاف کرنے والے قانون بابت سنہ ۱۸۵۴ء کے تحت دیے گئے، قانون میں ان علاقوں میں بسنے والے جنگلی قبیلوں کے حقوق کا کوئی تحفظ نہ تھا، البتہ ممنوں کو جو قطعات لاپروائی سے عطا کیے جاتے تھے ان کے خلاف کچھ پابندیاں ضرور تھیں، پیمائش کے واسطے ایک رقم داخل کرنے کی ضمانت دینا پڑتی تھی، اور اس بات کی ذمہ داری لینا پڑتی تھی کہ چند معینہ سالوں میں اراضی کا ایک مخصوص حصہ زیر کاشت آجائے گا، مقامی عہدہ داروں نے ابتدا میں دیسی قبائل کے حقوق کے تحفظ کا کچھ خیال کیا، اور وہ اجازت دینے سے قبل اس پر اچھی طرح غور کرتے تھے کہ آیا درخواست گزار کے پاس ۵۰

[1] آسام میں چائے کے متعلق مسٹر کیمبیل کی یادداشت، حوالہ گزشتہ صفحہ ۱۲۸۔

کاشت کرنے کے کافی ذرائع موجود ہیں یا نہیں لیکن ۱۸۵۹ء میں انھوں نے جو قدرتی طور پر ان پابندیوں کے خلاف تھے، حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، چونکہ حکومت اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے بے چین تھی، لہٰذا یہ شق اڑادی گئی کہ درخواست گزار اس کا اطمینان کرائے کہ آیا اس کے پاس کاشت کرنے کے کافی وسائل ہیں[1] اب درخواستوں پر درخواستیں گزرنے لگیں اور سٹہ بازوں کی خرمستیاں شروع ہوگئیں، ہر شخص جو چائے کی کاشت کا اندازہ لگاتا اس سے مستقبل بہت ہی خوش آیند معلوم ہوتا تھا، چونکہ زمین عطا کرنے والے ضابطوں میں ترمیم ہوچکی تھی لہٰذا انھوں کے لیے راستہ اورصاف ہوگیا، جہاں تک ان رقبوں کی پیمایش کا تعلق تھا اس کے متعلق مسٹر ایڈگر کہتے ہیں کہ "بیشتر صورتوں میں حکومت کے پیمایش کنندہ کی پرکار کی ایک جنبش خیالی قطعے کا بہترین خاکہ تیار کردیتی تھی، اور جب چند سالوں کے بعد پیشہ ور پیمایش کرنے والے موقع پر پہنچتے تھے تو ان کو معلوم ہوتا تھا کہ حقیقتاً یہ قطعہ نقشے سے بہت ہی کم مماثلت رکھتا ہے، بعض وقت عطیے کا سراسر وجود ہی نہ ہوتا تھا، کبھی یہ رقبات گھنے جنگلوں میں ہوتے، جہاں وہ جنگلی قبائل رہتے تھے جن کا تعلق حکومت سے برائے نام تھا، اگر ان علاقوں پر قبضہ کیا جائے تو یہ لوگ قبضہ کنندہ کا سر اتارنے کے لیے تیار ہوجائیں[2] لیکن عطیہ پانے والا خود قبضہ کرنے کی فکر بہت ہی کم کرتا تھا، بلکہ عموماً وہ اپنا عطیہ ان کمپنیوں کے ہاتھ فروخت کردیتا تھا جن کی چائے کی کاشت کے واسطے لندن میں مالی امداد ہوتی تھی، اور اگر وہ ان پر قبضہ بھی کرلیتا تو بھی سنجیدگی سے چائے کی کاشت پر نہیں کرتا تھا، نخل بندوں کے عام رجحان کا اندازہ اس مقولے سے ہوجاتا ہے جو ان دنوں

---

[1] و [2] ایڈگر حوالۂ گزشتہ صہ ۱۔

بہت عام تھا کہ "اس میں شبہ ہے کہ آیا چائے کی کاشت سے کوئی فایدہ ہوگا یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باغات لگانے میں فائدہ نہیں ہے۔[1] باغات نہ صرف لاپروائی سے نصب کئے جاتے تھے" بلکہ اکثر ۳۰ یا ۴۰ ایکڑ کے چھوٹے باغات کمپنی کو ڈیڑھ سو یا دو سو ایکڑ کی حیثیت سے فروخت کر دیے جاتے تھے۔[2] اس قسم کی صورتوں کی ایک بڑی اچھی مثال ضلع نوگاؤں میں پیش آئی جو مسٹر کیمپبل نے بیان کی ہے کہ وہ "یہاں لندن کی کمپنیوں کے کاروبار چلانے والے ایک آجر نے اپنے ہندوستانی منتظم کو ہدایت کی کہ وہ اس بنجر علاقے کو صاف کر کے باغ نصب کرائے تاکہ اس کمپنی کو دیا جاسکے جو حال ہی میں اس کے ہاتھ ایک چائے کے باغ کی حیثیت سے فروخت کیا گیا ہے۔[3]"

اس طرح کی بڑی حد تک تخمین اور جنگلی رقبات کو صاف کرنے اور چائے کی کاشت کرنے کے جلد بازانہ طریقوں نے مزدوروں کے مسئلے کو بہت ہی شدید بنا دیا ۱۸۶۰ء تک مقامی مزدور جن کی تعداد اگرچہ کم تھی چائے کے باغات کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوجاتے تھے، لیکن تخمین کے خبط کے دوران میں زائد مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوگئی، اور اس زاید طلب کو پورا کرنے کے لیے بنگال سے قلی بھیجے جانے لگے، اس زمانے میں قلیوں کی درآمد عام طور پر کلکتے میں مزدوروں کی گتّے داری ایجنسیوں کے سپرد تھی، محنت کی اجرت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، لہٰذا گتّے داروں کے لیے یہ کام بڑا نفع بخش تھا کہ ان کو جس قسم اور جس نوعیت کے مزدور مل جائیں وہ ان کو آسام بھیجدیا کریں، نقل و حمل کے ذرایع بڑے ناقص تھے اور

[1] [2] ایضاً حوالۂ گزشتہ صفحات علی الترتیب ۸۰ و ۸۱ -
[3] کیمپبل، حوالۂ گزشتہ ص ۱۲۵ -

ان قلیوں کی بڑی تعداد راستے ہی میں مرجاتی تھی، جب وہ باغات میں پہنچتے تو ان کی مشکلات میں اور اضافہ ہوجاتا تھا، کیونکہ ان کے مالک ان کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کرتے تھے[1] اکثر صورتوں میں یہ ہوتا تھا کہ قلیوں کو اُن کے مستقبل کے متعلق دھوکا دیا جاتا تھا اور جب وہ آسام پہنچ جاتے تو ان کی حالت دوران معاہدے میں غلاموں کی سی ہوجاتی تھی، اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتے تو ان کو پکڑ کر واپس لایا جاسکتا تھا[2] ان کو کام سے انکار کرنے پر قید بھی کیا جاسکتا تھا، اس قسم کی قانونی سخت گیریوں کے علاوہ نخل بندوں کی دوسری غیر قانونی حرکات مثلاً کوڑے مارنا وغیرہ بھی جاری تھیں[3]، ان تخمین کے سالوں میں قلیوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ رہی لیکن بعد کے سالوں میں اس میں خفیف سی اصلاح ہونے لگی۔ ۱۸۶۶ء میں باغات میں غیر معمولی تخمین کا اثر ایک فوری ردعمل کی صورت میں نمودار ہوا، چائے کی تمام جائداد کی قیمت گھٹنے لگی اور تمام حبابی کاروبار بیٹھ گئے، اس کی وجہ سے وہ نوجوان آدمی بڑی مصیبت میں پھنس گئے جو چائے کے باغوں کا انتظام کرنے یہاں آئے تھے، چائے کی تجارت میں سرد بازاری بڑی شدید تھی اور ۱۸۶۹ء تک قایم رہی، پھر حالات کچھ سنبھل گئے اور ۱۸۸۱ء میں چائے کی صنعت مستقل بنیاد پر قایم ہوگئی، اس کے بعد

۵۲

---

[1] ریڈ گروالہ گزشتہ صفحات علی الترتیب ۸ و ۹ و ۱۲۔

[2] ۱۸۶۵ء کے قانون کی رو سے نخل بندوں کو یہ اختیارات دئے گئے کہ وہ اپنی اراضیات سے مفرور شدہ قلیوں کو پکڑ کر قید کرسکتے ہیں۔

[3] بعد میں مزدور بھرتی کرنے کا عام طریقہ ٹھیکے داروں یا منتخبہ مزدور، جو باغ کا سردار کہلاتا تھا کے ذریعے سے ہوتا تھا، جس کو باغات کے لیے براہ راست مزدور لانے کے واسطے اپنے گھر بھیجا جاتا تھا، اس طریقے کی خرابیوں کا اظہار چائے اور کوئلے کی محنت کی رسد کی

بیس سال تک چائے کی صنعت برابر ترقی کرتی رہی، چائے کی کاشت ملک کے دوسرے حصوں مثلاً پنجاب (کانگڑہ) اور نیلگیری میں بھی پھیل گئی اور اب اس صنعت نے مستحکم بنیاد پر قایم ہو کر کافی ترقی کی۔

کافی سب سے پہلے ہندوستان میں مور تاجروں نے سترھویں صدی کے آغاز میں رائج کی اور جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر اس کی کاشت ہوا کرتی تھی۔[۱] اس نے اس وقت تک کوئی اہمیت حاصل نہ کی جب تک کہ یورپی نخل بندوں نے اس کی پیداوار اپنے ہاتھ میں نہ لے لی، اس کا سب سے پہلا باغ یورپی ہاتھوں سے سنہ ۱۸۴۰ء میں نصب ہوا، لیکن اس آغاز کے بعد بھی سنہ ۱۸۶۰ء تک اس میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی البتہ اس کے بعد جب بعض اسباب کی بنا پر دوسرے ملکوں میں کافی کی کاشت میں کمی ہونے لگی تو یہاں اس صنعت میں ترقی کے آثار پیدا ہو چلے، میسور گزیٹر کے مؤلف ضلع کاڈر کی اس صنعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۸۶۰ء کے بعد جائدادیں اس تیزی سے بننا شروع ہوئیں کہ یورپ کے نخل بند تقریباً شیموگا کے جنوب مغرب سے مانجرا آباد کے انتہائی جنوب تک مسلسل آباد ہونا شروع ہو گئے، اس میں کورگ اور وینا د کا تو ذکر ہی نہیں"[۲] سنہ ۱۸۶۰ء کے بعد کافی کی برآمد قریب قریب دس گنی ہو گئی اور سنہ ۱۸۷۹ء تک اضافے کی یہ رفتار قایم رہی، سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۸۷۹ء تک کا دور کافی کی مسلسل اور غیر منقطع ترقی اور خوش حالی کا زمانہ رہا ہے، لیکن سنہ ۱۸۷۵ء سے سوراخ کرنے والے کیڑوں کی بدولت باغات میں تباہی پھیلنا شروع ہوئی اور سنہ ۱۸۹۰ء میں یہ بہت شدید ہو گئی، یہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں کیا گیا ہے (سنہ ۱۸۹۶ء)

[۱] ملاحظہ ہو واٹ، معاشی پیداواروں کی لغت، مضمون بسلسلہ کافی۔

[۲] ایل، رائس، میسور گزیٹر جلد دوم، ضلع کاڈر ص ۳۷۵ (سنہ ۱۸۹۷ء)۔

شدید رکاوٹ کا پہلا حملہ تھا جس سے اس صنعت کو آئندہ عشرے میں دوچار ہونا پڑا۔

ان مخل بندیوں پر کام کرنے والے ملحقہ اضلاع کے باشندے ہوا کرتے تھے اور مزدوروں کی بڑی تعداد عارضی ہوتی تھی جو کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی تھی، جو زراعت کا موسم ختم ہونے کے بعد یہ کام کرنے لگتے تھے، یہاں بھی ایک قانون رائج تھا جس کی وجہ سے مخل بندیوں کو اپنے مزدوروں پر قابو حاصل تھا، مگر یہ اتنا تشدد آمیز نہ تھا، جو مزدور اس صنعت میں مشغول تھے وہ اپنے گھر سے بہت دور نہ تھے، اور نہ جن اضلاع میں اس کی کاشت ہوتی تھی وہ مضر صحت تھے، اس لیے اس صنعت میں چائے کے مقابلے میں مزدوروں کی حالت بہت بہتر تھی۔ ۵۴

ہندوستان میں یورپ کے سرمایے کی ترویج سے یہاں کی معاشی ترقی میں ایک نیا سبب داخل ہوا، اب تک یورپ کے باشندے اپنے ہندوستانی تجارت کے حصے پر قانع تھے، وہ ہندوستان کی تجارت خارجہ کو چلانے والے تھے اور انھوں نے ہندوستان کی ترقی میں براہ راست بہت کم حصہ لیا تھا، لیکن اب مخل بندیوں اور جوٹ کی صنعت کی ترقی کی بدولت ہندوستانی صنعتی کاروبار کو مالی امداد دینے کا ایک نیا ذریعہ ناگزیر ہو گیا، اور یہ سبب جس نے انیسویں صدی کے وسط کے بعد سے اہمیت حاصل کرنا شروع کی، اس کا ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بڑا اہم حصہ رہا ہے۔

فصل دوم

کارخانے

انیسویں صدی میں ہر مقام پر صنعت کی جس شکل نے دستکاری کی جگہ لی وہ کارخانے کی صنعت تھی، جن کا آغاز ہندوستان میں بھی اسی دور میں ہوا، یورپ کے باشندوں نے بہت عرصے سے ہندوستان کی صنعتوں میں کارخانے داری طریق کو رائج کرنے کی کوشش شروع کردی تھی، ان میں بھی بعض کو تھوڑی بہت عارضی کامیابی بھی ہوئی، مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریشم کے کرگھوں میں بھرکی دارکل مروج کی اور یہ صنعت کچھ عرصے تک کافی خوش حال رہی[1] لیکن دوسری ابتدائی کوششیں ناکام رہیں، اس طرح پانچویں عشرے تک اگر ہم نیل کے کارخانوں کو نظر انداز کردیں تو ہندوستان میں ہمیں مصنوعات کارخانجات کا بالکل فقدان نظر آئے گا، دراصل پانچویں عشرے سے ان دو صنعتوں کا آغاز ہوا جو ہندوستان کی جدید صنعتوں میں ہمیشہ سے صف اول میں رہی ہیں۔

روئی کی صنعت زیادہ اہم ہے اور ہم پہلے اسی پر غور کریں گے

[1] دوسرے عشرے میں سیرام پور میں کاغذ کی گرنیاں قایم ہوئیں جو کئی عشروں تک مسلسل ترقی کرتی رہیں۔

بمبئی اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی نے ہندوستان میں روئی کی پہلی گرنی
بنائی جو سنہ ۱۸۵۱ء میں قائم ہوئی مگر سنہ ۱۸۵۶ء سے پہلے اس نے کام شروع
نہیں کیا۔[1] ابتدا میں صنعت کی رفتار ترقی بہت سست رہی اور
سنہ ۱۸۶۱ء تک بمشکل ایک درجن کارخانے وجود میں آئے۔ پہلی گرنی
اگرچہ بمبئی سے قریب تھی مگر وہ بمبئی کے خاص جزیرے میں واقع نہ تھی'
اس صنعت نے بمبئی کے ارد گرد بھی پھیلنا شروع کیا۔ سنہ ۱۸۶۰-۷۰ء کا
عشرہ گرنیوں کی ترقی کے لیے کچھ اچھا ثابت نہ ہوا' اس کا ایک
خاص سبب امریکا کی اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے خام روئی کی قیمت
میں اضافہ تھا' روئی کی گراں قیمت نے دستی کرگھوں اور گرنیوں
دونوں کو نقصان پہنچایا' دوسرا سبب بمبئی کی تجارت کی شدید
کساد بازاری تھی' جس کے بعد ہی روئی کی تجارت میں گرم بازاری
پیدا ہو گئی' جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے روئی کی گرم بازاری نے ہندوستان
میں ایک نئے معاشی دور کا آغاز کیا' اس کے بعد کے نتائج بھی نئے
مروجہ حالات کے تحت مخصوص تھے' تجارتی بحران اور اس کے بعد
تمام ممکن اور غیر ممکن مقاصد کے لیے کمپنیوں کا لاپروائی سے قیام'
اور نتیجے میں اعتبار کا تنزل ہونا' ہندوستان میں اپنی نوعیت کے
اعتبار سے پہلی چیزیں تھیں۔[2] یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ
مغربی ہند میں یہ کساد بازاری اس وقت ہوئی جبکہ آسام کی چائے کی
صنعت میں سرد بازاری پھیل رہی تھی' سنہ ۱۸۶۵ء میں بمبئی میں اعتبار کو
اس قدر سخت دھکا پہنچا کہ سنہ ۱۸۷۱ء تک عام حالات بحال نہیں
ہوئے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۷۲-۷۳ء تک صوبہ بمبئی میں روئی کی ۱۸
اور بنگال میں صرف دو گرنیاں تھیں' لیکن بحران نے روئی کی گرنیوں

---

[1] ملاحظہ ہو واٹ کا مضمون حوالۂ گزشتہ۔

[2] ڈی' آر' واچا' بمبئی کی تاریخ میں ایک مالی باب" (سنہ ۱۹۱۰ء)۔

کو ایک فائدہ بھی پہنچایا۔ یعنی یہ کہ گرم بازاری کے زمانے میں جو متعدد تجاویز شروع کی گئیں تھیں ان کے ناقابل عمل ہونے کا احساس ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ روئی کی صنعت ہی ایک ایسی صنعت ہے جو مستقل اور منافع بخش مستقبل رکھتی ہے۔ اس لیے جیسے ہی تجارتی ساکھ بحال ہوئی گرنیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۷۶ء میں ترقی کی رفتار بہت تیز رہی، ۱۸۷۴ء میں صوبۂ بمبئی میں گرنیوں کی تعداد ۱۹ تھی، ۱۸۷۵ء میں یہ بڑھ کر ۳۶، دوسرے سال ۳۹ اور ۱۸۸۱ء میں ۴۲ تک پہنچ گئی[1]۔ اس عشرے میں اس صنعت نے بالخصوص تجارت سے، جرمن فرانسیسی جنگ کے اثرات زائل ہونے کے بعد، قابل لحاظ ترقی کی، اور اب اس نے ہندوستان کی مصنوعات کارخانہ جات میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی، ۱۸۹۰ء میں اس صنعت کا حال حسب ذیل تھا۔

گرنیاں	تکلے	کرگھے	مزدور
۵۶	۱۴,۵۲,۰۰۰	۱۳,۰۰۰	۴۳,۰۰۰

ان گرنیوں میں سے تقریباً تین چوتھائی صوبۂ بمبئی میں اور نصف کے قریب خود شہر بمبئی کے اندر واقع تھیں، تکلوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے کرگھوں کی تعداد کم معلوم ہوتی ہے، اور یہ واقعہ بھی تھا کیونکہ اکثر صرف روئی کاتنے والی گرنیاں تھیں اور سوت کی پیدائش کی یہ فوقیت طویل عرصے تک اس صنعت کی خاص خصوصیت رہی ہے،

کتائی اور بنائی سے قطع نظر، لوگوں کی خاصی تعداد روئی کی

---

[1] یہ اعداد بمبئی اور لنکا شائر کی روئی کی کتائی کی تحقیقاتی کمیٹی کے روبرو پیش ہونے والی ایک شہادت سے اخذ کئے گئے ہیں (۱۸۸۸ء)۔

ایک دوسری صنعت یعنی کپاس اوٹنے اور دابنے والے کارخانوں میں مشغول تھی، چھٹے عشرے تک اندرون ملک سے جو روئی بندرگاہوں تک بھیجی جاتی تھی اس کا بڑا حصہ غیر داب شدہ ہوتا تھا، لہٰذا اس کو دابنے والی مشینیں بعض اہم بندروں مثلاً بمبئی میں قائم ہوگئیں لیکن امریکا کی جنگ سے ہندوستانی روئی کو جو تقویت پہنچی اور ملک میں تیزی سے ذرائع نقل وحمل میں جو اضافہ ہوا، تو خود روئی پیدا کرنے والے علاقوں میں پہلے دخانی دابنے والی اور پھر دخانی روئی اوٹنے والی گرنیاں قائم ہونے لگیں، لیکن ان کی ترویج بہت تیز نہیں تھی، اور مسٹر ریوٹ کرناک بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۶۷ء تک صوبہ جات متوسط میں دابنے والی کلوں کا استعمال بہت کم تھا۔[1] البتہ ۱۸۶۷ء کے بعد اس صوبے میں ان کا رواج تیزی سے بڑھنا شروع ہوا، اب تک روئی کی بڑی مقدار غیر داب شدہ صورت میں بمبئی بھیجی جاتی تھی، لیکن جب روئی اوٹنے اور دابنے والی مشین قایم ہونا شروع ہوگئیں تو پھر ان علاقوں سے بندروں تک جانے والی غیر داب شدہ روئی کی مقدار میں کمی ہونے لگی، اس صنعت نے اگرچہ بہت سے افراد کو مشغول کرلیا اور ملک کے ان زرعی مزدوروں کو جنھیں روزگار کی سخت ضرورت تھی کام سے لگادیا، مگر اس کو بحیثیت مجموعی ہندوستان کی صنعتی ترقی میں زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی، کیونکہ پہلے تو یہ صنعت موسمی تھی، دوسرے یہ خام مال سے کوئی چیز تیار نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف اس کی برآمد میں سہولت پیدا کردیتی تھی۔

روئی کی صنعت کے بعد اہمیت کے لحاظ سے دوسرے درجہ پر جوٹ کی صنعت ہے جوٹ کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہد سے اہمیت رکھتی ہے، جن کاموں کے لیے یہ خاص طور پر استعمال

[1] رپورٹ ۶۹-۱۸۶۸ء ص ۹۱۔

کی جاتی تھی وہ رسے اور رسیوں کی تیاری تھی، سنہ ۱۸۳۰ء تک تھیلے اور ٹاٹ سازی بنگال کے دستی کرگھا چلانے والے کا واحد اجارہ تھی[1]، اس کے بعد ڈنڈی میں یہ صنعت ایک بڑے کارخانے کی صورت میں قائم ہوئی، اور اب یہ محسوس ہونے لگا کہ دستی کرگھوں سے تھیلے بنانے کے بجائے خام جوٹ باہر بھیجنا زیادہ نفع بخش ہے، چنانچہ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد بنگال کے دستی کرگھوں سے تیار ہونے والی جوٹ کی مصنوعات میں تیزی سے تخفیف ہونے لگی، رسوں، رسیوں اور تھیلوں کے واسطے جوٹ کی اہمیت بڑھ رہی تھی، لہذا جوٹ کے رقبۂ کاشت میں بھی تیزی سے اضافہ ہونے لگا، اور ہر سال زیادہ سے زیادہ رقبہ زیر کاشت آتا رہا، جنگ کریمیا کی وجہ سے روسی سن کی رسد مسدود ہوگئی جو جوٹ کا طاقتور حریف تھا تو جوٹ کی اہمیت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا[2]، ہندوستان میں مشین کے ذریعے سے تیار ہونے والی جوٹ کی مصنوعات کا آغاز سنہ ۱۸۵۵ء سے قبل شروع نہیں ہوا، اس سال سیرام پور میں ٹراک لینڈ نے جوٹ کی ایک گرنی قایم کی سنہ ۱۸۵۴ء سے سنہ ۱۸۶۳-۶۴ء تک صرف ایک اور کارخانے کا اضافہ ہوا، مگر سنہ ۱۸۶۳-۶۴ء کے بعد اس صنعت میں اچھی رفتار سے اضافہ ہونے لگا، بنگال کی صنعت کو یہ بڑا فائدہ تھا کہ ہندوستان کو جوٹ کا اجارہ حاصل تھا، مگر اب ڈنڈی، جو کامیابی کے ساتھ دستی کرگھوں کی صنعت کو ختم کر چکی تھی سارے بازار پر قابض ہو گئی، لیکن بنگال کی صنعت نے جلد ہی اپنی حیثیت سنبھال لی، اس کے متعلق مسٹر او کنور سنہ ۱۸۶۷ء میں لکھتے ہیں کہ "ڈنڈی کو صرف ہندوستان کے دستی بنے ہوئے سامان سے مقابلہ کرنا تھا ورنہ اس کو ساری دنیا کے بازار کا اجارہ حاصل تھا،

[1] واٹ کا مضمون جوٹ پر، حوالۂ گزشتہ۔

[2] ایچ، سی، کیر، بنگال میں جوٹ کی کاشت اور تجارت کی رپورٹ (سنہ ۱۸۷۴ء)۔

لیکن یہاں بھی جب صنعتی ترقی ہوئی اور گرنیوں میں بھاپ سے چلنے والے بہترین قسم کے میکانی آلات استعمال ہونے لگے تو اس نے بڑی حد تک ایشیا اور آسٹریلیا کے بازاروں سے ڈنڈی کی مصنوعات کو خارج کردیا اور امریکا کے کچھ بازاروں پر بھی قبضہ کرلیا[1] سنہ ۱۸۸۲ئہ میں ہندوستان میں جوٹ کے ۲۰ کارخانے تھے جن میں بیس ہزار کے قریب مزدور کام کر رہے تھے، ان میں سے ۱۸ کارخانے بنگال میں اور ان میں سے بھی ۱۷ کلکتے کے گرد و نواح میں واقع تھے، جس طرح روئی کی صنعت کی تیصر بمبئی کے گرد و پیش ہوئی اس سے زیادہ جوٹ کی صنعت کلکتے کے چاروں طرف محصور ہوگئی، جوٹ کا پہلا کارخانہ ایک یورپ کے باشندے نے قایم کیا اور یہ صنعت تمام تر یورپی باشندوں کے ہاتھ میں رہی، خام جوٹ کی برآمد میں ترقی کے ساتھ ہی بنگال میں جوٹ دابنے والی صنعت نے بھی وسعت اختیار کرنا شروع کردی،

ان مصنوعات کارخانجات کے علاوہ جدید طریقوں کا رواج کوئلے کی کانوں میں شروع ہوگیا، اب تک کوئلے کی حیثیت ایک معدنی پیداوار کی تھی جو ہندوستان میں بڑی مقدار میں پیدا ہوتی تھی، اس صنعت کا آغاز سنہ ۱۸۲۰ئہ سے ہوا جب بنگال کے ضلع رانی گنج میں ایک کان کھودی گئی، اس کے بعد ۲۰ سال تک کسی نئی کان پر کام کا آغاز نہیں ہوا، اور اس کے بعد سنہ ۱۸۵۵ئہ میں تین نئی کانیں دریافت ہوئیں، اس سال ایسٹ انڈیا ریل کی تعمیر دمودا کے کوئلے والے نشیبی علاقوں سے ہوئی، اس سے صنعت کو بہت تقویت پہنچی اور بڑی تعداد میں نئی کانیں دریافت ہوئیں[2]، ترقی برابر ہوتی رہی اور اس خطے یعنی رانی گنج اور اس کے نواحی اضلاع میں سنہ ۱۸۶۹ئہ کے

[1] جے، ای، او کنور، برطانوی ہند کی تجارت اور جہاز رانی کے متعلق یادداشت سنہ ۱۸۷۶-۱۸۷۷ئہ صفحہ ۱۰۔

[2] او کنور، سنہ ۱۸۸۸ئہ کی ہندوستانی تجارت پر تبصرہ صفحہ ۲۲۔

درمیان ۵۶ کانوں پر کوئلے کی کھدائی جاری رہی، یہ ایک قدرتی امر تھا کہ ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر کے ساتھ ہی ساتھ کوئلے کی کانوں کو ترقی ہو، اور یہ صرف اس وجہ سے نہ تھا کہ اس سے قبل صنعتی کاموں کے لیے کوئلے کی مانگ کسی بڑے پیمانے پر نہ تھی بلکہ ریلوں کے بغیر کوئلے کو ان حصوں سے منتقل کرنا بھی ارزاں طریقے پر ممکن نہ تھا، پھر خود ریلوں کو ایندھن کی بڑی مقدار کی ضرورت تھی، جب وہ جنگل جو ریلوں کی ابتدائی لائنوں کے قریب تھے، تیزی سے ختم ہو گئے تو لکڑی گراں سے گراں تر ہونے لگی، اور کوئلے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی، اور اسی طلب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سلطنت متحدہ سے درآمد ہونے والے کوئلے کی مقدار بڑھ گئی۔

سنہ ۱۸۶۰ء تک صرف رانی گنج کی کانوں سے کوئلہ نکالا جاتا تھا ایسٹ انڈیا ریلوے کے لیے یہی کانیں کوئلہ مہیا کرتی تھیں، اور کبھی کبھی ان کا کوئلہ پنجاب تک بھی پہنچ جاتا تھا، لیکن مغربی اور جنوبی ہند کی ریلیں کوئلے کی اس رسد سے قطعی محروم تھیں، سنہ ۱۸۶۲ء میں صوبہ جات متوسط میں موہ پانی کے ذخائر کھولے گئے، لیکن ان سے جو مقدار حاصل ہوئی وہ غیر اہم تھی اور انھوں نے کبھی بھی اہمیت حاصل نہ کی، اسی سال بنگال کے ضلع کرہر بہ تی میں کوئلے کی کانیں دریافت ہوئیں جو تھوڑے ہی عرصے میں کافی اہم ہو گئیں سنہ ۱۸۷۶-۷۷ء میں صوبجات متوسط میں ورورا میں کوئلے کی کانیں دریافت ہوئیں، ان سے گریٹ انڈین پننسولا ریلوے کو کوئلے کی تھوڑی بہت امداد ملنے لگی لیکن پھر بھی بنگال کی کانوں کی حیثیت اہم رہی، مگر ان سے مغربی ہندوستان کی ریلوں اور صنعتوں کی طلب اکمل طریقے پر پوری نہ ہو سکی تھی۔ نہر سویز کے اجرا نے عارضی طور پر ہندوستانی کوئلے کی صنعت کو سرد کر دیا۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں جب نہر سویز کا افتتاح ہوا تو ہندوستان میں

کوئلے کی درآمد میں تو بہت اضافہ نہیں ہوا مگر ہندوستانی کوئلے کی
پیداوار اس سے عارضی طور پر متاثر ضرور ہوئی، کوئلے کی پیداوار
سنہ ۱۸۶۹ء میں تقریباً ۴ لاکھ ۶۷ ہزار ٹن تھی، اس میں آئندہ تین
سالوں میں خاصی تخفیف ہو گئی، اور سنہ ۱۸۷۵ء تک پیداوار
اس معیار تک نہ پہنچ سکی، اس کے بعد سے اس میں پھر ترقی
ہونے لگی[1] اگرچہ ہندوستانی کوئلے کی مقدار پیداوار بڑھ رہی تھی
مگر اس کے ساتھ ہی بدیسی کوئلے کی درآمد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا،
اس کی وجہ ہندوستان میں ریلوں کی سرعت سے تعمیر تھی۔ دوسرے
یہ امر بھی قابل لحاظ تھا کہ اکثر ریلیں ہندوستانی کوئلے کی کانوں سے
دور واقع ہوئی تھیں، ہندوستان میں درآمد ہونے والے کوئلے کی
مقدار کا ۷۰ فی صدی حصہ صرف صوبۂ بمبئی لے لیا کرتا تھا۔ اس طرح
ہندوستان میں کوئلے کی پیداوار میں اضافہ ہونے کے باوجود
سنہ ۱۸۸۰ء تک یہاں سالانہ چھ لاکھ ٹن کوئلہ درآمد ہوتا رہا، جبکہ
ہندوستان سے قطعی طور پر کوئلہ باہر نہیں گیا، اس صنعت میں
جو مختلف طریقے رائج تھے ان میں بڑا اختلاف تھا بڑے بڑے
کاروباروں میں مشینوں کا استعمال اگرچہ حال ہی میں شروع ہوا،
مگر چھوٹی کانیں ان سے قطعی محروم تھیں، حالانکہ ان کی تعداد
اول الذکر کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی، سنہ ۱۸۸۰ء میں کوئلے
کی صنعت میں تقریباً تیس ہزار آدمی مصروف تھے۔

گویا سنہ ۱۸۸۰ء میں تین صنعتیں یعنی روئی اور جوٹ کے کارخانے
اور کوئلے کی کانیں ہی صرف ہندوستان کی اہم صنعتیں تھیں، مگر اس
لحاظ سے کہ ان میں کتنے افراد مصروف تھے یہ کچھ زیادہ بڑی نہ
تھیں، اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ سنہ ۱۸۸۰ء تک ترقی کرنے والی صنعتیں

---

[1] وی، بال "ہندوستان کی ارضی معاشیات" (۱۸۸۱ء)۔

بھی تھیں مگر ان کے علاوہ دوسری متعدد صنعتوں میں بھی کارخانہ داری طریق کو رائج کرنے کی مسلسل کوششیں کی گئیں، جن میں مختلف لحاظ سے کامیابی بھی ہوئی، مثلاً ۱۸۶۹ء میں چرمی مصنوعات کو جدید طریقوں پر تیار کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ جب حکومت نے فوجی اغراض کے لیے چمڑے کا ایک کارخانہ قایم کیا، اس سلسلے میں جو متعدد دوسری کوششیں کی گئیں ان میں قابل ذکر شمالی مغربی صوبوں میں شیشے کے کارخانے کا قیام تھا، یا اس سے قبل مدراس میں لوہے کی صنعت قایم کرنے کی کوشش کی گئی، ان کوششوں کی تفصیل بیکار ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر بارآور نہ ہوئیں۔

البتہ اس زمانے میں ہندوستان میں ایک دلچسپ صنعت موجود تھی جو جدید صنعتوں کی صف میں داخل ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے، یہ مدراس کی دباغت کی صنعت تھی، اس کے قیام کا سہرا ایک شخص مسمی چارلس ڈی سوسا کے سر ہے جس نے ۱۸۴۵ء میں ہندوستانی صنعت دباغت میں چند اصلاحیں کیں[1]، ابتدا شہر مدراس سے ہوئی اور آہستہ آہستہ جدید طریقے صوبۂ مدراس کے دوسرے اہم قصبوں تک پہنچ گئے، مگر یہ اصلاحات اس صوبے سے باہر نہیں پہنچیں، دباغوں کی بڑی تعداد نے ان کو اختیار کرلیا اور اس طرح ہندوستان کے دباغت شدہ چمڑے اور کھالوں کی تجارت برآمد بڑھ گئی، ابتدا میں تجارت صرف سلطنت متحدہ کے ساتھ ہوتی تھی لیکن فرانسیسی جرمن لڑائی کے بعد جرمنی بھی اس تجارت میں شریک ہوگیا، چنانچہ اس نے نیز ۱۸۷۵ء میں محصول برآمد میں ۳ فی صدی تخفیف، اور ریلوں کی توسیع جس نے ملک کے چمڑے اور کھالوں کو مدراس کے دباغوں تک پہنچانا

[1] اے، چیٹرٹن، رسالہ "صوبۂ مدراس کی دباغت اور چرم سازی" (۱۹۰۴ء)۔

آسان کر دیا تھا، اس صنعت کو کافی فروغ دیا۔ ۱۸۸۰ئہ تک مدراس پختہ اور نیم پختہ چمڑوں کی بڑی تعداد بیرونی ملکوں کو برآمد کرنے لگا، مدراس کی دباغت کی صنعت ہندوستانی صنعتی ترقی کے ایک درمیانی درجے کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ اس صنعت میں جدید طریقے بھی تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ اختیار کر لیے گئے تھے اور ساتھ ہی ارزاں خام مال اور ارزاں محنت بھی فراہم تھی، تجارت کے اس شعبے سے آزاد صناع غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ چھوٹے سرمایہ داروں نے لے لی تھی، جو عموماً اس کی تجارت برآمد کیا کرتے تھے، صنعت کی اکائی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، یہ دراصل ایک چھوٹا سا "کام گھر" بن گیا تھا جہاں اوسطاً پانچ سے سات آدمی کام کیا کرتے تھے، صنعت کلیتہً برآمدی اغراض کے لیے تھی کیونکہ دیہات کے لیے یا تو چرم ساز اپنی ضرورت کے واسطے خود ہی چمڑا پکا لیتے یا دوسروں سے پکوا لیتے تھے، نیز دیہی سامان کی چرمی طلب اتنی زیادہ بھی نہ تھی جو اس قسم کی صنعت کی کفالت کر سکتی، لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اس صنعت میں جو اصلاحیں کی گئیں وہ بہت خفیف تھیں، اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ چمڑے کو ہندوستانی دیہات کے پکے ہوئے چمڑے سے بہتر پکا کر برآمد کے قابل بنایا جا سکے، صنعت نے محض اس وجہ سے ترقی کی کہ اس کو دو فوائد حاصل تھے پہلا ارزاں خام مال اور دوسرا سستی اجرت کا، اگر یہ صنعت ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کھو بیٹھتی تو اس کی رفتار ترقی رک جاتی، یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں کتنے آدمی مصروف تھے مگر ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔

ہندوستان کی چند جدید صنعتوں کی مندرجۂ بالا سرگزشت سے یہ بات قطعی طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ۱۸۸۰ئہ تک ان کی وسعت بہت ہی مختصر تھی اور جبکہ لوگوں کو ان کے قدیم پیشوں سے

نکالنے کا طریقہ تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس کے ساتھ جدید صنعتوں میں ان بے کار لوگوں کو مشغول رکھنے کی رفتار کسی طرح متناسب نہیں کہی جا سکتی۔

مزارعین سنہ ۱۸۸۰ء لغایت ۱۸۹۵ء

ہندوستان میں زراعت کی اکائی گاؤں ہی ہے، اس لیے دیہات
کا عام دستور ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، ہندوستان ہمیشہ سے
چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی پر کاشت کرنے والا ملک ہے خواہ کاشت
کرنے والے خود مالک ہوں یا ان کے اسامی کاشتکاروں کو جو حقوق
ان کی زمین پر حاصل ہیں وہ حقیت کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف
ہوتے تھے ہندوستان میں حقیت اراضی کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے، لیکن
اس کی دو نمایاں قسمیں ہیں، ان کو رعیت واری اور زمینداری طریق
کہا جاتا ہے، ہندوستان کے بیشتر دیہات ان ہی دو قسموں میں سے
کسی ایک کے تحت آتے ہیں، رعیت داری علاقوں میں پورے
گاؤں کا کوئی ایک شخص مالک نہیں ہوتا تھا بلکہ گاؤں مختلف خود کاشت
زمینداروں کی ایک جماعت پر مشتمل ہوتا تھا، اس کے برخلاف
زمینداری دیہات میں مالک صرف ایک زمیندار یا اس کے
حصہ دار ہوا کرتے تھے، جہاں ایک زمیندار سارے گاؤں کا مالک
ہوتا تھا وہاں تمام کاشتکار اس کے اسامی ہوا کرتے تھے حصہ دار

زمینداری گاؤں میں صورت حال مختلف تھی، بعض جگہ کاشت مشترک اور مختلف حصہ داروں کے مختلف زمینوں پر مخصوص حصے نہیں ہوتے تھے، لیکن بعض دیہات میں اس قسم کی مخصوص تقسیم بھی موجود ہوتی تھی، پھر بعض دیہات میں زمیندار اپنے افراد خاندان کی مدد سے پورے گاؤں کی کاشت خود ہی کر لیتے تھے، لیکن بعض اوقات وہ چند اسامیوں کو بھی گاؤں میں کاشت کرنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے۔ ان مختلف طریقوں میں رعیت واری طریق جنوب میں زیادہ نمایاں تھا اور واحد زمینداری طریق بنگال کے لیے مخصوص تھا، حصہ داروں کے دیہات شمال مغربی صوبوں اور پنجاب میں زیادہ پائے جاتے تھے۔[1]

لیکن حقیقت اراضی کے ان مختلف طریقوں سے گاؤں کے اندرونی نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جہاں تک زمینداری دیہات کا تعلق تھا وہاں دیہی اہل حرفہ کو زمیندار کی چند مخصوص خدمات بھی انجام دینا پڑتی تھیں، ورنہ ویسے ان کی اور رعیت واری علاقوں میں ان کی برادری کی حیثیت میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، مشترک رشتہ جو رعیت واری گاؤں کو ایک مرکز پر تھامے ہوئے تھا وہ مکھیا کا اثر، اور ان مشترک اہل حرفہ کی موجودگی تھی جن کی گاؤں کفالت کرتا تھا، جبکہ زمینداری گاؤں میں یہ رشتہ واحد یا جماعتی ملکیت ہوا کرتی تھی، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ گاؤں کے زیر کاشت رقبے میں کوئی جائداد پنچایتی نہیں ہوتی تھی، ہر کاشتکار کے پاس اس کی اپنی زمین ہوتی تھی، جس پر وہ من مانے طور پر کاشت کرنے میں آزاد تھا۔[2]

۶۲

---

[1] بی ایچ بیڈن پاول، برطانوی ہند کے نظم و نسق اور مالگزاری کا مختصر حال (۱۹۱۳ء)۔

[2] بیڈن پاول کو اس امر میں بھی شبہ ہے کہ آیا غیر منقسم مشترک دیہات میں، کسی قسم کی بھی مشترک کاشت پنچایت کی نگرانی میں ہوتی تھی، ان کی رائے ہے کہ وہاں بھی اراضی کے قطعی ٹکڑے تھے اور مختلف حصہ دار الگ ہی الگ کاشت کیا کرتے تھے بیڈن پاول، "ہندوستان کی دیہی جماعتیں"، ص ۲۰ (۱۸۹۶ء)۔

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں کاشت کی نوعیت دیہات کے خود کفالتی نظام کے تحت تھی، پیداوار کا بڑا حصہ اشیائے خوردنی پر مشتمل ہوتا تھا، جو دیہات ہی میں صرف ہوتا تھا، ایسی فصلوں مثلاً روغن تخم، روئی وغیرہ کی کاشت صرف مقامی ضرورت کے لیے ہوتی تھی، دو قسم کی اہم زرعی پیداواریں تھیں جن کی اپنی نوعیت کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں کاشت نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے یہ گاؤں سے باہر بھیجنے کے لیے بھی پیدا کی جایا کرتی تھیں، یہ روئی اور نیشکر تھیں، لیکن ان دونوں چیزوں کی تجارت محدود تھی، اس لیے ان کے رقبۂ کاشت بھی محدود تھے، اس طرح روئی کی کاشت سارے ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر دیہات کے آس پاس ہوا کرتی تھی، ناگپور اور برار سے (مرزا پور کے راستے سے) بنگال تک اس کی رسد ہی تجارت کا ایک مستقل ذریعہ تھی، خود بنگال میں بھی اعلیٰ قسم کی روئی کی کاشت ہوتی تھی کیونکہ یہ مشہور ہے کہ ڈھاکے کی ململ کا سوت اسی روئی سے تیار کیا جاتا تھا جو خود ڈھاکے کے اطراف میں پیدا ہوتی تھی۔ نیشکر ایک دوسری فصل تھی، جس کے لیے کاشت عمیق اور پانی کی مسلسل اور وافر مقدار کی ضرورت ہے، جو ہر جگہ ممکن نہ تھی، اس لیے نیشکر کی کاشت بھی زیادہ تر مقامی ہو کر رہ گئی ہندوستانی زرعی پیداواروں کی تجارت میں روئی کے بعد اہم حیثیت گڑ کو حاصل تھی، لیکن اس قسم کی کاشت کی وسعت بھی محدود تھی، رائل کا قول پہلے نقل کیا جاچکا ہے[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روئی کی کاشت کے موزوں ترین علاقوں میں بھی تقریباً ایک چوتھائی حصے پر روئی کی کاشت ہوا کرتی تھی، لیکن اس میں شبہہ ہے کہ یہ تخمینہ کس حد تک صحیح ہے،

۶۳

[1] ملاحظہ ہو حوالۂ مندرجۂ بالا، باب دوم، ص۱۵.

۱۸۶۷ء میں ایوٹ کرناک کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں روئی کی کاشت کے بہترین علاقے یعنی برار میں کل مزروعہ رقبے کا ۲۲ فی صدی حصہ کپاس کی کاشت میں تھا، یہ حالت اس وقت تھی جبکہ کپاس کی کاشت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا، کسی مخصوص فصل کے تحت ایک چوتھائی حصہ کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتا، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ پیداوار کا بڑا حصہ گاؤں سے باہر نہ جاتا ہو مگر اس قسم کی کاشت میں رکاوٹ دیہات کے خود کفالتی دستور کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ چھٹے عشرے میں ذرائع نقل وحمل کی ترقی اور بازار کی پیدائش نے کس طرح ہندوستان کی روئی کی کاشت پر حیرت انگیز اثرات مترتب کئے، لیکن ان اثرات سے خاص طور پر امداد زیرِ تبصرہ دور میں ملی، لنکاشائر میں روئی کا قحط ایک عارضی چیز تھی، نہر سویز جو ہندوستان کی تجارت برآمد کو بڑھانے کا ایک سبب تھی اس کا اجرا ۱۸۶۹ء میں ہوا، اس کے بعد ہی فرانسیسی جرمن لڑائی اور پھر قحطوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ۱۸۷۰-۸۰ء والا عشرہ نئے حالات کے اثرات کو واضح کرنے کے لیے ایک متوسط دور نہیں ہے، لیکن اس عشرے میں بھی گیہوں کی برآمد میں اضافے کا ایک عام رجحان موجود تھا، قحطوں نے عارضی طور پر اس کی تجارت کے فروغ کو روک دیا اور ۱۸۸۰-۹۰ء کے درمیان ہندوستانی خام پیداواروں کی برآمد میں اضافہ ہونا شروع ہوا، اس کی محض یہ وجہ تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان شدید قسم کے قحطوں سے محفوظ رہا۔ خشک سالیاں اور بارش کی قلت مقامی طور پر رہی لیکن بڑے پیمانے پر کوئی ایسا قحط نہیں پڑا جیسا کہ ۱۸۷۶-۷۷ء میں پڑا تھا یا جیسے کہ دو قحط ۱۸۹۵ء کے بعد نمودار ہوئے۔

لیکن شدید قحطوں سے محفوظ رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا

کہ یہ زمانہ لازمی طور پر خوش حالی کا دور رہے، البتہ اس سے یہ مراد ضرور ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ شدید تکالیف سے محفوظ رہا مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پندرہ سال زراعت کے لیے نسبتہً خوش حالی کے تھے، چند خاص علاقوں میں خوش حالی کو ہنگامی مقامی خشک سالیوں سے نقصان پہنچا، مثلاً ۱۸۸۴-۸۵ء میں بنگال میں خشک سالی رہی، یا ۱۸۸۶ء میں چھتیس گڑھ میں چاول کی ساری فصل تباہ ہو گئی یا پھر ۱۸۸۹ء میں اڑیسہ میں خشک سالی ہوئی ۱۸۹۰-۹۵ء کے درمیان میں صوبۂ مدراس اور صوبہ جات متوسط کے اکثر حصوں میں بارش بے ہنگام رہی، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں کاشتکار عام طور پر خوش حال رہے۔

کاشتکار کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد خود کاشت زمیندار یا مالکان زمین ہیں کیونکہ یہی لوگ اچھی فصلوں کے تسلسل سے نفع حاصل کرتے، اور اپنی پیداوار کی قیمتوں سے نفع اندوز ہوتے تھے، لیکن وہ کاشتکار جو قرضے میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے یا جن کے پاس اتنی زمین نہ تھی جو ان کی گذر بسر کے لیے کافی ہو سکے، ان کے لیے یہ اسباب کسی قسم کے فرق کا باعث نہ ہو سکے، روزانہ محنت کرنے والے بلا اراضی طبقے کے لیے اس دور سے یہ مراد تھی کہ اس کو مسلسل روزگار ملنے کا یقین تھا لیکن وہ خود کاشت زمیندار جو قرضے میں بری طرح جکڑے ہوئے نہ تھے ان کے لیے قحطوں سے امن کا مطلب تھوڑا بہت سکون تھا، اور اپنی حالت سدھارنے کے قدرے مواقع حاصل ہو جاتے تھے۔

۶۴

ہندوستانی زرعی پیداواروں کی بڑھتی ہوئی مانگ بھی ایک اہم سبب تھی کیونکہ اس کی بدولت بیشتر صورتوں میں صنعتی فصلوں

کی قیمتیں بڑھ گئیں، نہ صرف تجارت برآمد بڑھی بلکہ زرعی پیداوار وں
کی اندرونی تجارت میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس کی وجہ
سے بہتر طریقے پر خاص خاص فصلوں کی تخصیص کرنا ممکن ہو گیا تھا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض جگہ نئی فصلوں میں اضافہ ہونے لگا جیسا کہ
برار میں روئی کی کاشت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو رہا تھا
حتیٰ کہ اس کو اپنی اشیائے خوردنی کا معتد بہ حصہ باہر سے درآمد
کرنے پر مجبور ہونا پڑا، یا نیشکر اس وقت بہت ہی مقبول فصل تھی
حالانکہ عملی طور پر شکر کی تجارت برآمد قطعی طور پر موجود نہ تھی۔[1]
زرعی خوش حالی کے بہترین معیارات غالباً رقبہ کاشت،

[1] تمام برآمدی اشیا کی قیمتوں میں عام اضافہ نہیں ہوا، بعض چیزوں مثلاً روئی اور گیہوں کی قیمتیں گر گئیں، اس کے برخلاف جوٹ، چاول اور السی کی قیمتوں میں خاصا اضافہ ہوا اول الذکر چیزوں کے بین الاقوامی بازار میں ہندوستان کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا اس لیے ان کی قیمتیں گر گئیں، لیکن آخر الذکر اشیا میں سے ہر ایک میں ہندوستان، رسد کنندہ کی حیثیت سے عالمی بازار میں خاص حیثیت رکھتا تھا لہٰذا ان کی قیمتوں میں قطعی طور پر اضافہ ہوا۔

قیمتوں کے اعداد — تھوک برآمد

سنہ ۱۸۷۳ء کی قیمتیں ۱۰۰ کے مساوی ہیں

سال	روئی (بروچ)	چاول (بلام)	چاول (نگستین)	گیہوں (دہلی)	جوٹ (صاف شدہ)	السی (کلاں)
۱۸۶۳ء	۷۸	۱۰۹	۱۲۹	۸۷	۹۶	۸۵
۱۸۸۹ء	۹۳	۱۴۴	۱۴۲	۹۵	۱۹۲	۱۰۴
۱۸۹۵ء	۷۰	۱۴۷	۱۲۲	۸۲	۱۷۵	۱۳۱

کاشت ہونے والی فصلوں کی نوعیت، اور ملک کے مویشیوں کی تعداد ہے، لیکن ہندوستان کی حالت اس سے جداگانہ ہے کیونکہ ان معیاروں سے خواہ وہ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں ملک کی خوش حالی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے، زرعی اعداد بالکل ناقص ہیں، سب سے پہلے ان کو ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے واسطے باقاعدہ مدوّن کیا گیا، پھر یہ آیندہ بھی فراہم کئے جانے لگے، لیکن مسٹر ہینیز کا نوٹ اس امر کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے کہ یہ بہت ناقص تھے[1]۔ بنگال جیسے اہم صوبے کے قابل اعتماد اعداد ۱۸۹۷-۹۸ء سے پہلے بھی شائع نہیں ہوئے۔

البتہ اس قسم کی عام علامات موجود ہیں کہ مزروعہ رقبے میں اضافہ ہو رہا تھا، اس کے دو سبب تھے، پہلا ذرایع آب پاشی میں توسیع اور دوسرا نئے رقبوں کا زیر کاشت آنا اس زمانے میں ہندوستان میں کسی بے جتی زمین کے رقبات موجود نہ تھے، جن نئے رقبوں پر اب کاشت شروع ہوئی ان میں اکثر یا تو ویران تھے یا چراگاہ یا جنگلوں سے صاف کئے ہوئے علاقے تھے، یہ عموماً قدیم مزروعہ رقبے کے مقابلے میں کم درجے کے تھے، اور اس رجحان کو در اصل ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ایسے شواہد موجود نہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ کیا ہندوستان میں مزروعہ رقبے کی فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس کے علاوہ اس قسم کی علامتیں بھی موجود نہیں جن سے یہ پتا چلے کہ کاشت ہونے والی فصلوں کی نوعیت میں کوئی بنیادی تبدیلی ہو رہی تھی، کل پیداوار میں اشیائے خوردنی کا تناسب بدستور اہم تھا، معمولی فصلوں سے بدلنے کا رجحان صرف پنجاب

[1] زراعت کے متعلق ہے، اسے ہینیز کا بیان۔

میں نظر آتا ہے جہاں گیہوں کی کاشت میں اضافہ ہو رہا تھا اور نہ اشیائے خوردنی میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی، لیکن رقبۂ کاشت میں اضافے کے ساتھ اسی تناسب سے صنعتی فصلوں کا رقبہ بھی بڑھ رہا تھا جن خاص فصلوں میں اضافہ بہت زیادہ تھا وہ جوٹ، نیشکر، روغنی تخم اور روئی تھیں، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ صنعتی فصلوں کی کاشت میں اضافہ ذرایع آب پاشی کی تعمیر کے ساتھ ہوا، جیسے ہی کسی علاقے میں ذرایع آب پاشی مہیا ہوتے گئے تو زائد نفع بخش فصلوں اور کاشت عمیق کا رواج ہونے لگا، مختلف صنعتی فصلوں میں اضافہ بہت ہی معتدل تھا، اور اس کی اہمیت ہندوستانی زراعت پر ذرایع نقل و حمل کی ترقی کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے

۶۶ ہندوستان میں عرصۂ دراز سے ان تمام چیزوں کی کاشت پر گاؤں کے آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مقامی استعمال ہونے والی اشیائے خوردنی کی فصلوں کے ساتھ ساتھ ہوا کرتی تھی، اب ہندوستان میں جو تبدیلی ہو رہی تھی وہ محض یہ نہیں تھی کہ صنعتی فصلوں کے رقبے میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ہندوستان کو اپنے لیے غذا بھی پیدا کرنا تھی، اور آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ رقبۂ کاشت میں اضافہ ہونا بھی لازمی تھا بلکہ اب دراصل رجحان زیادہ تر فصلوں کی تخصیص کی طرف مائل ہو رہا تھا[۱] مثلاً برار نے اپنے لیے روئی کی کاشت کو منتخب کر لیا۔ یا دکن میں میرآ اور متھرا کے علاقوں میں آب پاشی کے ذرایع کی وجہ سے نیشکر اور باغات کی فصل زیادہ ہونے لگی، لیکن اس قسم کی تحریک ذرایع نقل و حمل کی سہولتوں کے باعث ہی ممکن تھی، جس نے صنعتی فصلوں کے لیے ایک وسیع بازار پیدا کر دیا اور ساتھ ہی ملحقہ اضلاع سے اشیائے خوردنی کی درآمد کو ممکن بنا دیا۔

[۱] صوبہ جات متوسط و برار میں ہم کو اس رجحان کے دو اثرات نظر آتے ہیں، یعنی برار میں

ہندوستان میں زرعی خوش حالی کے ایک طویل دور کا مطلب یہ بھی ہے کہ زرعی اصلاحات کی ترغیب ہو اور عام طور پر کنویں کھودنے یا عمدہ مویشی خریدنے کی صورت میں ہوتی تھی، چنانچہ قدرتی طور پر یہ اور اچھی قسم کی فصلوں کے رواج اور بہتر طریق کاشت کو اختیار کرنے کے لیے مناسب تھا، ہندوستان میں زرعی طریق نہ صرف اضلاع بلکہ گاؤں گاؤں میں مختلف تھا بلکہ خود ایک گاؤں میں بھی ایک ذات کے کاشتکاروں کا طریق دوسری ذات سے مختلف تھا، زراعت کے بہترین علاقوں یعنی کو ئمبتور یا ہیم اور شمالی گجرات میں بقول ڈاکٹر وولکر زرعی معیار بہت بلند تھا، لیکن ان حصوں میں جہاں عملی صورت سے معیار بلند نہیں وہاں کاشتکار کی صحیح طریقوں سے ناواقفیت کو ہمیشہ موردِ الزام نہیں ٹھیرایا جا سکتا، بیشتر علاقوں میں زمین کو پڑت چھوڑنے، فصلوں کی تراش کرنے اور کھاد دینے کے فوائد کو اچھی طرح محسوس کیا جاتا تھا اور غالباً سوائے تخم کے انتخاب کے کاشت کو بہتر بنانے کے لیے اور کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی جاتی، لیکن ان سب چیزوں کے عمل کا انحصار کاشتکار کے حالات پر ہوتا تھا، لکڑی کی کمی لوگوں کو مجبور کرتی ۶۷

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ روئی کا رقبہ، کل رقبۂ کاشت کے مقابلے میں سنہ ۱۸۶۷ء میں ۲۷ فی صدی سے بڑھ کر سنہ ۱۹۱۳ء میں ۵۴ فی صدی ہو گیا۔ اس کے برخلاف ذرائع نقل و حمل کی توسیع سے پہلے، صوبہ جات متوسط میں نیشکر کے تحت چالیس ہزار ایکر رقبہ تھا، جو اب بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے غیر قحط شدہ سالوں میں گر کر اکیس ہزار ایکر رہ گیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آخر الذکر واقعے کا ایک سبب نیشکر کی کاشت کا موزوں ترین علاقوں مثلاً صوبہ جات متحدہ و بنگال میں محصور ہو جانا بھی تھا، ملاحظہ ہو، سی، ای، لو، صوبہ جات متوسط و برار کی زرعی معاشیات کے متعلق چند اشارے (سنہ ۱۹۱۳ء)۔

کہ وہ اپنی قیمتی کھاد کو جلا دیں، زمین کا ناقابل برداشت باران کو مجبور کرتا کہ وہ اس کو پڑت نہ چھوڑیں، اور ان کی غربت انھیں مجبور کرتی تھی کہ وہ اپنی ساری پیداوار فصل کے زمانے میں مہاجن کا سود اور حکومت کی مالگزاری ادا کرنے کے لیے فروخت کر دیں نتیجے میں وہ ہر سال مہاجن سے بیج قرض لیتے تھے اور اس وجہ سے اچھے تخم کا انتخاب نہ کر سکتے تھے، لیکن حالات ہر جگہ اتنے برے نہ تھے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بہترین ترقی یافتہ طریقوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسے طریقے بھی موجود تھے جن سے پھوہڑپن اور غفلت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس طرح گویا کاشتکار کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے لازمی چیز زرعی طریقوں کی اصلاح تھی، لہذا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی زراعت کے متعلق حکومت کی جو پالیسی تھی اس پر ایک نظر ڈالی جائے۔

ہندوستان میں ہمیشہ سے حکومت کی پالیسی ایک اہم سبب رہی ہے، ۱۸۶۰ء تک ہندوستان میں بدیسی حکومت کو قائم ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور حکومت کی شان کچھ اس قسم کی ہو گئی تھی کہ لوگوں نے یہ عادت بنا لی کہ وہ کسی کام یا اصلاح کی ابتدا کے لیے حکومت پر نظر ڈالتے تھے، اس خاص رتبے نے بالخصوص انیسویں صدی کے آخری حصے میں، حکومت کو ایک عجیب وغریب طاقت دے دی کہ وہ ہندوستان کی ہر جہتی ترقی پر اثر انداز ہو۔ حکومت کی اس سطوت کے دو خاص سبب تھے، پہلا عوام میں تعلیم کی کمی، ہندوستان کے کاشتکار طبقے میں اگرچہ کسی جدید اصلاح کے فوائد کو تیزی سے سمجھ لینے کی قابلیت ضرور تھی مگر قدرتی طور پر یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ خود ہی ان کی ابتدا کر دیتے دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت اعلیٰ طبقے ایک عبوری دور سے

گزر رہے تھے، ان کے خیالات و تصورات نئے نئے سانچوں میں ڈھل رہے تھے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ذمہ دار رہنما باقی نہ رہے، مختصر یہ کہ سارے ہندوستان میں سماج کی کایا پلٹ ہوگئی تھی اور سوائے حکومت کے اور کوئی ایسا اثر باقی نہ رہا جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جاسکے کہ اگر کوئی نیا کام شروع کیا گیا تو اس کی تقلید بڑے پیمانے پر ہوسکے گی۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ صنعتی تغیرات میں حکومت کی جد و جہد کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ معاشی واقعات کے دباؤ سے ظہور میں آتے ہیں، یہ مفروضہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، اور آخر کار عالمی معاشی واقعات نے صنعتی تغیرات کی نوعیت پر پورا پورا قابو پالیا۔ لیکن حکومتیں یا افراد ان کی راہ اور تیزی کو بڑھا یا گھٹا سکتے ہیں، چنانچہ انگلستان کی زرعی ترقی میں رابرٹ بیک ویل اور نارفوک کے شرفا کو بڑا دخل ہے، اور قوانین احاطہ بندی کی نوعیت نے وہاں زرعی انقلاب پیدا کرنے میں مدد دی، یہاں اس امر کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی مخصوص سماجی حالت کے تحت جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں رونما ہورہی تھی، کسی ایسے سماجی طبقے کا فقدان تھا، جس کا اثر ملک کے بڑے حصے پر ہو، لہذا اس پیوستگی اور ہم آہنگی کی کمی نے جو کسی ایک وسیع افادے والی تحریک کے لیے ضروری ہے خواہ مخواہ حکومت ہند کی پالیسی کو اہمیت دے دی۔

لہ زرعی معاملات میں اس واقعے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی کہ جدید تعلیم یافتہ متوسط طبقہ جو مغربی سائنس کے خیالات سے روشناس ہوچکا تھا زیادہ تر شہری اور علمی پیشوں والا تھا، اور ہندوستانی دیہات پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، اس کے برخلاف زمیندار جو زراعت پر اثر ڈال سکتے تھے وہ سائنٹفک طریقوں سے قطعاً نابلد تھے۔

زراعت کے متعلق حکومت ہند کی پالیسی قطعی طور پر معین نہ تھی لیکن جس پالیسی پر عمل ہوتا تھا اس کا استخراج مختلف سرکاری مطبوعات سے ہو سکتا ہے، غالباً ڈاکٹر (بعد میں سرجارج) برڈوڈ کے مندرجۂ ذیل الفاظ اس سلسلے میں ہندوستانی حکومت کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرنے کے لیے بہت کافی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ہندوستانی مصنوعات کا تیزی سے زوال اس بات کا مدعی ہے کہ قابل مبادلہ اشیا کی تعداد کو بڑھانے کی ہر ممکنہ کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔ ہماری بہترین کوششیں یہ ہو سکتی ہیں کہ ہم مصنوعات کے زوال اور ملک کی زرعی دولت میں ایک متناسب توازن قائم کر دیں، نئی خام قابل مبادلہ پیداواروں کو ہر صنعت کی جگہ لے لینا چاہیے، اب تک یہ تسلسل قائم نہیں رہا لیکن یہ بہت ضروری ہے اگر ہمیں ہندوستان کی خوش حالی اس کے متوسلین کے ساتھ موجودہ حالت میں برقرار رکھنا اور مغربی تہذیب کے ساتھ اس کے باہمی ارتباط کو قائم رکھنا ہے[1]۔"

زرعی اصلاح کا سوال ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں تھوڑی بہت توجہ کا مرکز رہا لیکن سب سے پہلی باقاعدہ جماعت جس نے اس مسئلے میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا، اگرچہ یورپینوں کی قائم کردہ تھی مگر وہ حکومتی جماعت نہ تھی، یہ زرعی اور باغبانی کی انجمنیں تھیں جو سب سے پہلے کلکتے میں ڈاکٹر کرے کی کوششوں سے شروع ہوئیں اور پھر بمبئی مدراس اور دوسرے مقاموں پر قائم ہوئیں، ان کو حکومت کی جانب سے یا تو تھوڑی بہت سالانہ رقمی امداد ملتی تھی یا تجرباتی اغراض کے لیے زمین مفت دی جاتی تھی، حکومت کے سب سے پہلے براہ راست حصہ لینے والے ادارے　۶۹

[1] ہندوستان کی اخلاقی و مادی ترقی کی رپورٹ، (سنہ ۷۲-۱۸۷۱ء) ص ۲۷۔

نباتاتی باغات تھے یہ ایک ماہر کی نگرانی میں ہوتے تھے اور بعض وقت ان کے ساتھ تجرباتی مزرعے بھی ہوا کرتے تھے، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۶ء تک صرف ہی دو خاص ادارے ایسے تھے جو زرعی اصلاحات کے واسطے کچھ کوشش کر رہے تھے، ابتدائی سالوں میں ہر شخص کی کوشش صرف یہ تھی کہ نئے پیڑوں اور بدیسی پودوں کو رائج کیا جائے، بلاشبہہ بعض حالات میں ان میں غیر معمولی کامیابی ہوئی، اس کی مثال چائے کی صنعت ہے، واٹ کی رائے ہے کہ "ہندوستان اور لنکا میں چائے کی کامیاب نخل بندی کا سہرا کلکتے کے نباتاتی باغات کے سر ہے، نیز اس میں اُس وقت تک حکومت کی براہ راست امداد کو بھی دخل ہے جب تک کہ خانگی افراد نے مزید اصلاحوں کا بیڑا نہ اٹھایا[1] یہی چیز آلو اور سنکونا کی کامیاب کاشت کے متعلق پیش کی جا سکتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سالوں میں "چند مفید آرائشی پودے اور قیمتی فصلیں[2] رائج کی گئیں نیز اس کے ساتھ ہی ریشے والی فصلوں مثلاً روئی اور نیل کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کی گئی بلکہ روئی کی اصلاح کے لیے تو متعدد کوششیں ہوئیں، لیکن ان میں سب سے کامیاب کوشش دھارواڑ میں امریکن روئی کی ایک نئی قسم کی ترویج تھی۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۷۰ء تک حکومت کی جانب سے کوئی خاص اقدام نہیں کیا گیا، البتہ اس سال زراعت کا شاہی محکمہ قائم ہوا، لیکن اس کی عمر صرف چند روزہ تھی، اور سنہ ۱۸۷۸ء میں اس وجہ سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا کیونکہ صوبہ واری حکومتیں اس سے کوئی خاص اشتراک نہیں کر رہی تھیں، یہ مسئلہ از سر نو سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے

[1] جی، واٹ، برطانوی ہند کے ذرایع کی یاد داشت، (سنہ ۱۸۹۰ء) ص[illegible]۔
[2] حوالۂ متذکرۂ گزشتہ ص[illegible]۔

روبرو لایا گیا، جس کی سفارشات میں سب سے پہلا قدم محکمۂ زراعت کا قیام اور زرعی اعداد و شمار کی فراہمی تھی اب تک جو ترقی ہوئی تھی اس پر رپورٹ میں نیز شاہدوں نے بھی تبصرہ کیا، بہت سے گواہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ جن بنیادوں پر ہندوستان کی زرعی ترقی کا کام ہو رہا ہے وہ بہت کچھ غلط ہے، بلکہ بعض تو اس حد تک گئے کہ وہ یہ سوال کر بیٹھے کیا ان حالات میں ہندوستان کی زرعی ترقی کا کوئی امکان بھی ہے[1]

۷۰ ۱۸۷۰ء کے عشرے میں اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں وہ تجرباتی مزرعوں کے قیام تک محدود تھیں، جن کا مقصد عوام کو جدید طریقوں اور آلات کے فوائد سے مطلع کرنا نیز نئے طریقوں کے تجربات وغیرہ تھا، بدقسمتی سے ان میں سے بیشتر کوششیں اس وقت بارآور نہ ہوئیں، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ" عام طور پر مزرعوں کے نگران ایسے بنائے گئے جن کو زراعت کی حقیقی واقفیت نہ تھی مثلاً باغبان یا ناکام نخل بند۔ یا وہ عہدہ دار جن کے اسی قسم کے حقوق پر لحاظ کرنا ضروری تھا لیکن صرف یہی ایک وجہ نہ تھی کہ جو لوگ ان مزرعوں کے نگران مقرر کئے گئے وہ نا تجربہ کار تھے، بلکہ جب کبھی کسی ماہر زراعت کو بھی انگلستان سے بلایا گیا تو وہ بھی ناکام رہا کیونکہ وہ ہندوستانی حالات اور یہاں کے زرعی طریقوں سے ناواقف ہوتا تھا، اس ناواقفیت کے نتائج بہت ہی مہلک ہوئے اور مزرعوں کی ناکامی پورے طور پر مکمل ہوئی چنانچہ اس امر کو ۱۸۸۰ء تک عموماً تسلیم کر لیا گیا تھا، مسٹر بک (جو بعد میں سر ایڈورڈ کہلائے) نے قحط کمیشن کے سامنے اپنی شہادت میں کہا کہ " اگر کسی ایک چیز میں ہم دیسی باشندوں کو نیچا دکھا سکتے ہیں تو وہ ہم کو

[1] " تجرباتی مزرعوں اور رعایا کو تعلیم دینے کی مزید کوششوں کو قطعاً روک دینا چاہیے" بنگال کے مسٹر ٹاٹن بی کی شہادت ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے سامنے۔

دوسری سیکڑوں چیزوں میں نیچا دکھا سکتے ہیں" رتنا گری کے تعلقہ دار نے لکھا ہے کہ "جنوبی کونکن کو چاول کی کاشت میں ہم سے یا امریکا سے کوئی نئی چیز نہیں سیکھنا ہے" مسٹر بک اپنی یادداشت میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کسی اصلاح کے شروع کرنے سے پہلے اس بات کا مشاہدہ کر لینا بہت ضروری ہے کہ اس کا انطباق ہندوستانی حالات پر کس حد تک ممکن ہے، وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہندوستانی کاشتکاروں کی رائے کی پسندیدگی کا بھی خاص لحاظ رکھا جائے اور اس کے بغیر اصلاح کی تمام کوششوں کی مذمت کرتے ہوئے وہ ان کو مایوس کن قرار دیتے ہیں، اپنی بحث کے ثبوت میں وہ میسرز مائلن اینڈ تھامسن کی ترقی یافتہ شکر کی گرنی کی مثال پیش کرتے ہیں جس کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا تھا، میسرز مائلن اینڈ تھامسن نے اپنے کارخانے کا آغاز کرنے سے پہلے ہندوستان کے کاشتکاروں کی ضروریات اور صلاحیت کا بڑا گہرا مشاہدہ کیا، اور جب ان حالات کے بعد کارخانہ قائم کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ہندوستانی کاشتکار کی قدامت پرستی کے باوجود اس کا استعمال تیزی سے بڑھ گیا ہے، مسٹر بک کے یہ تمام وکمال مفروضات کمیشن کے لیے قابل قبول تھے، انھوں نے محکمۂ زراعت کے فوری قیام پر زور دیا تھا لیکن ان سفارشات پر کوئی عمل نہیں ہوا، ۱۸۸۹ء میں ڈاکٹر وولکر کو اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے مقرر کیا گیا، انھوں نے ہندوستان[1] کا دورہ کیا اور اپنی قیمتی رپورٹ ۱۸۹۳ء میں پیش کی، لیکن اس کے باوجود صدی کے اختتام تک کوئی کوشش نہیں کی گئی، محض محکمۂ زراعت کا قیام اس مسئلے کا حل نہیں تھا، اور ماہرین کی کمی کو ہر جگہ محسوس کیا گیا، تجرباتی مزرعوں کا کام جاری رہا۔ اور ان کے افادیے کا

[1] آر، والیس، "ہندوستان ۱۸۸۷ء میں"۔

سارا انحصار نگران کی ذات پر ہوا کرتا تھا۔

بعض نئے ریشہ دار پودوں کا رواج اور بعض صورتوں میں تھوڑی بہت بہتر مشینوں کا استعمال ہی صرف وہ چیزیں تھیں جو حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں اختیار کی گئیں، حکومت نے زرعی منظاہرے اور سانڈ خانے قایم کرکے مویشیوں اور گھوڑوں کی نسلوں کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کی، لیکن ان میں قطعی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ وہ غیر مسلسل اور صحیح راستوں سے ہٹی ہوئی تھیں۔

نئے طریقوں کی واقفیت پھیلانا اور نئی پیداواروں کے تجربے کرنے کے علاوہ زراعت کی اصلاح کا ایک بہت پرانا طریقہ بھی تھا جس کو ہندوستان کی تمام حکومتوں نے اختیار کیا ہے، یہ طریقہ ان مالی کمزوریوں کا علاج تھا جو کاشتکار کی معیشت میں پیدا ہو جاتی ہیں، تاکہ اس کو آسان شرائط پر قرض دے کر اس قابل بنایا جاسکے کہ وہ اپنی زمین پر اصلاحی ترقیاں کر سکے، یہ طریق تقاوی کے نام سے موسوم ہے، ہندوستان میں برطانوی حکومت نے بھی قانون ترقیات اراضی ۱۸۸۳ء اور قانون قرضۂ مزارعین ۱۸۸۴ء کے تحت پیشگی رقومات دینے کے اس سلسلے کو جاری کیا، یہ چھوٹے چھوٹے قرضے ہوتے تھے جو حکومت کی جانب سے کم شرح سود پر دیے جاتے تھے اور مالگزاری کے ساتھ اقساط کے ذریعے سے ادا کر دیے جاتے تھے، قحط کمیشن کے سامنے پیش ہونے والی شہادتوں نے اس بات کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ کاشتکاروں نے ان سے کسی بڑے پیمانے پر استفادہ نہیں کیا، کیونکہ جس طرح قوانین کا نفاذ ہوا تھا، اس کے تحت قرضہ لینے میں بڑی دشواریاں تھیں، مثلاً اس طریقے کی کامیابی کا انحصار کسی فردِ واحد کے شوق اور انہماک پر ہوتا تھا جو عموماً ضابطے کے لحاظ سے ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر ہوا کرتا تھا[1]،

---

[1] ڈاکٹر والکر ہندوستان میں زرعی ترقی کی بابت رپورٹ صفحہ ۔

لہذا بہت سی صورتوں میں تو قانون کی شرائط کا بھی ضلع میں کسی کو علم نہ ہوتا تھا، دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ پیشگی رقومات ایک خاص وقت ہی ملتی تھیں، اور تقاوی قرضوں کی اس صورت کا سارا انحصار نگران عہدہ دار کے کردار پر ہوتا تھا، اس لیے یہ کچھ زیادہ تعجب خیز بات نہیں کہ کاشتکار مہاجن کے پاس جانے کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہاں اس کو کم از کم جھٹ پٹ روپیہ ملنے کا تو یقین ہوتا تھا، ان رقومات کو قرض دینے میں دوسری بڑی خرابی یہ تھی کہ نہ صرف سود حاصل کرنے بلکہ اصل رقم کے واپس لینے میں بھی قانون کو بڑی سختی سے استعمال کیا جاتا تھا۔[1] اکثر اوقات قرضہ بے باق ہونے والی مدت کچھ زیادہ طویل نہیں ہوتی تھی، باوجودیکہ ان کی شرح سود مہاجن کے قرضوں کی شرح سے بہت کم ہوتی تھی، لیکن یہ بہت زیادہ کامیاب نہ رہے، برخلاف اس کے ان علاقوں میں جہاں محنتی عہدہ داروں نے قوانین کو کشادہ دلی سے استعمال کیا اور ان مراعات کی تشہیر کی جو حکومت نے عطا کی تھیں تو وہاں عام طور پر یہ قرضے بہت مقبول ہوئے، اور ان سے خاص طور پر کنویں کھودنے کے واسطے اچھا خاصا فائدہ اٹھایا گیا۔

حقیقی طور پر حکومت کی جد و جہد کا دائرہ بہت محدود تھا، محض کاشتکار کے سامنے بھاری آہنی ہل کی فوقیت کے اظہار کو قائل کر دینے والے مظاہرے عملی حیثیت سے کوئی زیادہ افادہ نہیں رکھتے تھے، جبکہ اس کے نیم گرسنہ بیل قطعی طور پر معمولی لکڑی کے ہل سے زائد بوجھ کھینچنے کے قابل نہ ہوں" ہر جگہ اسی قسم کی رکاوٹیں کھاد یا پانی کے نلوں کے استعمال میں پیش آئی تھیں، کاشتکار

[1] ہندوستانی آب پاشی والے کمیشن کی رپورٹ، باب ششم (سنہ ۱۹۰۳ء)۔

کے افلاس کے اصل اسباب اور اس کی زمین کے مختصر ہونے کو مظاہراتی مزرعوں اور ترقی یافتہ آلات کے استعمال سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک مشکل اور تھی، اور وہ تجارت کا اثر تھا۔ ڈاکٹر وولکر بتاتے ہیں کہ کس طرح لندن میں گیہوں کی تجارت پر بازار میں آنے والے خوش وضع گیہوں نے اپنا اثر ڈالا، اس سے بھی زیادہ نمایاں مثال ہندوستانی روئی کی اقسام کی ابتری ہے[1]۔ حکومت کے دائرۂ طرز عمل کو برار کے مسٹر جو کنس نے قحط کمیشن (۱۸۹۸ء) کے سامنے اپنی شہادت میں بڑی صفائی سے پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "میں تمثیلی مزرعوں کے اثرات کا قائل نہیں، در اصل روئی کے اس پہلے تاجر نے جس نے خراب روئی کے مقابلے میں اچھی روئی کو اکنی روپیہ زائد دینا شروع کیا، مجھ سے زیادہ دردھا کی روئی کی خدمت کی، جبکہ میری پشت پر حکومت کے تمام ذرائع

[1] یہ رجحان بہت دور رس تھا نتیجے میں ادنیٰ اقسام نے اعلیٰ اقسام کو خارج کر دیا جیسا کہ خاندیس اور صوبہ جات متوسط و برار میں ہوا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ادنیٰ اقسام جلد تیار ہو جاتی تھیں اور سخت جاں ہوتی تھیں، نیز اچھی روئی کی کاشت میں کاشتکار کو جن دقتوں اور اخراجات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس کا مناسب معاوضہ بھی نہ ملتا تھا، ہندوستانی روئی کی گرنیاں ادنیٰ قسم کے سوت کی لچھیاں اور موٹی قسم کا کپڑا تیار کرتی تھیں، ملک میں عمدہ قسم کی روئی کی طلب موجود نہ تھی اور قیمتوں میں فرق ناقابل لحاظ تھا، یہ رجحان روئی اوٹنے والی دخانی گرنیوں کی بدولت اور زیادہ موثر ہو گیا، دستی چرخیوں کا رواج بیج کے انتخاب کے لیے بھی بند ہو گیا، اور کاشتکار کو اسی میں سہولت نظر آنے لگی کہ وہ قریب کی روئی اوٹنے والی گرنی سے بیج خرید لیا کرے، جہاں کپاس کی تمام اقسام اور نوعیتوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا تھا تجارتی پیداوار کے اس نئے پہلو نے صدیوں کے قدرتی انتخاب کی تخصیص کو برباد کر دیا۔ جی، واٹ، ہندوستان کی تجارتی پیداواریں، مضمون بسلسلۂ کپاس (۱۹۰۸ء) نیز ملاحظہ ہو، ہندوستان میں روئی کی ترقی کی مراسلت وغیرہ، (پارلیمنٹری دستاویز) خصوصاً

موجود تھے" حکومت کے کاموں میں اسی قسم کی رکاوٹیں تھیں حکومت جدید طریقوں اور اچھے بیج کے انتخاب وغیرہ میں بہت کچھ کر سکتی تھی، لیکن ان کے رواج اور کامیابی کے لیے کاشتکار کی ضروریات اور اس کے موجودہ ذرائع کا دقیق اور وسیع النظری سے مشاہدہ کرنا بہت ضروری تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ مسٹر مویسن کی یادداشت۔

صنعت کی ترقی سنہ ۱۸۸۰ء لغایت سنہ ۱۸۹۵ء

سنہ ۱۸۸۰ء سے سنہ ۱۸۹۵ء تک کے پندرہ سال مجموعی حیثیت سے مزارعین کے لیے بہت اچھے تھے لیکن اس دور میں دستکاریاں برابر تنزل پذیر رہیں، اور صنعت کی جن قسموں نے اس دور میں ترقی کی علامات ظاہر کیں وہ کارخانے اور نخل بندیاں تھیں، سنہ ۱۸۸۰ء میں اول الذکر کی وسعت بہت کم تھی، اور اس کی نوعیت بھی محدود تھی، اس وقت ہندوستان کی کارخانوں والی صنعت در اصل پارچہ بافی کی دو صنعتوں یعنی روئی اور جوٹ پر مشتمل تھی، لہذا مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ پندرہ سالوں میں کسی نئی صنعت نے کوئی خاص ترقی نہیں کی، چند نئی صنعتوں کا آغاز ضرور ہوا مگر ان میں سے کسی نے کوئی اہمیت حاصل نہ کی، جو کچھ بھی ترقی ہوئی وہ پرانی قائم شدہ صنعتوں مثلاً روئی اور جوٹ میں ہوئی۔

روئی کی صنعت نے ان پندرہ سالوں میں کافی ترقی کی سنہ ۱۸۸۰-۹۵ء میں روئی کی گرنیوں کی تعداد

	سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء	سنہ ۱۸۸۴-۸۵ء	سنہ ۱۸۸۹-۹۰ء	سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء
گرنیوں کی تعداد	۸۵	۸۱	۱۱۴	۱۴۴
مزدوروں کی تعداد	۳۹٬۵۳۷	۶۱٬۵۹۶	۹۹٬۲۲۴	۱٬۳۹٬۵۷۸
کرگھے	۱۳٬۳۰۷	۱۶٬۴۵۵	۲۲٬۰۷۸	۳۴٬۱۶۱
تکلے	۱۴٬۰۷٬۸۳۰	۲۰٬۳۷٬۰۵۵	۲۹٬۳۴٬۶۳۵	۳۷٬۱۱٬۶۶۹

اس نقشے سے اس صنعت کی ترقی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اگرچہ رفتار ترقی بہت تیز نہیں تھی تاہم وہ مسلسل اور یکسان ضرور تھی اس دور میں شدید تغیرات قطعی طور پر غائب رہے۔

سنہ ۱۸۸۵ء کے بعد رفتار ترقی خاص طور پر نمایاں ہوگئی، مسٹر گراہم کلارک اس دور کی مجموعی ترقی کے متعلق لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۸۸۵ء کا سال عروجی سلسلے میں ایک تغیری سال معلوم ہوتا ہے، اس وقت ہندوستان کی روئی کی گرنیوں کی مشینوں کے سلسلے میں بعض نئی چیزوں مثلاً کتائی کے چھلّے اور گھومنے والے بالائی کنگھے کا رواج ہوا اس کی بدولت انھوں نے عمدہ قسم کا سوت اور مختلف اقسام کا کپڑا بنانا شروع کیا۔ اور اپنے سامان کے لیے نئے بازاروں تک پہنچنے کی کوشش شروع کردی تھی، سنہ ۱۸۸۵ء سے

۷۵

سنہ ۱۸۹۰ء کے پانچ سالوں میں پچاس مزید گرنیوں کا اضافہ ہوا، جو ترقی کے بہت اچھے زمانے کو ظاہر کرتا ہے، نیز کاروبار کی حالت بھی اچھی رہی اور تقریباً ۱۸۹۷ء تک وسعت بھی مستحکم رہی۔[1] بنائی کے مقابلے میں کتائی اب تک اس صنعت کا زیادہ اہم جزو تھی، لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ابتدائی دس سالوں میں کرگھوں کے مقابلے میں تکلوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا، لیکن آخری پانچ سالوں میں صورت حال برعکس نظر آتی ہے، اب کرگھوں میں اضافے کا ایک عام رجحان نظر آتا ہے، اور ایسا ہونا ایک لازمی امر تھا، کیونکہ صنعت کے ابتدائی دور میں لنکاشائر کی مسابقت کی وجہ سے موٹا سوت بھی زیادہ منافع بخش تھا اور اسی کو کامیاب ہونا چاہیے تھا، اس وقت کتائی ہی کارخانے کا اہم شعبہ تھی، لیکن تیس سالہ مسلسل ترقی کے بعد بمبئی کی صنعت نے ملک کی گھریلو دستی کتائی کی صنعت کو عملی طور پر بالکل ختم کر دیا تھا، اور اس نے ہندوستان کے موٹے سوت کے سارے بازار پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن صرف یہی چیز نہ تھی بلکہ اٹھویں عشرے میں ہندوستان کے سوت اور دھاگے کی برآمد میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا، یہ برآمد خاص طور پر چین اور جاپان کو ہوتی تھی، ہندوستانی دھاگے اور سوت نے اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کر لی کہ مانچسٹر کے ایوانِ تجارت کو ۱۸۸۸ء میں اس بات کی تحقیقات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ بمبئی کی صنعت کی ترقی کے کیا اسباب ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی کامیابی کے اسباب خاص طور پر "جغرافی" ہیں[2]، بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں

---

[1] ڈبلیو اے گراہم کلارک، فلپائن اور برطانوی ہند کے سوتی ریشے صفحہ ۱۲ (۱۹۰۷ء)۔
[2] بمبئی اور لنکاشائر کی کتائی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۸۸ء)۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کی برآمد اس عشرے میں تیزی سے بڑھی اور مسلسل قایم رہی۔

	سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء	سنہ ۱۸۸۵-۸۶ء	سنہ ۱۸۹۰-۹۱ء
ہندوستانی دھاگے اور سوت کی برآمد (پونڈ میں)	۲,۶۷,۰۴,۷۱۶	۷,۹۳,۲۴,۴۳۱	۱۷,۰۵,۱۸,۸۰۴

لیکن یہ ترقی برابر جاری نہ رہ سکتی تھی، کیونکہ ان بازاروں کی صلاحیت غیر محدود نہ تھی، اس کے علاوہ سنہ ۱۸۹۰ء میں جاپان کے ساتھ ہندوستانی تجارت میں ایک تغیر واقع ہو رہا تھا، اس زمانے میں جاپان خود بھی اپنے یہاں آہستہ آہستہ کارخانے بنا رہا تھا اس لیے اب اس نے یہاں کے سوت اور دھاگے کو خریدنا چھوڑ دیا اور اس کے بجائے یہاں سے خام روئی خریدنے لگا، لہٰذا سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد کے پانچ سالوں میں ہندوستانی سوت اور دھاگے کی برآمد بجائے بڑھنے کے گھٹنے لگی، اور بمبئی کے کارخانوں کے مالک مجبور ہوئے کہ وہ اپنی توجہ تکلوں سے ہٹا کر کسی اور چیز پر مرکوز کریں، اگرچہ سوت اور دھاگے کی برآمد رک گئی تاہم اس سے صنعت کی خوش حالی پر کوئی اثر نہ پڑا۔

صنعت کی تحصیر میں بھی صرف تھوڑی بہت تبدیلی ہوئی، صوبۂ بمبئی صنعت کا مرکز بن گیا تھا اور صوبے میں بھی بمبئی اور احمد آباد دو شہر اس کے خاص مرکز تھے، ہندوستان میں گرنیوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا، لیکن بمبئی اور احمد آباد کے علاوہ یہ ملک کے مختلف حصوں میں منتشر تھیں، اور ان دو شہروں کے علاوہ ابھی تک روئی کی صنعت کا اور

کوئی بڑا مرکز قایم نہ ہوا تھا، ۱۸۹۴-۹۵ء میں ہندوستان میں ۱۴۴ گرنیاں تھیں جن میں ۱۰۰ صوبۂ بمبئی میں اور ان میں سے ۶۷ شہر بمبئی اور اس کے جزیرے میں واقع تھیں۔

پارچہ بافی کی دوسری صنعت جوٹ کی مصنوعات تھیں، ان میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا جیسا کہ روئی کی صنعت میں ہوا، چنانچہ اس ترقی کا اندازہ ہندوستان سے برآمد ہونے والی جوٹ کی مصنوعات کے اضافے سے ہوتا ہے، جوٹ کی صنعت کا روئی کی صنعت کی طرح سلاک کے بازار کی وسعت پر انحصار نہ تھا، اس لیے جوٹ کی صنعت کی ترقی اور اس کی مصنوعات کی برآمد میں اضافہ دونوں میں بہت ہی قریبی رشتہ ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جوٹ کی صنعت میں مسلسل ترقی ہوتی رہی روئی کے برخلاف جوٹ ایک غیر مستقل فصل ہے، اور اس کی مصنوعات کی طلب اس قدر پائدار نہیں جیسی کہ روئی کے سامان کی ہے، لیکن جوٹ پیدا کرنے والے ایک منظم شکل میں تھے اس لیے کساد بازاری یا قلت کے دور میں ہر طرف اوقات کار میں کمی کر کے مشکلات پر قابو پا لیا جاتا تھا، اس صنعت کی ترقی میں دوسری قابل لحاظ چیز یہ تھی کہ پیداوار یا مزدوروں کی تعداد کی بہ نسبت گرنیوں یا کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ بہت کم تھا، روئی کے کارخانوں کی جدول پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں کام کرنے والے مزدوروں، کرگھوں اور تکلوں کی تعداد میں اضافے کا تناسب برابر قایم رہا، لیکن جوٹ کی صورت حال اس کے برعکس تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنعت کی توسیع نے کارخانوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے موجودہ کاروبار ہی میں وسعت یا پھیلاؤ کی شکل اختیار کی، لہذا روئی کے مقابلے میں اس صنعت میں پیدایشی اکائی کا اوسط بہت

زیادہ بڑھ گیا۔

سنہ ۹۵-۱۸۸۰ء کے درمیان جوٹ کی گرنیاں

	سنہ ۸۰-۱۸۷۹ء	سنہ ۸۵-۱۸۸۴ء	سنہ ۹۰-۱۸۸۹ء	سنہ ۹۵-۱۸۹۴ء
گرنیوں کی تعداد	۲۲	۲۴	۲۷	۲۹
مزدوروں کی تعداد	۲۷,۴۹۴	۵۱,۹۰۲	۶۲,۷۳۹	۷۵,۱۵۷
کرگھوں کی تعداد	۴,۹۴۶	۶,۹۲۶	۸,۲۰۴	۱۰,۰۴۸
تکلوں کی تعداد	۷۰,۸۴۰	۱,۳۱,۷۴۰	۱,۶۴,۲۴۵	۲,۰۱,۲۱۷

ان ۲۹ گرنیوں میں سے ۲۶ (اور جو سب بڑی بڑی تھیں) بنگال میں کلکتے کے چاروں طرف واقع تھیں۔

اس کے بعد کوئلے کی کانوں کا درجہ ہے، سنہ ۱۸۸۰ء میں ان کی تعداد بہت کم تھی اور ہندوستانی ریلوں اور صنعتوں کی مانگ ان سے بمشکل پوری ہوتی تھی، سنہ ۱۸۸۶ء تک اس صنعت کی رفتارِ ترقی بہت ہی سست رہی لیکن پھر اس میں بھی تیزی سے ترقی ہونے لگی اس صنعت کا سارا دارومدار ہندوستان میں ریلوں کی توسیع اور کرائیہ مال پر تھا۔

۱۸۸۵-۹۵ء میں کوئلے کی کانیں

	۱۸۸۵ء	۱۸۹۰ء	۱۸۹۳ء	۱۸۹۴ء
پیداوار (ٹن میں)	۱۲،۹۴،۲۲۱	۲۱،۶۸،۵۲۱	۲۵،۶۲،۰۰۱	۲۸،۰۰،۶۵۲
مزدوروں کی تعداد	۲۲،۷۴۵	۳۲،۹۷۱	۳۷،۶۷۹	۴۳،۱۹۷
کانوں کی تعداد	۶۸	۸۲	۰	۱۲۳

۱۸۹۳-۹۴ء کا سال اس صنعت کی ترقی کے لیے حیرت انگیز تھا، دراصل اس سال سے اس معدنی ترقی کے فروغ کا آغاز ہوا جو ہم کو آیندہ بیس سالوں میں نظر آتی ہے، اور ۱۸۹۳ء تک باوجود ان تمام ترقیوں کے جو کوئلے کی صنعت میں ہوئیں یہ صنعت بالکل ابتدائی حالت میں تھی، ہندوستان کی جملہ معدنی پیداواروں میں کولار کی کانوں کا سونا کوئلے کی کل پیداوار کی قیمت سے بڑھا ہوا تھا۔

ہندوستان میں کوئلے کی صنعت کی ترقی میں سب سے بڑی دشواری کرایۂ مال کا سوال تھا، ریلوں کا کرایہ بہت زیادہ تھا، بنگال کی کانیں جو ہندوستان کی کل پیداوار کا تقریباً تین چوتھائی حصہ پیدا کرتی تھیں بہت ہی اندرونی علاقے میں واقع تھیں، اس زمانے میں بحری کرایے کی شرح بھی ناقابل برداشت تھی، اور ان اسباب کی بنا پر بنگال کی کانوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مغربی اور جنوبی ہند کو کوئلہ مہیا کرسکیں، البتہ اس زمانے میں جو خاص فائدہ حاصل کیا گیا

وہ برما کے بازار پر قبضہ تھا، اس طرح مشرقی ہند سے بدیسی کوئلے کو بالکل نکال دیا گیا، بمبئی میں پیدائشی صنعت کی ترقی کی وجہ سے کوئلے کی درآمد میں بھی کافی اضافہ ہو رہا تھا، اگرچہ مجموعی حیثیت سے ترقی کچھ زائد نہ تھی لیکن اس دور کے اختتام تک اس قسم کی علامات پیدا ہو چکی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ ہندوستانی کوئلہ نہ صرف ریلوں بلکہ پیدائشی صنعت میں اچھی خاصی اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا، اس دور میں ہندوستان سے کوئلے کی برآمد بھی شروع ہو گئی وہ ۹۱-۱۸۹۰ء میں ۲۶۲۳۲۶ ٹن سے بڑھ کر ۹۵-۱۸۹۴ء میں ۵۳۵۶۶۵ ٹن ہو گئی، لیکن یہ صرف آغاز تھا، اور جبکہ ۸ لاکھ ٹن سالانہ درآمد ہونے والی مقدار سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو یہ مقدار بہت حقیر معلوم ہوتی تھی، اگرچہ ۱۸۹۵ء تک کوئلے کی صنعت میں کچھ زیادہ ترقی نہ ہوئی لیکن اس میں آیندہ ترقی کے امکانات ضرور پیدا ہو چلے تھے؛

اب تک ہندوستان میں صرف تین صنعتوں میں روئی، جوٹ اور کوئلے ہی کو اہمیت حاصل تھی، ہندوستان کے مالیاتی اور تجارتی اعداد و شمار میں دو اور صنعتوں یعنی اون اور کاغذ کی گرنیوں کے اعداد کو بھی الگ الگ بڑی صنعتوں کے سلسلے میں شامل کیا گیا تھا، لیکن ان دونوں کا کاروبار بہت مختصر تھا، کیونکہ ۱۸۹۵ء میں ہندوستان میں چھ اون کی اور آٹھ کاغذ کی گرنیاں تھیں جن میں علی الترتیب تین اور ساڑھے تین ہزار مزدور کام کرتے تھے، ہندوستان کی عام صنعتی ترقی کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ روئی اور جوٹ کے بعد کارخانوں کی صنعتوں میں یہی دو صنعتیں سب سے بڑی تھیں۔

تخل بند صنعتوں میں اب چائے کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی، یہ وہ صنعت تھی جو انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں برابر ترقی کرتی رہی، اور خوش حالی کے دور سے گزرتی رہی،

اس کے علاوہ زیر تبصرہ دور میں اس صنعت میں اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ۱۸۸۵ء میں چائے کے تحت ۲۸۴,۰۰۰ ایکڑ رقبہ تھا جو ۱۸۹۶ء میں بڑھ کر ۴۳۳,۱۱۳ ایکڑ ہوگیا۔ آسام یعنی برہم پتر اور سرما کی وادیوں کو ابھی تک اس کی پیداوار میں فوقیت حاصل تھی کیونکہ ۱۸۹۶ء تک کل رقبے کا ۶۷,۴ فی صدی حصہ یہیں تھا، اس کے بعد بنگال (بالخصوص دارجلنگ اور جال پگوری) کا نمبر تھا جس کا حصہ ۲۴,۲۳ فی صدی تھا، لیکن ان کے علاوہ دوسرے مقامات مثلاً صوبہ جات شمال و مغرب (جو اب صوبہ جات متحدہ کہلاتے ہیں) اور پنجاب میں ہمالیہ کے ڈھالوں یا جنوب میں نیلگری کی پہاڑیوں پر بھی یہ صنعت ترقی کر رہی تھی، دوسری قابل لحاظ چیز یہ تھی کہ رقبۂ کاشت کے مقابلے میں چائے کی مجموعی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور یہ دراصل کاشت کے بہتر طریقوں اور چائے سازی میں مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال کی بدولت تھا، صنعت میں مزدوروں کی حالت کچھ بہتر ہوگئی تھی لیکن بھرتی کرنے کے طریقے کی خرابیاں بدستور باقی تھیں چنانچہ کمارہ دکھنشیور ملیا (جو چائے اور کوئلے کے مزدوروں کے تحقیقاتی کمیشن کے ایک رکن تھے) نے ۱۸۹۶ء میں اس طریقے کی مذمت کی اور اس کو سماج کے لیے ایک بدترین مرض قرار دیا۔[1]

کافی قہوے کی کاشت میسور، کورگ، نیلگری اور صوبۂ مدراس کے اضلاع مالابار تک محدود تھی، ۱۸۷۹ء تک اس صنعت کے حالات اطمینان بخش تھے" لیکن بعد کے دس سالوں میں یعنی ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۹ء تک گھٹی ہوئی قیمتوں اور پودوں میں سوراخ ڈالنے اور پتوں کو چاٹ جانے والے

---

[1] چائے اور کوئلے کی صنعتوں کے مزدوروں کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ (۱۸۹۶ء) نوٹ از کمارہ دکھنشیور ملیا۔

کیڑوں کی بدولت ہندوستان اور لنکا میں کافی کی کاشت پر بُرا اثر پڑا، اور لوگ اس کی کاشت کے مستقبل سے کچھ اس قدر مایوس ہو گئے کہ ہندوستان اور لنکا میں ایک وسیع رقبہ جو پہلے کافی کی کاشت میں تھا اب چائے کی کاشت میں آگیا[1] گھٹتی ہوئی قیمتوں کی اصل وجہ بازار میں برازیل کی کافی کی فوقیت تھی جو وہاں کثیر مقدار میں ارزاں نرخ پر پیدا ہو رہی تھی، حالات نے اور زیادہ نزاکت اس لیے بھی اختیار کر لی کہ ہندوستانی کافی کا تقریباً ۹۶ فی صدی حصہ برآمد ہوتا تھا اور مقامی بازار میں اس کی تلافی ممکن نہ تھی، لیکن اس کے بعد ۱۸۹۰ء سے کافی کی قیمتیں پھر بڑھنے لگیں، جو ۱۸۹۶ء تک قایم رہیں، اس کی وجہ برازیل میں سیاسی بدامنی تھی، لہذا کافی کی کاشت دوبارہ شروع ہوئی اور ۱۸۹۰-۹۶ء کے مختصر عرصے میں اس میں پھر خوش حالی پیدا ہو گئی، لنکا میں کافی کا رقبہ پورے طور پر چائے کی کاشت میں آچکا تھا لیکن ہندوستان میں صورت حال کچھ زیادہ خراب نہیں ہوئی اور بعد میں تو پھر بالکل سنبھل گئی۔

نخل بندی کا تیسرا کاروبار نیل کی صنعت تھی جس میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی اور اس کی حالت یکساں رہی، مسٹر اوکنور نیل کی تجارت کے متعلق کہتے ہیں" اس کا شمار اُن چند قدیم تجارتوں مثلاً افیون اور ریشم میں ہو سکتا ہے جن میں ترقی کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے"[2] اس صنعت کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کچھ اضافہ ضرور ہوا کیونکہ ۱۸۹۴-۹۵ء میں نیل کی برآمد ایک ایسے انتہائی نقطے پر پہنچ گئی، جس پر پہنچنے کے لیے وہ بعد میں بھی کوشش کرتے رہے۔

[1] کافی کی کاشت کی سالانہ روئداد (۱۸۹۲ء)

[2] اوکنور ہندوستان کی تجارت پر تبصرہ، ۱۸۸۰-۸۹ء صفحہ ۲۶

باقی صنعتیں وہ تھیں جو خام مال کو ایک آدھ درجے سے تیار کرکے یا تو اس کی برآمد میں معاونت کرتی تھیں یا اس کو اعلیٰ صنعتوں کے مزید مراحل سے گزرنے میں مدد دیتی تھیں، ہندوستان میں اس نوعیت کی خاص صنعتیں روئی اور جوٹ کو دابنے کے کارخانے اور چاول اور چوبینے کی گرنیاں تھیں، یہ صنعتیں اپنے کام کے زمانے میں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو ملازم رکھ لیا کرتی تھیں لیکن ان کی نشوونما کسی خاص مقام تک محدود ہوا کرتی تھی، ان میں سب سے زیادہ تیزی سے فروغ چاول اور چوبینے کی گرنیوں کو ہوا جو تقریباً سب کی سب اب تک برما میں واقع تھیں، اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاکھ کی مصنوعات بھی اسی قسم کی صنعتوں میں آجاتی ہیں اور ان کی تعداد میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں ریلوں اور کارخانوں کی صنعت کی توسیع کے ساتھ ہی ساتھ ایک قسم کی تضمینی صنعتوں نے بھی ابھرنا شروع کیا۔ مثلاً انجینیری، لوہا اور پیتل ڈھالنے والے کارخانے، یہ ایک ترقی پذیر قسم تھی، لیکن اس کا دائرہ ہندوستان میں مشینوں کے استعمال کی وسعت پر محدود ہو گیا تھا۔

آخر میں ایک اور قسم کا تذکرہ ضروری ہے اور یہ نیم کارخانے والی صنعتیں تھیں ان میں سب سے زیادہ اہم مدراس کے چمڑے کی صنعت تھی، جو اب بہت فروغ حاصل کر چکی تھی، یہ صنعت صوبۂ مدراس کے تمام اہم شہروں میں پھیل چکی تھی، اور اس کی ترقی کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دباغت اور نیم دباغت شدہ چمڑے اور کھالوں کی برآمد ہندوستان سے کثیر مقدار میں ہونے لگی تھی، یہ ایک عجیب بات ہے کہ اگرچہ یہ صنعت بظاہر کافی نفع بخش تھی مگر یہ صرف صوبۂ مدراس تک محدود ہو گئی، حالانکہ خام چمڑے اور کھالوں کی بڑی مقدار ہندوستان کے دوسرے شہروں

سے بھی برآمد کی جاتی تھی، اس قسم کی ایک اور صنعت ساحل مالا بار کی اینٹ اور کویلو کی صنعت تھی، جس کی داغ بیل سب سے پہلے ایک مبلغ نے منگلور میں ڈالی اور جیسے ہی اس کی کامیابی ظاہر ہوئی وہ تیزی سے پھیل گئی۔

مجموعی حیثیت سے ان پندرہ سالوں میں اور خصوصیت سے آخری حصے میں ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، بڑے اور قایم شدہ کاروبار سرعت سے بڑھ رہے تھے، نیز ضمنی اور چھوٹی صنعتیں بھی ترقی کر رہی تھیں اور ہندوستان کے صنعتی ارتقا کا مستقبل امید افزا نظر آنے لگا، چنانچہ مسٹر جسٹس رانا ڈے نویں عشرے کی ابتدائی ترقی پر تبصرہ کرتے ہوئے "ہندوستان کی مصنوعات کی موجودہ حالت" کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "میں نے آپ کے سامنے ان امور کو پیش کر دیا ہے جو میرے ذہن میں امید افزا حالات کی استوار بنیاد ہیں کہ ہندوستان اب بڑی اچھی طرح اس راستے سے لگ گیا ہے کہ اگر اس کو اسی جذبے سے جاری رکھا جائے جن کا اظہار اب تک اس کے پرجوش سرمایہ داروں نے کیا ہے تو وہ اپنی صنعتی نجات کا ذریعہ حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔"[1]

قدرتی طور پر کارخانوں کی ترقی پر نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص کی نگاہ ان صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر پڑتی ہے، اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے قدیم معاشی نظام میں عارضی مزدوروں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، سب سے پہلی چیز جس نے ان لوگوں کی طلب پیدا کی وہ امورِ عامہ کے محکمے کا قیام تھا، اس کے بعد ہندوستان میں کارخانوں کے قیام کی وجہ سے ان کی طلب شدید ہو گئی، مزدور مہیا کرنے والے طبقوں کا عمومیت سے تذکرہ کرنا یا ان کے معیارِ زندگی

[1] ایم، جی رانا ڈے "ہندوستانی معاشیات کے مضامین" صـ۱۱۱ (سنہ ۱۸۹۸ء)

سے بحث کرنا ناممکن ہے، لہذا ہم کو اس لحاظ سے ہر صنعت پر الگ الگ نظر ڈالنا چاہیئے۔

شہر بمبئی کی روئی کی صنعت میں زیادہ تر مزدور کونکن اور صوبۂ بمبئی کے دکھنی اضلاع کے ہوتے تھے، یہ لوگ عموماً اراضی نہ رکھنے والے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کی تعداد ہندوستان میں تیزی سے بڑھ رہی تھی، روئی کی صنعت کا دوسرا بڑا مرکز احمد آباد تھا یہاں مزدور زیادہ تر مقامی ہوتے تھے، جو آس پاس کے علاقوں سے کام پر آجاتے تھے، روئی اوٹنے اور دابنے والی صنعتوں میں بھی مزدور مقامی ہوتے تھے اور ان میں زیادہ تعداد عموماً بڈھی عورتوں کی ہوتی تھی، ۱۸۸۵ء تک کلکتے کی جوٹ کی صنعت میں بھی مزدور مقامی ہوتے تھے لیکن اس کے بعد صنعت میں فروغ اور نئے مزدوروں کی طلب کی بدولت صوبہ جات متحدہ اور اڑیسہ سے مزدور آنے لگے، ہر جگہ غیر ملکی مزدوروں کا تناسب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، بنگال میں کوئلے کی صنعت بھی تیزی سے ترقی کر رہی تھی، لیکن اس دور کے آخر تک عام طور پر وہاں کے مزدوروں کی طلب قدیم اقوام کے مقامی باشندوں سے پوری ہو جاتی تھی، ان دوسرے مقامات پر جہاں کچھ صنعتیں تھیں، مزدور مقامی ہوتے تھے، البتہ رنگون اس میں شامل نہ تھا، وہاں چاول صاف کرنے والی گرنیوں کے واسطے کام کے زمانے میں چاول اتارنے اور لادنے کے لیے مزدور مدراس سے بھیجنا پڑتے تھے۔

جن حالات کے تحت مزدور کام کرتے تھے ان کو منظم کرنے کی بحث کا آغاز ۱۸۷۵ء میں ہوا جب حکومت بمبئی نے ایک کمیٹی بمبئی کے کارخانوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے مقرر کی، نیز اس کو یہ بھی غور کرنے کی ہدایت ہوئی کہ آیا کارخانوں کے متعلق کوئی قانون نافذ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں، جب قانون نافذ کرنے کا مسئلہ

درپیش ہوا تو کمیٹی میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا، کارخانہ دار اپنے مفاد کے تحت اس قسم کے کسی اقدام کو بھی پسند نہ کرتے تھے، اور ہندوستان میں عوام کا بڑا حصہ بھی انھی کے ساتھ تھا، مختلف مسودوں پر غور کرنے کے بعد آخر کار ۱۸۸۱ء میں پہلا قانون نافذ ہوا، یہ قانون بالکل ابتدائی شکل کا تھا، دراصل اس قانون میں بارہ سال سے کم عمر بچوں کے متعلق ضابطے مقرر کیے گئے تھے، سات سال سے کم عمر بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی سات سے بارہ سال کے درمیانی بچوں کے لیے اوقات کار ۹ گھنٹے مقرر کیے گیے ایک آدھ دفعہ مشینوں کی احاطہ بندی کے متعلق بھی تھی، لیکن اس میں صفائی وغیرہ کے متعلق کوئی دفعہ نہ تھی، قانون کا اطلاق صرف ان کارخانوں پر ہو سکتا تھا جہاں سو یا اس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں اور قوت محرکہ کا استعمال ہو رہا ہو، چائے، کافی اور نیل کے باغات اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔

بہت جلد یہ محسوس کر لیا گیا کہ اس قانون کی دفعات میں مزدوروں کے مفادات کے تحفظ کی بالکل صلاحیت نہیں، چنانچہ حکومت بمبئی نے ایک دوسری کمیٹی مقرر کی، لیکن اس کمیٹی نے جن ترمیمات کی سفارش کی ان میں سے کسی پر عمل نہیں کیا گیا، لنکاشائر اور ڈنڈی کے کارخانہ دار، قانون کارخانجات کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہندوستان کی غیر واجبی مسابقت کی برابر شکایت کر رہے تھے[1]، نیز ہندوستان میں اور خصوصیت کے ساتھ صوبۂ بمبئی میں بھی اس سلسلے میں مزید قانون سازی کی حمایت ہونے لگی، آخر کار حکومت ہند نے ۱۸۹۰ء میں ایک کمیشن کارخانجات مقرر کیا اور زیادہ تر اسی کمیشن کی سفارشات پر ۱۸۹۱ء میں

۸۲

[1] ہچ، یم، انسپکٹر کارخانجات کی سالانہ رپورٹ، (۱۸۹۵ء) ہندوستان میں قوانین کارخانجات پر نوٹ۔

ایک اور قانون نافذ ہوا اس قانون میں مزید اضافہ یہ کیا گیا کہ اس کا اطلاق ان تمام کارخانوں پر ہونے لگا جہاں پچاس مزدور کام کرتے ہوں، ہفتے میں ایک دن کی عام تعطیل رکھی گئی، بچوں کی ملازمت کی عمر نو سال ہوگئی نو سے چودہ سال تک والے بچوں کے لیے کام کے اوقات زیادہ سے زیادہ سات گھنٹے مقرر ہوئے، نیز عورتوں کے واسطے اوقات کار گیارہ گھنٹے مقرر کئے گیے، اور ان کو رات کو کام کرنے کی ممانعت کردی گئی، (لیکن اس استثنا نے کہ جہاں باری سے کام کرنے کا طریقہ ہو اور کارخانوں کا مقامی ناظر اس کی اجازت دے دے، اس دفعہ کے فوائد سے محروم کردیا) اس قانون میں صفائی اور کارخانوں کے معاینے کی نسبت بھی چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

لیکن جہاں قانون نافذ بھی تھا وہاں اس کا انطباق بہت ہی محدود قسم کا تھا مثلاً ۱۸۹۱ء سے پہلے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ قانون کا اطلاق صرف ان کارخانوں پر ہوتا تھا جہاں سو یا اس سے زائد آدمی کام کرتے ہوں، حالانکہ دراصل برائیاں چھوٹے کارخانوں میں زیادہ ہوتی ہیں دوسری مشکل یہ تھی کہ قانون کا اطلاق صرف ان کارخانوں پر ہوتا تھا جو سال میں چار ماہ سے زائد کام کرتے ہوں اس دفعہ کی وجہ سے ہنگامی صنعتوں کا بڑا حصہ مثلاً روئی دابنے اور اوٹنے والے کارخانے یا چاول صاف کرنے والی گرنیاں اس قانون کی زد سے بچ گیئں۔

اس کے برخلاف معدنیات میں مزدوروں کے لیے کوئی قانون موجود نہ تھا، عام طور پر عورتیں تمام کانوں اور بالخصوص بنگال میں کثیر تعداد میں کام کیا کرتی تھیں، اور اندیشہ یہ تھا کہ کہیں قانونی مداخلت اس صنعت کی ترقی کو جو ابھی ابتدائی مدارج میں ہے نقصان نہ پہنچا دے[1] بس

---

[1] معدنیات میں عورتوں اور بچوں کی ملازمت، مراسلت وغیرہ پارلیمنٹری دستاویز (۱۸۹۳ء)

جہاں تک حکومت کا مزدوروں کے اوقات کار کو منظم اور باضابطہ کرنے کا تعلق تھا، ہندوستان کی جدید صنعتوں کا بڑا حصہ اس کے دائرے سے خارج رہا۔ اور ۱۸۹۱ء کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوانین کارخانہ کسی حد تک کارآمد ہو گئے۔

تحقیقات سے ہندوستان میں کارخانے کے مزدوروں کی حالت پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ در اصل محض قانون کا نفاذ کوئی اہم چیز نہ تھی، صرف بمبئی اور بنگال میں تھوڑی بہت کارخانوں کی صنعتیں قایم تھیں، ان کے علاوہ تمام دوسرے صوبوں نے اپنی رپورٹوں میں اس امر پر زور دیا کہ صنعتیں اس قدر مختصر ہیں کہ ان کے لیے کسی علاحدہ قانون کی ضرورت ہی نہیں[1] یکساں ضابطوں کی تو کمی تھی مگر حالات میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر بڑا اختلاف تھا۔

بمبئی کی گرنیوں میں اٹھارہ سال سے زائد عمر والے مردوں کے لیے اوقات کار ½12 اور اٹھارہ سال سے زائد عمر والی عورتوں کے لیے ½11 گھنٹے، نوجوانوں یعنی چودہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کے لیے بھی اوقات وہی تھے جو بڑے مردوں کے تھے، سات سے بارہ سال تک کے بچوں کے لیے 9 گھنٹے مقرر تھے[2] بڑی بڑی گرنیوں میں اوسطاً یہی اوقات رائج تھے مگر کام کی زیادتی کے زمانے میں ان میں اضافہ ہو جاتا تھا، گرنیوں میں برقی روشنی کے رواج سے پہلے ان گھنٹوں پر قدرتی بندشیں موجود تھیں یعنی موسم گرما میں

---

[1] ہندوستانی قوانین کارخانہ کے اثرات کا اندازہ لگانے والی رپورٹ، (۱۸۹۰ء) (پارلیمنٹری دستاویز)۔

[2] ۱۸۹۰ء میں یہی اوقات تھے، بچوں کے کام کے گھنٹے قانون سے منضبط کئے گئے، یہ اعداد مندرجہ بالا پارلیمنٹری دستاویز کی بمبئی والی رپورٹ کے ایک نقشے سے لیے گئے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ ۱۴ گھنٹے کام کیا جا سکتا تھا، ۱۸۸۱ء سے قبل بچے بھی بڑے آدمیوں کے برابر کام کرتے تھے، مگر ۱۸۸۱ء کے قانون نے ان کے لیے نو گھنٹے مقرر کر دیے، پھر اکثر جگہ تو آئین کا نفاذ نہ تھا، نیز ان میں مختلف حیلوں سے بھی کام لیا جاتا تھا، مثلاً صوبجات متوسط کی ۱۸۹۰ء والی رپورٹ قانون کارخانجات میں بیان گیا ہے کہ جبل پور کی گرنی میں بڑوں اور بچوں دونوں کو طلوع آفتاب سے غروب تک کام کرنا پڑتا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ بڑے آدمیوں کو دوپہر کو نصف گھنٹے کی چھٹی ملتی تو بچوں کو ایک گھنٹے کا وقفہ مل جاتا تھا، جہاں تک عورتوں کے اوقات کار کا تعلق تھا وہ بمبئی کی صنعتوں میں مردوں کی بہ نسبت کچھ کم ہوتے تھے، لیکن بالائی ملک کی گرنیوں میں ان کے اوقات بھی عام طور پر مردوں کے برابر ہوتے تھے، اگرچہ مزدور ان طویل اوقات کار کی شکایت نہ کرتے تھے لیکن وہ کم از کم ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ضرور چاہتے تھے، بمبئی کے کارخانوں میں مزدوروں کو تمام سال میں صرف پانچ پورے دنوں کی چھٹی ملا کرتی تھی[1] ان گرنیوں میں جہاں ہفتہ واری چھٹیوں کا انتظام تھا وہاں بھی یہ دستور تھا کہ مزدور آدھے دن کے لیے گرنی آکر مشینوں وغیرہ کی صفائی کیا کریں، کتائی اور بنائی کی گرنیوں میں اتنی زائد خرابیاں نہ تھیں جتنی خراب صورت حال روئی اوٹنے اور دابنے والی گرنیوں میں تھی، اور ان میں خاندیش کی حالت سب سے بدتر تھی، ۱۸۹۰ء کے کمیشن کارخانے کے سامنے جو شہادت پیش کی گئی وہ بڑی ہی افسوسناک قسم کی تھی، ایک شاہد نے بیان کیا کہ "مارچ سے اپریل تک کام کی زیادتی کے زمانے میں اکثر اوقات روئی دابنے اور اوٹنے والی گرنیاں

---

[1] یم، انسپکٹر کارخانہ جات کی رپورٹ، (۱۸۸۶-۸۷ء) مسٹر جونس کا نوٹ "ہندوستان کے کارخانوں کی حالت" پر، نیز بمبئی ولنکاشائر کی کتائی کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے مسٹر گوکر کی شہادت

رات اور دن کام کرتی ہیں، اور ایک ہی مزدور کو دونوں وقت کام کرنا پڑتا ہے اور صرف شام کو اسے نصف گھنٹے کا وقفہ دیا جاتا ہے، بلکہ کام کرنے والوں کی یہ ٹولی آٹھ روز تک مسلسل دن اور رات کام کرتی رہتی ہے[1]"۔ یہ صورت اس لیے اور زیادہ بری تھی مزدوروں کی بڑی تعداد عورتوں پر مشتمل ہوتی تھی، ایک دوسرے گواہ نے بیان کیا کہ "عورتوں کو مشین کا ایک پرزہ سمجھا جاتا ہے، اور وہ کارخانے کا ایک جزو خیال کی جاتی ہیں، اگر تیئیس گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ دو یا تین گھنٹے کے لیے غائب ہو جائیں تو یہ ایک طویل عرصہ ہوتا تھا جس کی ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی تھی[2]۔ آٹھ روز تک اس طرح مسلسل کام کرنے کے بعد" یہ گرنیاں مجبور ہوتی ہیں کہ بمبئی سے دوسرے آدمیوں کی ٹولی بلا کر کام کریں[3]"۔ خاندیش کی روئی اوٹنے والی صنعت کے متعلق دوسری شہادتیں بھی اسی نوعیت کی تھیں۔

چھوٹے کارخانوں میں جو حالت اوقات کار کی تھی اسی طرح ان کی صفائی اور روشنی و ہوا کے انتظامات بھی بدترین تھے، بڑے کارخانوں میں جن میں سے اکثر قانون کی تعریف میں داخل تھے، صفائی، ہوا اور روشنی کا کافی انتظام تھا اور مشینوں کی احاطہ بندی بھی تھی، لیکن ان بڑے کارخانوں کے علاوہ حالات اتنے اچھے نہ تھے، ان بدعنوانیوں کے بدترین مجرم بمبئی کے روئی اور اون صاف کرنے والے کارخانے تھے، ان میں سے ایک کے متعلق کرنل میڈ کنگ رقمطراز ہیں کہ "میرے خیال میں یہ جگہ (کیونکہ وہاں ہوا اور روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا) انسانوں کے کام کرنے کے لیے تو قطعی غیر موزوں ہے[4]۔" چھوٹی گرنیوں اور کارخانوں کے متعلق وہ مزید کہتے ہیں "جن

---

[1] [2] [3] بمبئی کمیشن کی رپورٹ صفحات ۱۱، ۱۳ (۱۸۸۵ء)

[4] مراسلہ جناب کرنل میڈ کنگ (ناظر کارخانجات) بنام حکومت بمبئی جولائی ۱۸۸۲ء

کارخانوں کا معاینہ کیا، ان میں سے دو تہائی میں، میں نے مشینوں کو خطرناک اور بعض صورتوں میں بے حد خطرناک حالت میں دیکھا، کلیں پٹے اور دندانے دار بڑے پہیے بلا کسی جنگلے وغیرہ کے تھے، اور سب سے زیادہ تعجب خیز چیز یہ ہے کہ حادثوں کی تعداد اس سے زیادہ نہیں ہے جتنے کہ وہ ہوتے ہیں[1]۔ لیکن وہ اضافہ کرتے ہیں کہ "میں اس نتیجے پر پہنچنے میں مجبور ہوں کہ ہوا اور روشنی کی کمی اور مہلک دھول اور گیسوں کو خاص ذریعے سے دور کرنے کی ترکیب، مشینوں کے ارد گرد جنگلا لگانے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے"۔ اس وقت صوبہ بمبئی میں جو خرابیاں موجود تھیں وہ خاص طور پر چھوٹی اور غیر منظم صنعتوں میں زیادہ تھیں، اور یہاں حالات واقعی افسوس ناک تھے۔

کارخانوں کے متعلق کسی قسم کی بھی قانون سازی کی غالباً سب سے زیادہ مخالفت بنگال کے تجارتی ایوان نے کی، اور سر ایشلے ایڈن جو اس وقت بنگال کے گورنر تھے انھوں نے ویسرائے کی کونسل میں شدت سے مسودے کی مخالفت کی، اس طرز عمل کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کام کے حالات بنگال میں اور بالخصوص کلکتے کی جوٹ کی صنعت میں سب سے بہتر تھے، گرنیاں چلانے کے باضابطہ اوقات تو کلکتے میں بھی وہی تھے جو بمبئی میں تھے یعنی طلوع آفتاب سے غروب تک، لیکن کلکتے کی گرنیاں ایک پیچیدہ بدل ٹولی کے طریقے پر عمل پیرا تھیں اور اس طرح کام کرنے والوں کو انفرادی طریقے پر اوسطاً نو یا زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا، البتہ بننے والے اس اصول سے مستثنیٰ تھے جو سارا دن کام کیا کرتے تھے۔

بنگال کے مزدوروں کو ہفتے میں اتوار کے روز پورے دن کی

---

[1] مراسلہ جناب کرنل ہیا کنگ (ناظر کارخانجات) بنام حکومت بمبئی جولائی ۱۸۸۲ء

چھٹی بھی ملتی تھی، اور اس میں کلام نہیں کہ اس سے مزدور طبقے کی صحت پر اچھے اثرات مترتب ہوئے کارخانوں کی اندرونی حالت بھی اچھی رکھی جاتی تھی اور عام طور پر صفائی، روشنی، ہوا کا انتظام اور مشینوں پر جنگلا لگانے کا رواج تھا[1]۔ ایک اور چیز تھی جس میں بنگال کا مزدور اپنے بمبئی کے بھائی کے مقابلے میں بہتر تھا، یہ اجرتوں کی روئی کا طریقہ تھا، کلکتے میں اجرتیں ہفتہ وار ادا کی جاتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ ہفتے میں تین دن کی اجرت روک لی جاتی تھی، لیکن بمبئی میں ماہوار اجرت ادا کرنے کا طریقہ رائج تھا اور تقریباً تین ہفتوں کی اجرت بقایا رکھی جاتی تھی[2]۔ اس خصوص میں تو شہر بمبئی کی حالت ہی ابتر تھی کیونکہ احمد آباد میں بھی ہفتہ وار اجرت ادا کرنے کا طریقہ تھا۔

اس زمانے میں بمبئی کے دو کمیشنوں کی طرح بنگال میں مزدوروں کی حالت کی تحقیقات کے واسطے کوئی کارروائی نہیں ہوئی، لہذا یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ جوٹ، داہنے اور بالائی ملک کی دوسری صنعتوں میں واقعی حالات کیا تھے، وہ بڑے کارخانوں کے مقابلے میں کمتر ضرور ہوں گے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ اتنے ہی خراب تھے جیسے کہ خاندیش کی روئی اوٹنے والی صنعت کا حال تھا، اور یہ اس لیے زیادہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ بنگال میں آسانی سے استحصال ہونے والے مقامی مزدوروں کی رسد بمبئی دکن جیسے غریب صوبے کے مقابلے میں کم تھی، دوسرے منتشر اور چھوٹے کارخانوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، یہاں کے حالات کا انحصار زیادہ تر منتظم یا مالک

[1] جوبیس پرگنے کے مجسٹریٹ کی رپورٹ، ملاحظہ ہو، قوانین کارخانہ کے اثرات کی رپورٹ (۱۸۹۰ء)
[2] یہ طریقہ اب تک رائج ہے، اور بمبئی کے کارخانوں کے مزدوروں کی قرض داری کا بڑا سبب یہی ہے، ملاحظہ ہو، "ہندوستانی امداد باہمی کا مطالعہ" مضمون نمبر ۴ "کارخانوں کے مزدوروں میں امداد باہمی" از مسیز ز دیو دھر اور جوشی، (سنہ ۱۹۳۰ء)۔

کی انفرادی حیثیت اور ملحقہ اضلاع میں زرعی مزدوروں کی عام حالت پر ہوا کرتا تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوقات کار اور حالات یہاں بھی کم و بیش ایسے ہی تھے جیسے کہ بمبئی کی روئی کی صنعت میں، اور بعض جگہ صورت حال اس سے بھی خراب تھی۔

اس کے بعد کوئلے کی کانیں تھیں جہاں کسی قسم کا قانون جاری نہ تھا، بنگال میں عورتیں اور بچے بڑی کثرت سے زیر زمین کام کرتے تھے، صوبہ جات متوسط میں جہاں زیادہ تر مزدور صوبہ جات شمال و مغربی سے نقل وطن کر کے آتے تھے وہاں بہت کم عورتیں ملازم تھیں، اور یہاں اس رائے کی زیادہ موافقت تھی کہ عورتوں کو کانوں میں کام کرنے کی قطعی ممانعت کر دی جائے، لیکن بنگال میں اس قسم کی مداخلت کا کوئی مشورہ بھی گرم مباحثے کا باعث ہو جاتا تھا، یہاں خاندانی محنت کا طریقہ جاری تھا، یہاں کے مزدور بیشتر سنتھال اور بوری کے مقامی قبیلوں پر مشتمل تھے، وہ اپنی عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتے تھے، مرد کوئلہ کاٹتے اور عورتیں اس کو ڈھویا کرتی تھیں، اور اب تک یہاں شمال مغربی صوبوں سے مزدور لانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی تھی لیکن اب چونکہ صنعت میں تیزی سے فروغ ہو رہا تھا لہٰذا مزید مزدوروں کی ضرورت کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا تھا[1]۔

---

[1] بنگال کے مزدوروں کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ (سنہ ۱۸۹۶ء)۔

برطانوی ہند کے زرعی شماریات

(رقبہ ہزار ایکڑوں میں)

	سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء	سنہ ۱۹۰۱-۲ء	سنہ ۱۹۰۶-۷ء	سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء
غیر مزروعہ (افتادہ)	۳۰,۱۸۳	۴۲,۱۴۷	۳۹,۹۳۵	۴۸,۷۶۰	۵۲,۶۲۰
رقبۂ مزروعہ	۱,۹۶,۶۰۱	۱,۹۹,۷۰۸	۲,۱۴,۲۲۶	۲,۲۴,۱۶۶	۲,۱۹,۱۹۲
رقبۂ زیر آب	۲۳,۸۲۵	۳۲,۵۸۲	۳۶,۶۵۴	۴۵,۵۳۹	۴۶,۸۳۶
چاول	۶۹,۲۸۰	۷۰,۰۷۶	۷۳,۵۴۱	۷۸,۷۵۲	۷۶,۹۰۸
گیہوں	۲۲,۷۶۱	۱۸,۶۰۷	۲۵,۱۳۶	۲۳,۸۹۱	۲۲,۶۸۵
جوار	۲۰,۸۶۳	۲۱,۸۱۹	۲۰,۷۸۱	۲۰,۹۶۸	۲۱,۴۰۵
باجرہ	۱۱,۳۳۷	۱۳,۱۹۷	۱۵,۰۳۴	۱۶,۲۴۹	۱۵,۳۸۵
اشیائے خوردنی کا کل رقبہ	۱,۸۱,۵۷۶	۱,۷۶,۹۹۹	۱,۹۵,۱۱۷	۲,۰۱,۳۴۳	۱,۹۱,۵۷۳
نیشکر	۲,۸۸۹	۲,۵۹۶	۲,۶۲۴	۲,۷۱۲	۲,۷۰۸
روغنی تخم	۱۳,۹۳۰	۱۱,۹۶۵	۱۳,۹۶۵	۱۴,۹۳۶	۱۴,۹۵۸
کپاس	۹,۷۱۷	۱۰,۲۹۹	۱۳,۷۷۱	۱۴,۱۳۸	۱۵,۸۴۴
جوٹ	۲,۲۷۵	۲,۲۷۸	۳,۵۲۳	۳,۳۲۴	۳,۱۳۶
چارے کی فصلیں	۱,۹۳۱	۲,۹۴۴	۴,۵۴۸	۵,۷۷۰	۵,۹۱۰
نیل	۱,۷۰۵	۷۹۲	۴۴۹	۲۲۷	۱۹۹
چائے	۴۱۴	۴۹۵	۵۰۵	۵۵۸	۵۷۲

بابِ ہفتم

مزارعین ۱۸۹۵ء لغایت ۱۹۱۴ء

قحطوں سے نسبتاً اس کا مسلسل پندرہ سالہ دور یکایک ۱۸۹۵ء میں ختم ہوگیا، اس سال کے بعد سے ہندوستان میں قحطوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو اپنی شدت کے اعتبار سے بہت سخت تھے، دو شدید قحط یکے بعد دیگرے تیزی سے واقع ہوئے اور انھوں نے انیسویں صدی کے آخری سالوں کو ہندوستان کی زرعی تاریخ میں بدترین زمانہ بنا دیا۔

۹۷-۱۸۹۶ء کا قحط کم و بیش سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، صرف زیریں برما اور جزیرہ نما کا انتہائی جنوبی حصہ ہی خشک سالی سے متاثر نہ ہوا[1] اراکین قحط کمیشن نے ۱۸۸۰ء میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ۷۸-۱۸۷۶ء کا قحط صدی کا شدید ترین قحط تھا لیکن ۹۷-۱۸۹۶ء کا قحط بھی وسیع علاقے پر پھیلا ہوا تھا اور اسی کی طرح شدید تھا، اس قحط کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس سے وہ علاقے بھی متاثر

---

[1] ٹی، ڈبلیو، ہولڈرنس. ۹۷-۱۸۹۶ء کے قحط کا بیان، (پارلیمنٹری دستاویز)

ہوئے جو اپنے آپ کو قحطوں سے آزاد سمجھ چکے تھے، چنانچہ برار کی بھی صورت رہی، وہاں گزشتہ ۴۰ سال سے کوئی قحط نہیں پڑا تھا وہ ایک طرح سے مطمئن تھا اور قحط کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔[1] جن لوگوں کی اعانتی طریقوں سے مدد کی گئی ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن جس طریقے پر اس مرتبہ کام شروع کیا گیا وہ گزشتہ بڑے قحط ۱۸۷۶ء۔۱۸۷۸ء کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور منظم تھا۔ اس دفعہ نگراں عہدہ داروں کو رہبری کا فائدہ رہا کیونکہ ان کے سامنے ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے مجوزہ طریقے موجود تھے اور ان سے اس قحط میں بحیثیت مجموعی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا گیا، اور ۱۸۹۸ء کے قحط کمیشن نے ان میں صرف تھوڑی سی جزوی ترمیمات کی سفارش کی، اور وہ بھی خاص طور پر امداد کنندوں کے ساتھ زیادہ فیاضانہ سلوک کے متعلق تھی، لیکن یہ ایک لازمی امر تھا کہ امدادی کام ہر جگہ یکساں پیمانے پر نہیں چل رہے تھے، چنانچہ کمیشن نے محسوس کیا کہ بعض صوبہ جاتی حکومتوں اور بالخصوص حکومت بمبئی کا طرزِ عمل امداد دینے کے طریقوں اور لگان وغیرہ کی معافی میں فیاضانہ نہ تھا۔[2]

لیکن ان کمشنروں کی رپورٹ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے، جس میں انھوں نے ۱۸۹۸ء میں زرعی طبقوں کی حالت کا اندازہ لگایا، نیز یہ بھی بتایا کہ ۱۸۸۰ء۔۹۵ء کے اچھے دور میں ان لوگوں نے کس حد تک ترقی کی، انھوں نے اندازہ کیا کہ ہندوستان میں مجموعی حیثیت سے پٹہ دار اور کاشتکار طبقے کی آمدنی میں عام قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے کافی اضافہ ہوا" ان کے آرام اور اخراجات دونوں کا معیار

[1] ۱۸۹۹ء-۱۹۰۰ء کے قحط میں گجرات کی بھی یہی حالت رہی، یہ علاقہ ۱۸۱۲ء سے قحطوں سے محفوظ تھا۔
[2] ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ، ابواب چہارم پنجم (۱۸۹۸ء)۔

بڑھ گیا، اس وجہ سے ان میں قحطوں کے بار کو برداشت کرنے کی صلاحیت بھی بڑھ گئی"۔ لیکن ساتھ ہی ان کی رائے تھی کہ "یہ امر مشتبہ ہے کہ انھوں نے کفایت شعاری میں بھی کوئی قدم آگے بڑھایا، یعنی کچھ سرمایے میں بھی اضافہ کیا۔ لیکن چونکہ قحطوں کا بار برداشت کرنے کی عام صلاحیت بڑھ گئی اس لیے ایک اہم تحفظ جو عہد قدیم میں اس قسم کی مصیبتوں میں رائج تھا اب متروک ہو گیا۔" تجارت برآمد اور ذرائع نقل وحمل کی ترقی نے غلے کے جمع کرنے کے دستور کو ختم کر دیا، یہ وہ رجحان تھا جو عموماً زراعت پیشہ لوگوں میں ایسے زمانے میں پیدا ہو جایا کرتا تھا" لیکن ان کی رائے ہے پٹہ دار اور کاشتکار طبقے نے اشیائے خوردنی کی قیمتوں کے اضافے سے فائدہ اٹھایا تو روزانہ کام کرنے والے زرعی مزدوروں کے لیے یہ صورت ممکن نہ تھی، اور یہ ایک ایسا طبقہ تھا جس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اسی کے ساتھ صناعوں کے نچلے طبقوں کے متعلق کمشنروں کا بیان ہے کہ "گزشتہ بیس سال میں ان لوگوں کی اجرتوں میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوا جس نسبت سے ان کی ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھ گئیں" آگے چل کر وہ کہتے ہیں "سماج کا یہ طبقہ نیم فاقہ کشی کی زندگی گزار رہا تھا" ان کا معیار زندگی بہت ہی ادنیٰ تھا اس وجہ سے بری فصلوں اور موسم کی خرابیوں کا بڑی جلدی شکار ہو جاتا تھا" حالیہ قحط کا تجربہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ ان کے پاس کسی قسم کے معقول ذرائع تھے نیز اس طبقے کی وسعت کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ بجائے کم ہونے کے ان میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اور گنجان اضلاع میں یہ خصوصیت زیادہ نمایاں تھی"

ان نتائج کو اس وقت اور زیادہ تقویت ہو جاتی ہے جب وہ ہندوستان کے مختلف طبقوں کی صوبہ واری تفصیلات بیان کرتے ہیں ۱۸۷۳-۷۴ء کے بعد بنگال میں عام طور پر لوگوں کی قوت برداشت میں اضافہ ہوا

لیکن جہاں تک بہار کے چھوٹے کاشتکار اور مزدور طبقے کا حال تھا اس کو اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بمدراس کے وہ دکنی اضلاع، جہاں خشک سالیاں عام تھیں، ۱۸۷۶ء سے قبل اپنی حالت سدھار رہے تھے لیکن ۱۸۷۶-۷۷ء کے قحط نے ان کو سخت نقصان پہنچایا اور بالکل کنگال کر دیا۔ اور اس کے بعد سے انھوں نے جو کچھ ترقی کی اس کی رفتار بہت ہی سست تھی، اور مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی خاص ترقی یا تنزل نہیں کیا، جہاں تک صوبۂ بمبئی کا تعلق تھا، حکومت بمبئی کا خیال تھا کہ گزشتہ قحط نے دکن اور جنوبی مرہٹواری علاقے کے کاشتکاروں کی قوت برداشت کو بڑھا دیا، لیکن اس کے متعلق کمشنر لکھتے ہیں کہ "ہم رائے پر کوئی تبصرہ کرنے سے تو معذور ہیں، لیکن ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ صورت حال کا یہ بہت ہی امید افزا پہلو ہے" صوبہ جات شمال و مغرب کی حکومت نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ زراعت پیشہ طبقے، یعنی کاشتکار اور خود کاشت زمیندار دونوں نے اپنی حالت کو بڑی حد تک سدھار لیا ہے لیکن اس عام خوش حالی میں مزدور طبقے کا کوئی حصہ نہیں لیکن جب قحط کمشنروں نے اس کا اطلاق جمنا کے جنوبی کاشتکاروں اور خود کاشت زمینداروں پر کیا تو ان کو ترقی کی کوئی علامات نظر نہ آئیں، صوبہ جات متوسط کی حکومت کا بھی یہی خیال تھا کہ کاشتکاروں نے اپنی حیثیت کافی مضبوط کر لی ہے، لیکن قحط کمشنروں کو یہاں بھی اختلاف کرنا پڑا، وہ کہتے ہیں کہ "اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ بہت سے پرانے مالگزار اور کاشتکار قرضے میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، اور باقی ماندہ لوگ خوش حالی کے زمانے میں بمشکل اپنی حیثیت کو برقرار رکھ رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ مزدور پیشہ معمولی سالوں میں بڑی مشکل سے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے پاس برے سالوں کے لیے کوئی رقم پس انداز نہیں ہوتی اور

نہ ان کی قوتِ برداشت میں کوئی اضافہ معلوم ہوتا ہے"۔ پنجاب میں حالات نسبتاً بہتر تھے، ذرائع آبپاشی نئے جو پہلے موجود نہ تھے اب صوبے کے بڑے حصے کو محفوظ کر دیا تھا، اور کاشتکار اچھے خاصے خوشحال ہو گئے تھے، لیکن گنجان آبادی والے اضلاع میں چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم اراضی اور قرضداری بہت عام تھی۔ "اس صوبے کے مزدور پیشہ بڑی تکلیف میں ہیں، اور بمشکل اپنی آمدنی کا کچھ حصہ پس انداز کر سکتے ہیں[1]۔"

اس قحط کمیشن کے نتائج کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ لوگوں کی خوش حالی کے مسئلے پر اس کی رائے خصوصیت سے بڑی مستند ہے، نیز اس سے اس امر کا بھی پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے کثیر حصے کا کس طرح موسم پر دار و مدار ہوتا ہے سنہ ۹۷-۱۸۹۶ء کا قحط ہندوستان کے زرعی طبقوں کے لیے ایک حادثۂ عظیم تھا لیکن صرف یہی نہیں ہوا بلکہ لوگ ابھی اس کے اثرات سے پوری طرح عہدہ برا بھی نہ ہوئے تھے کہ ہندوستان کے بڑے حصے میں ایک دوسری خشک سالی شروع ہو گئی سنہ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کا قحط اگرچہ اتنا وسیع نہ تھا تاہم شدید ضرور تھا، ان سالوں میں بنگال اور برما میں چاول کی فصل اچھی رہی، اس کے علاوہ صوبہ جات شمال و مغرب، اودھ اور پنجاب بھی اس سے زیادہ متاثر نہ ہوئے، جنوبی ہند میں صوبۂ مدراس کو اس کا بڑا انتظار ہونا پڑا لیکن اس کا سب سے زیادہ شدید اثر صوبۂ بمبئی، صوبہ جات متوسط و برار، اور ممالک محروسہ سرکار عالی کے بڑے حصے اور وسط ہند کے وسیع علاقے پر ہوا[2] اور لطف یہ ہے کہ جہاں مصیبت تھی وہیں اس کی

91

---

[1] اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو قحط کمیشن کی رپورٹ، ابواب اول، دوم، سوم (سنہ ۱۸۹۸ء)

[2] سنہ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کے قحط اور اس کے امدادی کاموں کے متعلقہ کاغذ نمبر ا سنہ ۱۹۰۰ء (پارلیمنٹری دستاویز)۔

شدت ہمیشہ سے زیادہ سخت تھی، خصوصاً ان صوبوں علاقوں میں جہاں ۹۷-۱۸۹۶ء کا قحط بھی شدید صورت میں رونما ہوا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کا قحط اتنے بڑے علاقے پر پھیلا ہوا نہیں تھا جیسے کہ وہ گزشتہ قحط (۹۷-۱۸۹۶ء اور ۷۷-۱۸۷۶ء) تھے، لیکن قحط سے متاثر ہونے والوں کی تعداد اس مرتبہ تمام سابقہ قحطوں کے مقابلے میں زیادہ رہی، اور امدادی کاموں پر تقریباً ۱۵ کرور کی رقم صرف ہوئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کثیر رقم صرف ہونے کی ایک وجہ فیاضانہ امداد اور جانچ پڑتال کی غفلت بھی تھی، چنانچہ اس کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ امداد کنندگان کا فی صد ہر ضلع میں مختلف رہا حالانکہ جہاں تک عام مصیبت کا تعلق تھا وہ ہر جگہ مساوی ہی تھی، مثلاً صوبہ جات متوسط کے ضلع بیتول میں کل آبادی کے ۴۰ فی صد حصے کی امداد کی گئی لیکن اس سے ملحق اضلاع میں یہ فی صد بہت کم تھا، چنانچہ یہی سبب تھا کہ قحط ختم ہونے کے بعد لوگوں نے امدادی کاموں کو اس آسانی سے نہیں چھوڑا جیسے کہ سابقہ قحطوں میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کو امدادی کاموں میں شرح اجرت بہت اعلیٰ مل رہی تھی، لیکن اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ دو مسلسل قحطوں کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی وجہ سے لوگوں میں یہ اعتماد باقی نہ رہا کہ اب اچھا زمانہ شروع ہوگیا ہے جیسا کہ پہلے ہوجاتا تھا، دوسرا قحط مویشیوں کی کثیر ہلاکت کے سلسلے میں خاص امتیاز رکھتا ہے[1] اور یہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ ہندوستانی قحطوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہوا کرتی ہے[2]۔ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کے قحط میں چارے کی

۹۲

---

[1] ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ باب اول (سنہ ۱۹۰۱ء)۔

[2] سب سے بڑی مصیبت جو لوگوں کو برداشت کرنا پڑتی تھی وہ چارے کا قحط ہوتا تھا، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ چارے کی قلت بھی وہیں ہو، جہاں غلے کا قحط ہو، مثلاً سنہ ۱۸۹۶ء میں

فصلوں کا بڑا کال رہا۔ گجرات میں مویشیوں کی ہلاکت تباہ کن رہی، یہ اس لیے اور بھی زیادہ افسوس ناک تھا کیونکہ گجرات کے مویشی ہندوستان کے بہترین اور اصلاح یافتہ نسلوں میں شمار ہوتے تھے اور گجرات کے کاشتکاروں کی عمدہ زراعت کا انحصار ان کے مویشیوں کی اچھی حالت پر تھا، حکومت نے چارے کے قحط کو دور کرنے کی مختلف تدابیر اختیار کیں، بعض جنگل عوام کے واسطے کھول دیے گئے، دوسری صورتوں میں حکومت نے جنگلوں میں گھاس کٹوائی اور اس کے گٹھے عوام کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کیے، صوبہ جات متوسط نے گجرات کو چارے کی بڑی مقدار بہم پہنچائی، لیکن انجن اور گاڑیوں کی کمی کی وجہ سے ان ذرائع سے پورا پورا استفادہ نہ اٹھایا گیا۔[۱]

یہ دونوں قحط حقیقت میں دو بڑی آفتیں تھیں اور ان کے اثرات گوناگوں ہوئے، انھوں نے لوگوں کی تندرستی کو خراب کردیا اور ان کے اخلاق کو گرادیا، انھوں نے عوام کو طاعون اور ہیضے کا لقمۂ تر بنانے میں مدد دی، لیکن جیسا کہ گزشتہ باب میں بتایا جاچکا ہے ان کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ انھوں نے زرعی ترقی کی رفتار کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ تمام تر ترقی جو ۱۸۸۰ء-۹۵ء کے درمیان ہوئی تھی وہ ان پانچ تباہ کن سالوں میں ہندوستان کے بڑے حصے سے غائب ہوگئی زراعت کے دائرے میں ان قحطوں کے دو فوری اثر مترتب ہوئے پہلا دو فصلی رقبے میں تخفیف اور دوسرا اشیائے خوردنی کے بجائے صنعتی یا برآمدی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہی ہوا کہ خریف کی فصل چارے کے اعتبار سے بہت اچھی رہی لیکن اس کی پیداوار بہت کم یا نہ ہونے کے برابر تھی، ڈبلیو ایم مورلینڈ صوبہ جات متحدہ کی زراعت صـ۱۲۲ (۱۹۲۱ء) "اور اس ناگہانی صورت کا کسی بڑی حد تک مدوا کسی ایک کاشتکار کے بس کی بات نہ تھی،" (حوالہ بالا صـ۱۲۳)۔

[۱] ملاحظہ ہوں کاغذات متعلقہ قحط ۱۸۹۹ء-۱۹۰۰ء نمبرات ۸۲-۹۰۔

فصلوں کی کاشت تھی، مثلاً صوبہ جات متوسط میں سوائے روئی کے رقبے میں اضافے کے علاوہ اور تمام فصلوں کے رقبوں میں عام تخفیف ہوگئی، اور خراب فصلوں کے تسلسل کی وجہ سے دو فصلی کاشت کا طریقہ عملی طور پر بالکل ختم ہوگیا[1]۔ صوبہ جات متحدہ میں جہاں سنہ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کا قحط شدید نہ تھا وہاں دو فصلی رقبے میں اضافہ ہوا، مگر گزشتہ قحط کی وجہ سے اس اضافے کی رفتار بہت معمولی تھی، اس قحط کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ کل مزروعہ رقبے میں کمی آگئی چنانچہ صوبہ جات متحدہ اور صوبۂ بمبئی میں یہی صورت پیش آئی، البتہ صوبہ جات متوسط میں یہ صورت اس قدر نمایاں نہ تھی، دوسرا اثر یہ ہوا کہ اشیائے خوردنی کے بجائے برآمدی یا صنعتی فصلوں کی کاشت ہونے لگی یا بعض صورتوں میں زاید منافع بخش فصلوں کے بجائے ادنیٰ فصلوں کی کاشت کی جانے لگی، کیونکہ عموماً ادنیٰ فصلیں سخت جان ہوتی تھیں، مثلاً صوبۂ جات متحدہ میں نیل اور روغنی تخموں کے بجائے بڑی حد تک اشیائے خوردنی کی کاشت ہونے لگی، صوبۂ بمبئی میں بھی یہی رجحان زیادہ نظر آنے لگا، صوبہ جات متوسط میں گیہوں، چنا روغنی تخم اور چاول کے بجائے باجرے کی کاشت زیادہ ہونے لگی، جو ان فصلوں کے مقابلے میں بہت ہی کم نفع بخش تھی، لیکن یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آخر الذکر اثر دیر تک قایم رہنے والا نہ تھا، قحط کے چند ہی سالوں کے بعد جب اچھے موسموں کا آغاز ہوا تو مختلف فصلوں میں خود ہی توازن قایم ہوگیا، مگر یہ بات خارج از کاشت اور دو فصلی رقبے کی تخفیف کے متعلق نہیں کہی جاسکتی، لیکن دراصل قحط کے اندیشے کا نقصان دہ اثر یہ ہوا کہ کاشت کار نے زاید نفع بخش مگر نازک فصلوں کی کاشت ترک کردی نیز کھاد وغیرہ کے ذریعے سے زمینوں کی حالت سدھارنے کی ہمت پست ہوگئی، البتہ ان حصوں میں

[1] ہندوستان کی اخلاقی و مادی ترقی کی رپورٹ، بابت سنہ ۱۹۰۱-۱۸۹۱ء اور سنہ ۱۹۱۱-۱۹۰۱ء زراعت کی فصل۔

جہاں ذرایع آب پاشی کی بدولت موسم کے تغیرات سے ایک گونہ تحفظ ہوگیا تھا ایسا نہیں ہوا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی چودہ سال یعنی آغازِ جنگ تک

خوش قسمتی سے فصلوں پر کوئی ایسی افتاد نہ پڑی جیسی کہ دو مصیبتیں انیسویں صدی کے آخری عشرے میں پیش آچکی تھیں، لیکن اس کے ساتھ ہی موسم کچھ بہت زیادہ سازگار بھی نہ رہے، نئی صدی کے ابتدائی سالوں میں فصلیں زیادہ اچھی نہ ہوئیں، بنگال و بہار میں تقریباً سات سال تک موسم ناموافق رہے، صوبۂ مدراس میں تو پورے عشرے تک حالت اوسط سے کم ہی رہی، اس کے علاوہ منفرداً ان سالوں میں بعض مخصوص صوبوں میں خشک سالی کی شکایت بھی رہی، مثلاً سنہ ۰۳-۱۹۰۲ء میں صوبہ جات متوسط اور سنہ ۰۶-۱۹۰۵ء میں صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں یہی صورت پیش آئی، لیکن اس دہائی کا بدترین سال سنہ ۱۹۰۷ء تھا، اس سال پورے صوبۂ متحدہ میں تباہی رہی اور بڑے پیمانے پر امدادی کام شروع کرنا پڑے، پنجاب، بنگال، صوبہ جات بمبئی اور بالائی برما میں بھی موسم بے حد خراب رہے، اور ان سب صوبوں میں چھوٹے پیمانے پر امدادی کاموں کے واسطے رقمیں منظور کی گئیں لیکن سنہ ۱۹۰۹ء کے بعد سے موسم عام طور پر خوش گوار رہے اور سنہ ۱۹۱۴ء کے ہندوستان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زرعی خوش حالی کے اعتدالی دور میں تھا، اور جہاں تک ہندوستان کے پٹہ دار اور کاشتکار طبقوں کا تعلق تھا تو ان کے متعلق یقین سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ انھوں نے اس نازک مرحلے کو طے کر لیا تھا، جس کا آغاز صدی کے ابتدائی دور میں ہوا تھا، اگرچہ سنہ ۹۵-۱۸۸۰ء کے درمیان کاشتکاروں نے مادی فایدہ حاصل کیا لیکن ان کو قحطوں سے بڑا نقصان بھی پہنچا۔ (زرعی مزدور اس میں شامل نہیں کیونکہ انھوں نے خوش حالی کے زمانے میں بھی کچھ حاصل نہ کیا تھا، اور وہ قطعی طور پر اس طبقے میں شامل تھے جن کو قحطوں کے

۹۴

زمانے میں سب سے زیادہ مصیبت اٹھانا پڑی) گزشتہ پندرہ سال کے عرصے میں کاشتکار طبقے نے جو بحالی حاصل کی تھی وہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں بالکل ختم ہوگئی، و دوسرے قحط کے بعد وہ ایک پست سطح پر آ گئے، لیکن ملک کے بڑے حصے کے ماحول نے ان کو کم و بیش تیزی سے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافے نے جو خصوصیت سے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں نظر آتا ہے پٹہ دار طبقوں کی حالت بہتر بنانے میں بڑی مدد کی، ذرائع نقل و حمل کی توسیع اور زراعت میں بہتر طریقوں کا استعمال، اگرچہ بہت سست تھا، تاہم اس نے حقیقی کاشتکار کو سہارا دیکر اس کی حالت کو اچھا بنا دیا۔

اس موقع پر یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس دور میں مزروعہ رقبے اور فصلوں میں کیا کیا تغیرات ہوئے[1]۔ سنہ ۱۹۰۰-۹۵ء کے پانچ سال تو نظر انداز کر دینا چاہئیں کیونکہ یہ غیر معمولی تھے، اور قحطوں کے زمانے کے تغیرات کسی خاص قسم کے رجحانات کو ظاہر نہیں کرتے، اگرچہ موسموں کی نوعیت کے لحاظ سے سال بسال مزروعہ رقبے میں بڑا فرق ہوتا رہا لیکن مجموعی حیثیت سے رقبۂ زیر کاشت کی کل مقدار میں اضافہ ہوگیا، اضافے کا ایک سبب تو ذرائع آب پاشی کی ترقی تھی، بالخصوص پنجاب میں جہاں نہری نو آبادیوں کا اسی زمانے میں آغاز ہوا، لیکن اسی کے ساتھ ان زمینوں پر بھی کھیتی باڑی ہونے لگی جو کاشت ختم کی حد پر واقع تھیں۔

مزروعہ رقبے میں اضافے کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کل رقبے کا کتنے فی صدی حصہ اشیائے خوردنی کے تحت تھا، سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ ۸۸ فی صدی تھا، اور سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء تک اس کی مقدار یہی رہی

[1] ملاحظہ ہو اس باب سے قبل کی جدول۔

یہ ایک قابلِ لحاظ چیز ہے کہ جب کل رقبۂ کاشت میں اضافہ ہو رہا تھا تو اشیائے خوردنی کا فی صدی رقبہ کیوں مستقل رہا۔ لیکن اس دور کے زرعی اعداد و شمار ہر جگہ اسی قسم کے تناسبی استقلال کو ظاہر کرتے ہیں، سوائے چنے اور چارے کی فصلوں کے استثنا کے کہیں بھی فصلوں کے رقبے میں قابلِ لحاظ اضافہ نہیں ہوا، عام طور پر مختلف فصلوں میں جو اضافہ ہوا وہ کل رقبۂ زیرِ کاشت کے تناسب سے تھا، چاول سب سے زیادہ کاشت والی فصل کی حیثیت سے برقرار رہا۔ تناسب کے لحاظ سے اہم تبدیلی صرف گیہوں میں ہوئی جس کا رقبہ کافی بڑھ گیا، لیکن یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ گیہوں کی کاشت کا رقبہ وسیع تغیرات کے تابع تھا، پہلے دور کی طرح اس دور میں بھی آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کے رقبے میں اضافہ ہونا ضروری تھا، ہندوستان کبھی بڑی حد تک اشیائے خوردنی برآمد کرنے والا ملک نہیں ہے، صرف چاول اور گیہوں ہی دو اہم غلے ہیں جو باہر جاتے ہیں، دالوں کی ساری مقدار اور ادنیٰ غلوں مثلاً باجرے کی کل پیداوار ملک ہی میں رہتی ہے، اور یہیں کی ضرورت کے کام آتی ہے، چاول کی صورت میں بھی ہندوستان کو برما سے الگ سمجھنا چاہیئے، ہندوستان سے جو چاول باہر جاتا ہے وہ دراصل برما کا چاول ہوتا ہے اور اس دور میں برما کے چاول کی یہ خصوصیت رہی کہ وہ کثیر سے کثیر مقدار میں ہندوستان سے باہر جانے لگا تھا، حتیٰ کہ خود بنگال نے بھی برما سے باقاعدہ طور پر چاول حاصل کرنا شروع کر دیا تھا[۱]؛ دوسرا غلہ گیہوں تھا، جو خاص ہندوستان

[۱] سنہ ۱۹۳۵ء کے قانونِ ہند میں برما شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کو اصلاحات الگ دی گئیں اور یکم اپریل سنہ ۱۹۳۷ء کو جب اس قانون کا نفاذ ہوا تو برما ہندوستان سے الگ ہو گیا، ہندوستان چاول کی بڑی مقدار برما سے درآمد کرتا تھا چنانچہ جب سنہ ۱۹۴۲ء میں جاپان نے برما پر

کی برآمد ہونے والی ایک اہم فصل تھی، مگر متوسط سالوں میں بھی کل پیداوار کا دس فی صدی سے زائد حصہ باہر نہ جاتا تھا۔[1] گیہوں کی برآمد میں بڑے تغیرات ہوتے رہتے تھے اور ہندوستان میں معمولی سی قحط سالی بھی برآمد کو روک دینے کے لیے کافی ہوتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اچھے سالوں میں ہندوستان سے غلہ برآمد ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندوستان اشیائے خوردنی برآمد کرنے والا ملک ہے، بلکہ اس برآمد کو قحط کے زمانے کا ذخیرہ سمجھنا چاہئے سازگار سالوں کی زاید پیداوار جو پرانے زمانے میں جمع کردی جاتی تھی اب برآمد ہونے لگی تھی اور متوسط سال میں ملک کی ضروریات کے علاوہ جو کچھ تھوڑا سا مزید رقبہ زیر کاشت تھا وہ دراصل موسموں کے تغیرات کے واسطے ایک تحفظ تھا چنانچہ اس بات کی تصدیق ان اعداد سے بھی ہوتی ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ نہ صرف گیہوں اور چاول بلکہ جوار، باجرہ، اور دوسرے ادنیٰ غلوں کے رقبے میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، جو ملک سے برآمد نہیں کیے جاتے تھے اس لیے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ اشیائے خوردنی کے رقبے میں اضافہ ضرورت کے لحاظ سے ہو رہا تھا، کیونکہ ملک کی آبادی بڑھ رہی تھی، اس لیے مزید رقبہ جو زیر کاشت آرہا تھا اس کے بڑے حصے پر اشیائے خوردنی کی کاشت ہو رہی تھی، اور کاشتکاروں کا بڑا طبقہ ابھی تک ملک اور مقامی بازار کی ضرورت کے واسطے غلہ فراہم کرنے کے ابتدائی کام میں ہی مصروف تھا۔

۹۶

صنعتی فصلوں میں روغنی تخم اور روئی کے رقبات اہمیت رکھتے تھے، ان پندرہ سالوں میں روغنی تخموں کا رقبہ بتدریج بڑھ گیا تھا،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ قبضہ کرلیا تو معلوم ہوا کہ یہاں برما سے ۱۴ لاکھ ٹن سالانہ چاول آتا تھا اور اس کی وجہ سے ہندوستان پر بڑی مصیبت آئی۔ یہی صورت پٹرول اور مٹی کے تیل کی تھی (مترجم)۔

[1] ایف، نول پیٹن، ہندوستانی گیہوں اور غلوں کے گودام (۱۹۱۳ء)۔

اور مجموعی حیثیت سے سنہ ۱۹۰۱ء کے مقابلے میں اس کا فی صدی بھی کچھ زائد ہو گیا تھا، قدرتی طور پر اس زمرے کی انفرادی چیزوں میں سال بسال بڑے تغیرات ہوتے رہتے تھے، لیکن تین خاص فصلوں یعنی السی و تل، سرسوں اور رائی نے اپنی حیثیت قائم کر لی تھی، دوسری چیزوں میں مونگ پھلی نے اواخر انیسویں صدی کے زوال کے بعد سے اپنی حالت سنبھالنا شروع کر دی تھی مونگ پھلی میں نئی اقسام کی ترویج نے اس کو اپنی حالت بہتر کرنے میں بڑی مدد پہنچائی، روغنی تخم زیادہ تر برآمدی فصل تھے، اور اس زمرے کی بعض چیزوں مثلاً السی اور مونگ پھلی کے لیے تو یہ بات بالکل صحیح تھی۔

روئی کے رقبے میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، لیکن روئی کی کاشت سارے ہندوستان میں ممکن نہ تھی، اس کے رقبے میں جو کثیر اضافہ ہوا اس سے یہ مراد تھی کہ روئی پیدا کرنے والے خطوں میں روئی کے رقبے کا تناسب بڑھ گیا تھا، جوٹ روئی سے بھی زیادہ مخصوص رقبے یعنی صرف بنگال میں محدود تھی، لیکن اس فصل کے تنا ہی رقبے میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا، دوسرے حصوں میں بھی جوٹ کی کاشت کی ترویج کی مختلف کوششیں کی گئیں لیکن ان میں سے بیشتر ناکام رہیں، اور جوٹ بنگال ہی کے محدود علاقے میں پھیلتی رہی، دوسری اہم صنعتی فصلوں مثلاً افیون اور نیل کے رقبوں میں قطعی طور پر تخفیف ہو گئی، اول الذکر میں اس لیے کمی ہوئی کہ حکومت ہند اور حکومت چین کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا تھا اور آخر الذکر کو مصنوعی نیل کی مسابقت سے نقصان پہنچا، چارے کی فصلیں اب زیادہ مقبول ہونے لگی تھیں کاشتکاروں نے یہ محسوس کر لیا کہ ان فصلوں کی کاشت ان کے مویشیوں کی پرورش کے لیے بہت ضروری ہے نیز یہ کافی فائدہ بخش بھی تھیں، اور ان سے فصلوں کی گردش کے فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے تھے، نیشکر کا رقبہ عام طور پر حسب سابق رہا

بلکہ بعض جگہ تھوڑی سی کمی ہوگئی، ۱۸۹۰ء-۱۹۱۰ء کے درمیان اس فصل کے رقبے میں تقریباً بیس فی صدی کمی ہوگئی[1] لیکن اس دور کے آخر میں پھر آہستہ آہستہ جان پڑ رہی تھی، اعداد و شمار سے یہ چیز بڑی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ جہاں تک فصلوں کی پیدائش کا تعلق تھا ہندوستانی زراعت میں اس پندرہ سالہ دور میں بہت ہی کم تغیر ہوا، اشیائے خوردنی جو زیادہ تر مقامی خرچ کے لیے پیدا کی جاتی تھیں بدستور اول درجے پر تھیں اور صنعتی فصلوں میں صرف ان ہی فصلوں میں اضافہ ہوا جن کی عرصے سے کاشت ہو رہی تھی مثلاً روئی، جوٹ اور روغنی تخم، اس کے برخلاف نیل، افیون، اور نیشکر کے رقبوں میں تخفیف ہوگئی، اور اس کی وجہ ہر فصل کے مخصوص اور انفرادی حالات تھے۔

بدقسمتی سے پیداوار کے اعداد موجود نہیں، مویشیوں، ہلوں اور ارابہ جات وغیرہ کے جو اعداد موجود ہیں وہ بھی تخمینی ہیں، لہذا چند سالوں کے تقابل کے واسطے وہ قطعی طور پر غیر کار آمد ہیں، یہاں ہم کو پھر حکومت کے اداروں پر نظر ڈالنا پڑتی ہے تاکہ یہ دیکھیں کہ انھوں نے زراعت کی بہبودی کے لیے کیا طریقے اختیار کیے، کیونکہ اس قسم کی اصلاحات ہمیشہ کسی ملک کی زرعی حالت پر بڑا اثر ڈالتی ہیں، اور حکومت کے محکمے ہی اس قسم کی معلومات کے پرچار کا خاص ذریعہ رہے ہیں، اور یہ طریقہ بہت موزوں بھی تھا، کیونکہ جب کاشتکار یہ دیکھتا کہ عہدہ دار خود کسی جدید کام میں دلچسپی لے رہے ہیں تو وہ بھی اس کی آزمایش کرنے پر تیار ہو جاتا تھا، حالانکہ نتائج کے متعلق وہ ہمیشہ مشکوک ہی رہتا تھا، اگرچہ انیسویں صدی میں حکومتی اداروں کی بدولت نئے پودوں کے رواج اور بعض دوسری

---

[1] ایف، نول، ہیملٹن، حوالۂ گزشتہ۔

اصلاحات کی بنا پر زراعت میں تھوڑی بہت ترقی ہوئی لیکن اس سلسلے میں کوئی اجتماعی اور منظم کوشش نہیں کی گئی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صوبوں میں زرعی محکمے کئی سال سے کام کر رہے تھے لیکن ان میں سنگت اور سب سے اہم چیز مستقل ماہرین کی کمی نے ان کو موثر طریقے پر ٹھوس کام نہ کرنے دیا، ان منتشر طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کا کام سب سے پہلے لارڈ کرزن کے عہد حکومت میں شروع ہوا، اور اس سلسلے میں سب سے اہم قدم ۱۹۰۱ء میں اٹھایا گیا جبکہ سارے ہندوستان کے واسطے ایک زرعی انسپکٹر جنرل مقرر ہوا، اس اقدام نے مختلف زرعی محکموں کو پہلی مرتبہ ایک صدر کے تحت مجتمع کر دیا، جو زرعی کاموں میں مہارت بھی رکھتا تھا، اس کے بعد دوسرا قدم ایک زرعی تحقیقاتی ادارے اور چند زرعی صوبہ داری کلیوں اور اسکولوں کا قیام تھا محکمہ زراعت کے بڑھتے ہوئے اخراجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت نے طے کر لیا تھا کہ اٹکل پچو کام کرنے کے بجائے اس سلسلے میں کوئی ٹھوس کام کیا جائے، اس دور کے اختتام تک کام شروع ہوئے صرف ایک عشرہ گزرا تھا، جو اس کے حقیقی نتائج معلوم کرنے کے لیے بہت ہی قلیل مدت تھی، بالخصوص جبکہ محکموں کا عملہ مختصر اور منتشر ہو اور جبکہ اس کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر اخراجات بھی بہت ہی کم ہو رہے ہوں۔

۹۸

روئی کی ترقی کا مسئلہ ہمیشہ سے ہندوستان میں ماہرین زراعت کی خاص دلچسپی کا باعث رہا ہے، اس سلسلے میں بعض نئے پودوں کو رائج کیا گیا، اور صوبۂ مدراس میں دیسی اقسام پر مختلف تجربے کیے گئے، کپاس کی نوعیت میں اصلاح کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ پیش آتی تھی کہ کاشتکار کو خالص قسم کا بیج دستیاب نہ ہوتا تھا[1]

---

[1] کھونڈیا روئی کی تیزی سے ترقی اور پھر اس کی ابتر حالت کی سبق آموز تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو

روئی اوٹنے والی گرنیوں سے بیج حاصل کرنے کے عام رواج نے اس طریقے پر بڑا اثر ڈالا کسی حد تک اس خرابی کو دور کرنے کی یہ کوشش کی گئی کہ بیج کے واسطے مزرعے قایم کیے گئے جو دو کام کرتے تھے ایک طرف تو منتخب اور بہتر اقسام کی کاشت کیا کرتے تھے اور دوسری طرف اچھے قسم کا بیج تقسیم کیا کرتے تھے، لیکن کپاس کی اصلاح میں سب سے زود اثر ترکیب یہ رہی کہ بہتر قسم کی روئی کا بازار پیدا ہو گیا، یہ مختلف اسباب کا نتیجہ تھی مگر اس نے ہندوستانی گرنیوں کی توجہ اس طرف مبذول کردی کہ وہ موجودہ حیثیت سے بہتر سامان پیدا کرنے کی کوشش کریں اگرچہ عمدہ قسم کی روئی کا بازار بھی بہت مختصر تھا، مگر یہ وسعت پذیر تھا، اور اسی میں روئی کی اقسام کو بہتر بنانے کی حقیقی کامیابی مضمر تھی۔

برآمدی فصل کے اعتبار سے گیہوں کی اہمیت بڑھ رہی تھی، لہٰذا قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس قسم کا گیہوں پیدا کیا جائے جو بیرونی بازار کی ضروریات کے مطابق ہو، ہندوستان میں تحقیقاتی کاموں میں سب سے اہم کام یہ ہوا کہ ملک میں پیدا ہونے والے گیہوں کی مختلف اقسام کی جانچ کی گئی اور ان مقاموں کو مخصوص کر دیا گیا جہاں ان اقسام کی بہترین کاشت ہو سکتی تھی، ساتھ ہی ساتھ محفوظ ذخیروں میں گھن لگ جانے اور کیڑوں سے نقصان پہنچنے کا مسئلہ بھی سامنے آیا، اکثر موئیدین نے ہندوستان میں غلے کے لیے بالائی گودام کے طریقے کو رائج کرنے کی رائے دی، لیکن اس کی عملی صورت پر شکوک کا اظہار کیا گیا اور یہ مسئلہ اب تک مشتبہ ہے[1]۔ ۹۹

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جے، میکینا ہندوستان میں زراعت، (۱۹۱۵ء) نیز ہندوستانی روئی کی کمیٹی کی رپورٹ باب ششد ہم (۱۹۱۹ء)

[1] اے اور جی ایل، سی، ہورڈ، ہندوستان میں گیہوں، (۱۹۱۳ء) نیز ملاحظہ ہو ا:۔ نول بیٹین

یہ مختلف مثالیں ہیں، ورنہ مسائل جو توجہ کے محتاج تھے وہ گوناگوں تھے، اور تقریباً ہندوستان کی تمام خاص پیداواروں سے متعلق تھے چاول کی نئی اقسام کے رواج کو بعض حصوں میں کامیابی ہوئی نیز ترقی یافتہ اور جلد تیار ہو جانے والی مونگ پھلی کی اقسام کی کاشت شروع کی گئی، جو بیرونی بازار کے لیے بہت موزوں تھی، آخر الذکر میں کامیاب ترین تجربہ بالائی برما میں مونگ پھلی کی کاشت کا آغاز تھا فصلوں میں اصلاح کے علاوہ ترقی یافتہ آلات اور مصنوعی کھادوں کے متعلق بھی تجربے کیے گئے، گزشتہ صدی کی پے درپے ناکامیوں سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا، اور اب کاشتکاروں کی ضروریات اور اس کی مالی صلاحیتوں کا بھی خیال رکھا جانے لگا ہلکے آہنی ہل اور چھوٹے قسم کے پانی کھینچنے والے نل بھی اکثر حصوں میں رائج ہو گئے، ان گوناگوں کوششوں کی ایک اور مثال صوبۂ مدراس میں سر فریڈرک نکلسن کی نگرانی میں محکمۂ سمکیات کا قیام تھا، مالابار کے ساحل پر امداد باہمی کے اصول پر بڑے اور اصلاح شدہ جالوں کے ذریعے اس کا آغاز ہوا، نیز بہتر طریقوں پر مچھلیاں سکھانے اور سارڈین کا تیل نکالنے اور مچھلی کی کھاد بنانے کے کاروبار بھی قایم ہوئے[1]۔

لیکن جو اصلاحیں ہوئیں وہ کچھ انقلابی نوعیت کی نہ تھیں، اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے محدود تھیں، اور اکثر ان کی پہنچ خود کاشت زمینداروں کے طبقے تک نہ ہوئی تھی، ابھی بہت کام کرنا باقی تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ بھی تھوڑا بہت کام ہوا اس نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ "گیہوں وغیرہ" اور ہندوستانی شاہی زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۴۲ متعاقب (۱۹۲۸ء)۔

[1] دیکھیے سر فریڈرک نکلسن اور مسٹر گوبندن کی شہادت، ہندوستانی صنعتی کمیشن، شہادتی روداد جلد سوم (۱۹۱۶ء-۱۸ء)۔

مزارعین کی حالت میں اصلاح کردی، حکومت کو اصلاحات کی ترویج میں جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے مقامی پٹہ داروں سے تعاون کی استدعا کی، اور اس سلسلے میں یہ حاصل بھی ہو گیا، بعض صورتوں میں اس نے بڑی اچھی صورت اختیار کرلی مثلاً صوبہ جات متوسط اور صوبۂ بمبئی کے اکثر حصوں میں مقامی مالکان اراضی نے خود اپنی جماعتوں کی تشکیل کرلی جنھوں نے زرعی محکموں کے دوش بدوش کام کیا[1]۔ ۱۰۰

غالباً ہندوستان کی زرعی ترقی میں سب سے بڑی دشواری کاشتکاروں کا افلاس رہا ہے اور اس کی مزمن قرضداری اس کے افلاس کا ایک اہم سبب ہے، غالباً اعتبار کو ہندوستان کی زرعی معیشت میں وہی اہمیت حاصل ہے جو پانی کو ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ اب تک ہندوستان میں دیہی اعتبار کو منظم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی، مسٹر جسٹس رانا ڈے نے صحیح طریقے پر اس بات پر زور دیا کہ منظم اعتبار کا فقدان ہی زرعی اور دیہی مصنوعات کی ترقی کی سب سے بڑی دشواری تھی[2]۔ ہندوستانی زراعت کی اصلاح میں کسی فائدے کی امید رکھنا قطعی بیکار ہے جب تک کہ کاشتکار کو اصل کے ہر اس جزو پر جو وہ اپنی زمین پر لگاتا ہے، مہاجن کو غیر منصفانہ شرح سود ادا کرنا پڑتی ہے، اس حقیقت کو بہت عرصے سے محسوس کرلیا گیا تھا اور ساہوکار کو تمام ہندوستانی معاشی مسائل پر لکھنے والوں نے ہوا قرار دیا تھا، لیکن کچھ بھی ہو ساہوکار ہندوستانی زراعت کے کاموں میں ایک اہم حصہ لے رہا تھا، اور جب تک اس کا کوئی اچھا بدل

---

[1] ہندوستان کی زرعی ترقی میں زرعی محکموں کی کوششوں کے اثرات معلوم کرنے والی رپورٹیں ۱۹۰۹ء و ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء زرعی سبھاوں کے لیے ملاحظہ ہو، رپورٹ ۱۹۱۲ء صفحات ۱۱ ، ۱۵۔

[2] رانا ڈے "مضامین" ہندوستان کے دیہی اعتبار کی از سر نو تنظیم" حوالۂ گزشتہ۔

باب ہشتم

صنعتی ترقی ۱۸۹۵ء لغایت ۱۹۱۴ء

۱۸۹۵ء تک جو صنعتیں ترقی کر رہی تھیں، ۱۹۰۰-۱۸۹۵ء کے درمیان ان کو مختلف دشواریاں رہیں[1] تمام ہندوستانی صنعتیں اور بالخصوص وہ جن کا سہارا یا انحصار ملک کی اندرونی مانگ پر ہی ہوتا ہے زراعت کی سقیم حالت سے لازمی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ صنعتوں میں اس قسم کا مساویانہ سقم ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کی ایک اہم خصوصیت تھی لیکن جدید ہندوستان میں بھی جہاں تک اہل حرفہ کی صنعتوں کا تعلق تھا وہی حالت تھی جو پرانے زمانے میں تھی، بڑی صنعتوں میں صرف کوئلہ ہی ایک ایسی صنعت تھی جو ہندوستان کی زرعی تباہی سے کم متاثر ہوئی اور اس کے بعد جوٹ کا درجہ تھا، اس کے برخلاف روئی کی صنعت کا کچھ اور حال تھا، جہاں تک اس کے بنے ہوئے سامان کا تعلق تھا اس کا بازار ہندوستانی تھا، اور گرنیوں میں جو سوت تیار ہوتا تھا اس کا بڑا حصہ ہندوستانی دستی کرگھے چلانے والوں کی

[1] جوٹ کی صنعت بھی اپنی ہندوستانی طلب کے سلسلے میں متاثر ہوئی، کیونکہ اشیائے خوردنی اور دوسری خام پیداواروں کی برآمد کی تخفیف کی وجہ سے تھیلوں کی مانگ پر اثر پڑا۔

طلب پوری کرتا تھا۔ اور ہندوستانی جلاہا کاشتکار کے واسطے موٹے قسم کا کپڑا تیار کیا کرتا تھا اور یہ ایک مشہور بات ہے کہ مصیبت کے دور میں کفایت کے تحت ہندوستانی کاشتکار کی جس چیز پر سب سے پہلے نظر پڑتی تھی وہ اس کا لباس ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ملک کے جلاہے اور زرعی مزدور ہی وہ پہلے لوگ ہوتے تھے جو امدادی کاموں پر پہنچتے تھے، لہٰذا گرنیوں کے تیار شدہ سوت کا بازار زرعی بدحالی کے ہر دور میں گھٹ جاتا تھا، اس لیے ہم کو یہ معلوم ہو کر کچھ زیادہ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ دو شدید قحطوں کے زمانے میں (۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۰ء) روئی کی صنعت کو بھی شدید کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا، قحط اور اسی کے ساتھ دستی بافندوں کی مصیبت نے روئی کی صنعت میں سرد بازاری پیدا کی، لیکن اس کے ساتھ کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے جو اس دور کے نتیجے کے لیے کچھ کم اہم نہ تھے۔

۱۸۹۶ء میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ شدید صورت میں وہ بیماری پھیلی جو عرصۂ دراز سے آبادی کو نقصان پہنچا رہی تھی یہ تازیانہ گلٹی دار طاعون کی شکل میں اس سال پہلی مرتبہ بمبئی میں ظاہر ہوا یہ ہندوستان میں پہلے بھی پڑا تھا، مگر کبھی اس شدید صورت میں رونما ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر بمبئی کی آبادی اس عجیب اور خوفناک عذاب الٰہی سے ڈر کر بڑی تعداد میں بھاگنے لگی، شہر تیزی سے خالی ہونے لگا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ روئی کی صنعت کے مزدور بھی بھاگ کھڑے ہوئے، یہ سب سے پہلا حادثہ تھا، ایک یا دو سالوں کے بعد لوگ اس بیماری کے عادی ہو گئے، اگرچہ یہ شدت سے حملہ آور بھی نہیں ہوئی، اور اب مزدور بھی اس کی آمد سے اتنے ہراساں نہ ہوتے تھے جتنے کہ ابتدا میں ہوئے تھے، پہلے قحط کے بعد طاعون آیا اور طاعون کے بعد دوسرا قحط پڑا، لیکن

۱۰۳

صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ہی دو اور اسباب پیدا ہو گئے سنہ ۱۹۰۲ء میں روئی میں امریکن تخمین کا زور تھا، اس نے روئی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا، اس کے اثر سے گرنی اور دستی کرگھے دونوں صنعتیں متاثر ہوئیں روئی کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے چیزوں کی تیاری اور بالخصوص موٹے کپڑے کی پیدائش جس پر ہندوستانی صنعت کا خصوصیت سے دارومدار تھا، بہت زیادہ غیر منافع بخش ہو گئی۔ دوسرا سبب ہندوستان کے خاص بدیسی بازار یعنی چین میں گڑبڑ کا ہو جانا تھا، ہندوستانی سوت کی بیرونی برآمد کا بڑا حصہ چین جایا کرتا تھا اور وہاں کے بازار کی سرد بازاری کا یہ مطلب تھا کہ کتائی کی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس طرح کساد بازاری کا یہ دور سنہ ۱۸۹۶ء سے سنہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا، اگرچہ درمیان میں تھوڑی سی بحالی کے مختصر دور آئے، لیکن اس کساد بازاری کے باوجود صنعت کی رفتار ترقی کم و بیش غیر منقطع رہی۔

روئی کی صنعت سنہ ۱۸۹۵ء تا ۱۹۱۴ء

	سنہ ۱۸۹۵-۹۶ء	سنہ ۱۹۰۰-۱ء	سنہ ۱۹۰۴-۵ء	سنہ ۱۹۰۷-۸ء	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء
روئی کی گرنیوں کی تعداد	۱۵۰	۱۹۴	۲۰۶	۲۲۷	۲۶۴
مزدوروں کی تعداد	۱,۴۶,۵۵۲	۱,۵۶,۳۵۵	۱,۹۶,۳۶۹	۲,۲۵,۳۶۶	۲,۶۰,۸۴۷
کرگھوں کی تعداد	۳۷,۲۷۸	۴۰,۵۴۲	۴۷,۳۰۵	۶۶,۷۱۸	۹۶,۶۸۸
تکلوں کی تعداد	۳۸,۵۲,۶۱۱	۴۹,۴۲,۲۹۰	۵۱,۹۶,۴۳۲	۵۷,۶۳,۷۱۰	۶۶,۲۰,۵۷۶

اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ کساد بازاری کے ان سالوں میں بھی یہ صنعت ترقی پذیر رہی اعداد سے اس بات کا پتا بھی چلتا ہے کہ اس دور میں تکلوں کی تعداد میں اضافہ کرگھوں کے تناسب سے پھر بڑھا ہوا رہا، اور تکلوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ۹۶-۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان رہا۔ دراصل تکلوں کی ہی بحرانی ترقی بعد کے سالوں میں چین کے بازار میں زائد ذخیرے پہنچانے اور اس کی طلب میں ایک چوتھائی کمی کرا دینے کا باعث ہوئی۔

۱۹۰۵ء میں سرد بازاری ختم ہو گئی، تھوڑی بہت زرعی حالت بحال ہو گئی، صنعتی مرکزوں میں لوگوں کو طاعون کا خوف کم ہو گیا، روئی کی قیمت پھر اپنی معمولی سطح پر آگئی، چین کے ذخیرے خالی ہو گئے، لہٰذا بعد کے دو تین سالوں میں بمبئی کی صنعت میں پھر بے مثل خوش حالی پیدا ہو گئی، گرم بازاری دراصل سوت کی صنعت میں پیدا ہوئی اور کتائی کی گرنیوں نے وافر منافع تقسیم کرنا شروع کیا، سوت کی طلب اس قدر بڑھ گئی اور قیمت اتنی زیادہ نفع بخش ملنے لگی تھی کہ گرنیاں جہاں تک حالات اجازت دیتے، سارے سارے دن چلتی تھیں، گرنیوں میں بجلی کی روشنی کی حالیہ ترویج سے دن اور بھی طویل ہو گئے تھے پیدائش میں پھر بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی اور چین کے بازار میں پھر ضرورت سے زائد سامان جمع ہو گیا، اس کے ساتھ ہی ۱۹۰۷ء میں عالمی کساد بازاری کا آغاز ہو گیا، ہر جگہ اوقات کار میں تخفیف ہوئی اور سوت کی گرنیوں کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اس کساد بازاری کے بعد ترقی پھر جاری رہی، اور ۱۹۱۴ء میں روئی کی صنعت ترقی پذیر اور اچھی خاصی خوش حال صنعت بن گئی تھی۔

ترقی کی متوسط رفتار کے علاوہ اس صنعت کی حالیہ تاریخ میں دو نئے رجحانات پیدا ہو گئے، وہ یہ تھے کہ اول تو کرگھوں کی تعداد میں تکلوں کے مقابلے میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اور یہ صورت بیسویں صدی کے

آغاز سے بہت نمایاں ہوگئی، دوسرے روئی کے آجروں نے عمدہ قسم کا کپڑا تیار کرنا شروع کر دیا تھا، پہلی صورت کا اندازہ نقشے کے اعداد سے بخوبی ہو جاتا ہے، اس ترقی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ہم کو کچھ دور جانے کی ضرورت نہیں، یہ اسباب گزشتہ بیس سال کے غیر معمولی تغیرات میں پنہاں تھے، بمبئی کے سوت کی صنعت کا انحصار چین اور ملکی بازار پر تھا، برآمد کے لیے اس کا سارا دارومدار چین کے بازار پر تھا، یہاں اس کو جاپان اور لنکا شائر کے حریفوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا لہٰذا ایسی صورت میں جبکہ برآمد کا صرف ایک ہی بازار ہو، اور وہ بھی مستقل طریقے پر پائدار نہ ہو تو سوت کی صنعت میں تغیرات کا ہونا لازمی تھا، جہاں تک ملکی طلب کا تعلق تھا وہ بھی کاشتکاروں کی حالت کے ساتھ بدلتی رہتی تھی، اس لیے بمبئی کی صنعت اپنے سوت کی پیداوار کے واسطے ہمیشہ نئے بازار ڈھونڈنے میں لگی رہی، لیکن اس میں عملی طور پر کوئی کامیابی نہیں ہوئی، مسٹر گراہم کلارک گرنیوں میں کرگھوں کے اضافے کا ایک اور سبب بتلاتے ہیں وہ کہتے ہیں "کیونکہ کپڑے کا بازار خام مال سے چند درجے ہٹا ہوا ہے اس لیے وہ سوت کے بازار کے مقابلے میں زیادہ پائدار ہے اس زمانے میں جبکہ سوت کی گرنیاں بہت زیادہ نفع کما رہی تھیں[۱]، بنائی کی صنعت نقصان میں تھی، لیکن جب ردعمل ہوا تو سوت کی گرنیاں پہلے متاثر ہوئیں، اس طرح ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کے کچھ حصے میں جب سوتی گرنیوں نے خوب روپیہ کمایا تو بنائی کی گرنیوں کا منافع متوسط رہا۔ اور اب (اپریل ۱۹۰۸ء) سوتی گرنیاں اوقات سے کم کام کر رہی تھیں، جبکہ بنائی کی گرنیوں کا منافع بدستور حسبِ سابق تھا" ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لازمی تھا کہ صنعت بنائی کے پائدار بازار کی طرف اپنی

[۱] گراہم کلارک حوالہ گزشتہ۔

توجہ مبذول کرے۔ بنے ہوئے مال کی کھپت زیادہ تر اندرون ملک ہوتی تھی، اور کل پیداوار کا صرف چھٹا یا ساتواں حصہ برآمد کیا جاتا تھا (سوت کی صورت میں برآمد کا یہ تناسب تقریباً ایک تہائی حصے پر مشتمل تھا لیکن اس تناسب میں بتدریج کمی ہو رہی تھی) برآمد شدہ مال عام طور پر عرب، ایران، مشرقی افریقہ اور آبنائی نو آبادیوں میں جاتا تھا، اب گرنیاں جو کپڑا تیار کرنے لگی تھیں اس کی طلب کا انحصار غربا کے طبقوں پر نہ تھا، لہٰذا دستی کرگھوں کے تیار شدہ مال کے مقابلے میں اس کا بازار مستحکم تھا، یہ صحیح ہے کہ اس شعبے میں غیر معمولی منافع حاصل کرنے کے کچھ زیادہ مواقع نہ تھے لیکن صنعت کی خوش حالی کے قرائن ضرور موجود تھے، دوسرا رجحان یعنی نفیس سوت کی پیدائش کے واسطے بھی یہی اسباب معاون ہوئے روئی کی صنعت کے ابتدائی دور میں جبکہ بازار بہت وسیع تھا اور صنعت کا پیمانہ مختصر تھا رجحان اسی سمت میں رہا جہاں منافع آسانی سے کمایا جا سکتا ہو، ابتدائی زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ ایجنٹوں کو مقدار پیدائش کے لحاظ سے رقم ادا کی جاتی تھی، اور اس کا تجارت کے نفع یا نقصان سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ موٹی قسم کا سوت اور ادنیٰ قسم کا سامان زیادہ پیدا کیا جاتا تھا، اور جب ایک مرتبہ مشینوں سے موٹی قسم کا مال پیدا ہونے لگتا تو پھر ان سے عمدہ قسم کا سامان حاصل کرنا مشکل اور غیر مفید ہو جاتا تھا لیکن سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد سے ادنیٰ سوت کی بیرونی طلب میں بہت خفیف اضافہ ہو رہا تھا، اور ملک کے بازار پر بھی سنہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ قبضہ ہو چکا تھا، اور صنعت میں شدید مسابقت کا آغاز ہو گیا تھا، لہٰذا اب کارخانہ داروں کے لیے یہی صورت باقی رہ گئی کہ وہ اپنی توجہ نئے اور منافع بخش کاموں کی طرف مبذول کریں[1]، کتائی

[1] ملاحظہ ہو مضمون از مسٹر (اب سر) ڈی، ای، واچا، انڈسٹریل کوارٹرلی ریویو آف ویسٹرن انڈیا

میں سب سے اچھا نیا بازار نفیس سوت کا ملکی بازار تھا جس پر اس وقت لنکا شائر چھایا ہوا تھا، کرگھوں میں قابل لحاظ اضافہ اسی وجہ سے ہوا کہ صنعت کے واسطے نئے بازار تلاش کئے جائیں، اس سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان سے برآمد ہونے والے دھاگے اور سوت کی مقدار نویں عشرے سے یکساں حالت میں تھی، اور کپڑے کی مقدار میں تھوڑی سی کمی ہوگئی تھی۔ لہذا بیرونی بازار کے جمود یا تخفیفی کھنچاؤ کی وجہ سے بڑھتی ہوئی صنعت کو اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ ملک کے بازار پر ہی ڈالنے کی ضرورت تھی جہاں نفیس سوت اور اس کی مصنوعات کی طلب کا اچھا خاصا میدان تھا۔

اس دور میں ہندوستان میں جوٹ کی صنعت میں سوائے تیزی سے اضافے کے اور کوئی بات قابل تذکرہ نہیں۔

جوٹ کی صنعت (۱۸۹۵ء تا ۱۹۱۴ء)

	۱۸۹۵-۹۶ء	۱۹۰۱-۲ء	۱۹۰۷-۸ء	۱۹۱۳-۱۴ء
گرنیوں کی تعداد	۲۸	۳۶	۵۴	۶۴
مزدوروں کی تعداد	۷۸ر۱۱۴	۱ر۱۴ر۷۹۵	۱ر۸۷ر۷۷۱	۲ر۱۶ر۲۸۸
کرگھے	۱۰ر۱۶۹	۱۶ر۱۱۹	۲۷ر۲۴۴	۳۶ر۰۵۰
نکلے	۲ر۱۴ر۶۷۹	۳ر۳۱ر۳۸۲	۵ر۶۲ر۲۷۴	۷ر۴۴ر۲۸۹

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جلد اول شمارہ ۳، (۱۸۹۲ء) جس میں انھوں نے صنعتوں میں اچھی قسم کا سامان

پرانے دور کی طرح کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے بجائے اب مزدوروں، کرگھوں اور تکلوں کے تناسب میں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہاں دوسری قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ مزدوروں کے تناسب سے کہیں زیادہ اضافہ کرگھوں اور تکلوں میں ہوا، اور یہ بات اچھی قسم کی مشینوں کی ترویج اور پہلے کے مقابلے میں پیمانۂ کبیر والے انتظام کی وجہ سے محنت کی کفایت کی بدولت ممکن ہوئی سنہ ۱۸۹۵-۱۹۰۰ء کے درمیان اس صنعت میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوئی کیونکہ یہ قحطوں کا زمانہ تھا۔ اگرچہ قحطوں نے براہ راست صنعت پر اثر نہ ڈالا لیکن انھوں نے بالواسطہ طریقے پر یوں اثر ڈالا کہ اشیائے خوردنی اور دوسری زرعی خام پیداواروں کی برآمد ہندوستان سے رک گئی اس وجہ سے تھیلوں کی ہندوستانی طلب میں بھی تخفیف ہوگئی اس صنعت میں بعض سرد بازاری کے دور بھی رہے ہیں مثلاً سنہ ۱۹۰۵-۶ء میں، جوٹ کی گرنیوں نے زیادہ تر ترقی کلکتے کے گرد و نواح میں کی تھی اور اس رقبے سے باہر یہ صنعت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی بنگال کی صنعت کو سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل تھا کہ وہ جوٹ کے خام مال کی رسد کے مخزن سے بہت قریب تھی، کیونکہ بنگال کو جوٹ کا اجارہ حاصل تھا۔ لیکن اس عشرے میں باہر، بالخصوص جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ میں، مسابقت تیزی سے بڑھ رہی تھی، بڑی یورپ اور امریکا کی صنعتوں کی، ان کی قومی حکومتیں جوٹ کے بیرونی سامان پر محصول عائد کرکے ہمت افزائی کر رہی تھیں جبکہ خام جوٹ کو بلا کسی محصول کے آنے کی اجازت تھی، لیکن اس نے ہندوستانی صنعت کو متاثر نہیں کیا اور خام جوٹ کی برآمد میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ جوٹ کی مصنوعات کی برآمد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

۱۰۷

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ پیدا کرنے کی تحریک کی حمایت کی ہے۔

سنہ ۱۸۹۵-۱۹۱۴ء کے دور میں ہندوستانی معدنیات نے بڑی تیزی سے ترقی کی، کوئلے کی پرانی صنعت نے کافی تیزی سے ترقی کی، نیز اس دور میں دو نئی صنعتوں یعنی پٹرول اور مغنیسیہ نے بھی کافی اہمیت اختیار کر لی، عام رفتارِ ترقی کا کچھ اندازہ ذیل کے نقشے سے ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی کل معدنی پیداواروں کی سالانہ قیمت روپیوں میں

(پنجسالہ اوسط)

سنہ ۱۸۹۸-۱۹۰۳ء	سنہ ۱۹۰۴-۱۹۰۸ء	سنہ ۱۹۰۹-۱۹۱۳ء
۶,۴۹,۴۸,۹۰۵ روپے	۱۰,۰۷,۴۴,۸۷۵ روپے	۱۲,۵۸,۹۸,۳۳۰ روپیہ

کوئلے کی صنعت کی رفتارِ ترقی بہت زیادہ مسلسل اور غیر منقطع رہی، اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی اور اکثر رجائیت پسندوں کی امیدوں سے آگے نکل گئی سنہ ۱۸۹۱-۹۵ء میں کوئلے کی اوسط ۴۲ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن رہی اور سنہ ۱۸۹۶ تا ۱۹۰۰ء میں یہ اوسط بڑھ کر ۴۲ لاکھ ۲۸ ہزار ٹن ہو گیا، ان پانچ سالوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ آیندہ سالوں میں بھی رفتارِ ترقی بحال رہی زمانۂ قحط کا اثر کوئلے کی پیداوار پر یوں نہ ہو سکا کہ اس کے خاص خریدار ریلیں، جوٹ اور بنگال کی دوسری صنعتیں تھیں، اور ریلیں قحطوں سے متاثر ہونے کے بجائے اور زیادہ مصروفِ کار رہیں۔

کوئلے کی صنعت سنہ ۱۹۰۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء

	سنہ ۱۹۰۰ء	سنہ ۱۹۰۶ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۱۴ء
کل پیداوار (ٹن میں)	۶۰،۳۸،۰۵۳	۹۱،۱۲،۹۶۳	۱،۲۰،۵۱،۸۳۵	۱،۶۴،۳۸،۱۵۳
مزدوروں کی تعداد	—	۹۹،۱۳۸	۱،۱۹،۱۵۳	۱،۵۱،۳۷۶

کوئلے کی پیداوار میں اضافہ نئی معدنیات کے انکشاف کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ بنگال کی مشہور کانوں ہی سے زیادہ مقدار میں کوئلہ حاصل کیا گیا۔[1] سنہ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کی کل پیداوار کا ۹۵ فی صدی حصہ ان ہی کانوں سے نکالا گیا۔[2] زیر تبصرہ دور میں اس صنعت کی تاریخ مسلسل نہیں رہی، جہاں تک اس کی رفتار ترقی کا تعلق تھا وہ تیز اور مسلسل رہی اور عام طور پر اس میں یکسانیت تھی، اگر ہم اس کا موازنہ ریلوں اور دوسری ہندوستانی کوئلہ صرف کرنے والی صنعتوں سے کریں، تو ہم کو اس صنعت میں دو دور الگ الگ نظر آتے ہیں، پہلا سنہ ۱۸۹۵ء سے تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء تک اور دوسرا سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک، پہلے دور کی دو خصوصیات تھیں، اول وہ جب ہندوستان میں کوئلے کی برآمد درآمد کے مقابلے میں زیادہ رہی اور دوسری وہ جب کل پیداوار کا وہ حصہ جو ریلیں لیا کرتی تھیں گھٹ رہا تھا

[1] سنہ ۱۹۱۲ء میں جب صوبوں کی نئی تنظیم ہوئی تو یہ کانیں بہار واڑیسہ کے نئے صوبے میں شامل ہو گئیں۔

[2] سر ٹی، ہالینڈ "ہندوستان کے معدنی ذرائع کا ایک خاکہ"، (سنہ ۱۹۰۸ء)۔

مگر اس وقت ہندوستان میں درآمد ہونے والے کوئلے کی مقدار میں تخفیف ہو رہی تھی، اس زمانے میں ہندوستانی کوئلے نے کم و بیش ریلوں کی ساری طلب پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی ریلوں نے ۱۹۰۲ء سے بیرونی کوئلے کا استعمال تقریباً ترک کر دیا تھا اس تاریخ کے بعد سے ہندوستانی ریلیں جتنا کوئلہ صرف کرتی تھیں اس کا ۹۹ فی صدی حصہ ہندوستانی کوئلے پر مشتمل ہوتا تھا، اور ہندوستان کی کل پیداوار کے پیش نظر وہ کوئلہ جو ریلوں میں صرف ہو رہا تھا اس کی مقدار ۱۸۹۵ء میں ۳۸ فی صدی تھی، ۱۹۱۰ء میں یہ گھٹ کر ۳۰ فی صدی رہ گئی، اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک برابر اس میں تخفیف ہوتی رہی، لیکن ان رجحانات سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں کوئلے کی پیداوار میں ریل اور دیگر کوئلہ صرف کرنے والی مصنوعات کے مقابلے میں کچھ تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، لیکن ۱۹۰۱ء کے بعد کے سالوں میں یہ خصوصیت غائب ہو گئی، کوئلے کی مقدار برآمد میں تھوڑی سی کمی ہو گئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ۱۹۰۰ء کی گرم بازاری کے زمانے میں ہندوستان سے ادنیٰ قسم کا کوئلہ بمقدار کثیر باہر جا رہا تھا، لیکن اس کی صرف یہی ایک وجہ نہ تھی، "جہاں تک درآمد کا تعلق تھا اس کی رفتار ۱۸۹۸ء-۱۹۰۱ء کے درمیان یکساں رہی اور آخر الذکر سال کے بعد سے اس میں تدریجی تخفیف شروع ہوئی حتیٰ کہ ۱۹۰۹ء میں وہ اقل ترین نقطے پر پہنچ گئی، ۱۹۰۹ء میں یہ تخفیف اس وجہ سے اور زیادہ رہی کہ ۱۹۰۸ء میں کوئلے کی قیمت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا[1] لیکن اس سال کے بعد مقدار میں پھر تھوڑا سا اضافہ ہو گیا" گو برآمد اب بھی درآمد سے بڑھی ہوئی تھی لیکن ان دونوں میں پہلا سا فرق باقی نہ رہا تھا، جہاں تک ہندوستانی ریلوں کا ہندوستانی کوئلے کو

۱۰۹

[1] وی، بال، ہندوستان کے کوئلے کی کانیں، نظرثانی از آر، آر، سمپسن باب سوم ۱۹۱۲ء۔

صرف کرنے کا سوال تھا اس کی مقدار گزشتہ دور کے مقابلے میں ۹۹ فیصدی سے گھٹ کر ۹۵ فی صدی پر آگئی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ریلیں ہندوستان کے کوئلے کی پیداوار کی کل مقدار کا اتنا حصہ صرف نہ کر رہی تھیں جتنا کہ پہلے کرتی تھیں" زیر تبصرہ دور میں (۱۲-۱۹۰۹ء) ریلوں میں ہندوستانی کوئلے کی کل پیداوار کا ۳۱ فی صدی حصہ صرف ہوتا تھا، اور یہ اعداد گزشتہ دور یعنی ۰۸-۱۹۰۴ء کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ریلوں کی توسیع کوئلے کی کان کنی سے سبقت لے گئی۔[1] لیکن صرف یہی نہیں ہوا کہ ریلیں کوئلے سے سبقت لے گئیں بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریلیں اور کوئلہ صرف کرنے والے کاروبار ہندوستان میں کوئلے کی پیدائش کے مقابلے میں تیزی سے ترقی کر رہے تھے یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستانی کوئلے کی راہ میں غیر ملکی کوئلے سے مسابقت کرنے میں دو موانعات حائل تھے، پہلے تو یہ کہ یہاں کا کوئلہ اتنی اعلیٰ قسم کا نہ ہوتا تھا جتنا کہ بعض صنعتی اغراض کے واسطے ضروری تھا، دوسرے یہ کہ کانوں سے دور دراز علاقوں میں کوئلہ پہنچانے کے لیے ریلوں کے کرایے اس قدر زیادہ تھے کہ مسابقت مشکل ہوگئی تھی، کوئلے کی خوبی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی مغربی بندرگاہ مثلاً کراچی میں بنگال اور ویلز کے کوئلے کی قیمت میں بہت کم فرق ہوا کرتا تھا۔

وہ اسباب جو کوئلے کی صنعت کے فروغ کا باعث ہو رہے تھے ذرائع آمد و رفت اور کارخانے کی صنعت کی ترقی تھی، کوئلے کی پیداوار میں جو تیزی سے ترقی ہو رہی تھی اس کی وجہ اعلیٰ قسم کی مشینوں کا بڑھتا ہوا رواج تھا، جو اس صنعت میں سرعت سے مروج ہو رہا تھا اگرچہ بہت سی چھوٹی چھوٹی کانوں میں مشینوں کا استعمال بہت کم ہوتا تھا

۱۱۰

[1] ہندوستانی معدنی پیداواروں کا پنجسالہ تبصرہ (۱۳-۱۹۰۳ء) ص ۱۱۔

نیز معدنیات کے لیے پٹے اور پروانے عطا کرنے والے ضابطوں میں تبدیلی بھی اس صنعت کی ترقی میں بڑی معاون ہوئی، پرانے قواعد درحقیقت شدید اور سرمایہ داروں کی راہ میں غیر ضروری موانعات پیدا کرنے والے تھے، اس تبدیلی سے پہلے اور مابعد جو مراعات دی گئیں ان کے اعداد بھی سبق آموز ہیں۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں ان کی تعداد صرف ۶۰ تھی، سنہ ۱۹۰۴ء میں ۱۸۹، سنہ ۱۹۰۶ء میں ۲۵۲ اور سنہ ۱۹۰۷ء میں یہ بڑھ کر ۴۰۰ ہو گئی۔[1]

پٹرول کے ذخیرے جو برما میں واقع تھے ان سے تیل حاصل کرنے کی جد و جہد بھی کوئلے کی صنعت کی طرح بہت تیز رہی، بالائی برما میں ان کانوں سے غیر مصفا تیل نکالنے کے فرسودہ طریقے عرصۂ دراز سے رائج تھے، مشینوں کا رواج بہت کم تھا، اور ان کانوں پر حرفتی پنچایتوں کے مماثل چند اداروں کی نگرانی تھی۔[2] سنہ ۱۸۸۶ء تک اس صنعت میں جدید طریقوں سے تیل نکالنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی، لیکن اس سال دو کمپنیاں قائم ہوئیں جنھوں نے جدید ترین مشینوں کے ذریعے تیل حاصل کرنے کا آغاز کیا، ابتدا بہت معمولی تھی چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء میں صرف ۵۷۹،۱۶،۱۵ گیلن تیل نکالا گیا، ہندوستان میں صرف شمالی برما کی کانیں ہی بہت اہم ہیں کیونکہ ہندوستان کی کل پیداوار کا ۹۵ فی صدی سے زائد حصہ یہیں سے نکلتا ہے، تقریباً دس سال تک پیدائش میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا لیکن سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک معتد بہ مقدار حاصل کرنے کی امیدیں پوری ہوتی نظر آنے لگیں۔[3] سنہ ۱۸۹۶ء کے بعد اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا، لیکن اس ترقی کے باوجود بھی یہ ہندوستان

[1] سٹی، ایضاً، حوالۂ گزشتہ۔
[2] ڈاکٹر ایف نیوٹلنگ، بالائی برما میں پٹرول کی صنعت (سنہ ۱۸۹۲ء)۔
[3] ای ایچ پیس کیو، "برما کے تیل کے چشمے" (سنہ ۱۹۱۲ء)۔

کی کل ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہ تھا، لہذا بیرونی درآمد کے سلسلے میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ برما کے تیل کی برآمد کچھ زیادہ قابل لحاظ نہ تھی۔

پٹرول کی صنعت

	سنہ ۱۸۹۶ء	سنہ ۱۹۰۰ء	سنہ ۱۹۰۵ء	سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۴ء
تیل (گیلنوں میں)	۵۰,۴۹,۲۸۹	۳,۷۷,۲۹,۲۱۱	۱۴,۴۴,۹۸,۷۴۴	۲۱,۴۴,۲۹,۶۴۲	۲۵,۹۳,۴۳,۱۷۷

ہندوستان کی دوسری اہم معدنی پیداوار منغنیسہ کی صنعت ہے، اس کو تقریباً بیسویں صدی ہی کی پیداوار سمجھنا چاہیے، اگرچہ منغنیسہ کی کانوں کا آغاز سنہ ۱۸۹۲ء میں صوبۂ مدراس میں شروع ہو چکا تھا، لیکن انیسویں صدی کے اختتام تک ان کی پیداوار بہت ہی مختصر رہی، اور صوبۂ متوسط کی اہم کانوں پر سنہ ۱۹۰۰ء سے پہلے کام شروع نہیں ہوا ابتدا ہی میں اس صنعت کو روسی جاپانی جنگ سے بڑی تقویت پہنچی کیونکہ اس نے روس کی برآمد کو تقریباً روک دیا جو اس وقت منغنیسہ کی عالمی رسد میں بڑی اہمیت رکھتی تھی، اس صنعت میں تیزی سے ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں یورپ اور ریاستہائے متحدہ میں فولاد کی تجارت میں تیزی سے ترقی ہو رہی تھی[1] چنانچہ اس صنعت میں بھی سرعت سے اضافہ ہوا اور سنہ ۱۹۰۷ء میں یہ ایک

[1] اے ایچ کرتش، خام منغنیسہ، صفحہ ۳، نیز ملاحظہ ہو ہالینڈ اور فرامور ہندوستانی معدنی پیداواروں کا پنجسالہ تبصرہ (۱۹۰۴ء-۱۹۰۸ء) صفحات ۱۲۰ و ۱۲۹۔

عروج کے نقطے پر پہنچ گئی، جبکہ یہاں ۹ لاکھ ٹن سے زائد مغنیسیہ پیدا ہوا، اور تھوڑے عرصے کے لیے یعنی ۱۹۱۱ء تک ہندوستان دنیا میں سب سے زیادہ مغنیسیہ پیدا کرنے والا ملک بن گیا، ۱۹۰۸ء میں فولاد کی تجارت میں کساد بازاری کی وجہ سے اس صنعت میں بھی گرم بازاری نہ رہی کچھ عرصہ بعد جب پھر روس کی رسد میں گڑ بڑ ہوئی تو اس کی حالت چند روز کے لیے بحال ہو گئی، ملک میں فولاد سازی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہندوستان کے کل مغنیسیہ کی پیداوار برآمد ہی کی جاتی تھی، ۱۹۱۳ء میں اس پر تقریباً ۲۰ ہزار آدمی مصروف تھے۔[۱]

ہندوستان میں سونے کی صنعت متذکرۂ بالا دونوں صنعتوں سے زیادہ قدیم ہے، ہندوستان میں سونے کی سب سے اہم کان ریاست میسور میں کولار کے مقام پر ہے، قدیم ہندوستانی تحقیقاتوں نے اس کان کی طرف توجہ مبذول کرائی اور ۱۸۸۰ء میں ہندوستان میں سونے کی کان کنی کے لیے بہت سی کمپنیاں قایم ہوئیں، ابتدا میں توقعات بہت زیادہ تھیں، لیکن ان کو ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا، "تمام کمپنیاں جو اس قسم کی مبالغہ آمیز امیدوں سے قائم کی گئیں ان سب نے ۱۸۸۵ء میں دم توڑ دیا۔ لیکن اس سال میسور کمپنی نے جاں توڑ کوشش کی اور آخر کار رگِ زر کو پا لیا، ۱۸۸۷ء میں دوسری ملحقہ کمپنیوں نے کام شروع کیا اور اس کے بعد سے ۱۹۰۵ء تک اس کان کی ترقی اور کامیابی کی تاریخ مسلسل اور غیر منقطع رہی" لیکن اس سال کے بعد سے اس کی پیداوار میں کمی آنے لگی کیونکہ اب کام ادنیٰ حجری طبقوں تک پہنچ گیا تھا، ۱۹۰۲ء تک سونا ہندوستان کی معدنی پیداواروں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، مگر ۱۹۰۲ء کے بعد کوئلے نے اس کی جگہ لے لی۔

---

[۱] ہندوستانی معدنی پیداواروں کا پنجسالہ تبصرہ ۱۹۰۹ء-۱۳ء صفحہ ۵۵۔

ہندوستان کی دوسری اہم معدنی پیداواروں میں نمک، ابرک اور شورہ شامل تھا۔ اول الذکر بہت سی اہم صنعت ہے اس کی مقدار میں مختلف ذرایع مثلاً سمندر، چٹانوں اور جھیلوں سے حاصل کی جاتی ہیں لیکن ہندوستانی پیداوار اتنی نہیں ہوتی جو یہاں کی طلب کو پورا کرسکے۔ جہاں تک ابرک کا تعلق ہے اس کی پیدائش میں ہندوستان کو ساری دنیا میں اہمیت حاصل ہے، اگرچہ یہ صنعت کچھ زیادہ بڑی نہ تھی تاہم ۱۹۱۳ء میں اس میں ۱۸ ہزار مزدور کام کرتے تھے، شورے میں ہندوستان کو اجارہ حاصل ہے، اور ایک زمانے تک تمام آتش افروز چیزوں کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا رہا، لیکن اس سال یعنی ۱۹۰۶ء میں اس کا بدل دریافت ہوجانے کی وجہ سے اس کی اہمیت ختم ہوگئی، اور اس میں جمود پیدا ہوگیا۔

جہاں تک ہندوستان کے لوہے کے مخزنوں کا تعلق تھا اور جو ہندوستان میں کثرت سے ہیں ان کے لیے سب سے پہلے رانی گنج کے قریب آہنی صنعت کے واسطے باراکر کا کارخانہ قایم کیا گیا[1] متعدد دوسری کوششیں بھی ہوئیں لیکن وہ سب ناکام رہیں[2] اس صدی کے پہلے عشرے میں ہندوستان میں لوہے اور فولاد کے لیے ٹاٹا اینڈ سنز نے اپنی کمپنی قایم کی اس نے ۱۹۱۱ء سے کام شروع کیا مگر ظاہر ہے کہ ۱۹۱۴ء تک اس کی مقدار پیدایش کچھ زیادہ نہ ہوسکتی تھی[3]

زیرِ تبصرہ دور میں مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی معدنی پیداواروں میں کافی ترقی رہی لیکن ملکی ضروریات کے لحاظ سے یہ ناقابلِ لحاظ تھیں، اور اس کا پتا ہمیں یوں چلتا ہے کہ ملکی معدنیات کی

---

[1] ای، آر، واٹس، رسالہ بابت لوہا و فولاد بنگال (۱۹۰۰ء)۔

[2] رانا ڈے، حوالۂ گزشتہ۔

[3] لووٹ فریزر، ہندوستان میں لوہا و فولاد (۱۹۱۹ء)۔

جملہ قیمت سے کہیں زیادہ قیمت والی خام اشیا اور ان کی مصنوعات ہندوستان میں درآمد کرنا پڑتی تھیں، نہ صرف یہ کہ ترقی ناکافی تھی بلکہ وہ یک طرفہ بھی تھی، ہندوستان میں چھ اہم معدنی صنعتیں یعنی کوئلہ، پٹرول، سونا، نمک، خام مغنیسیہ اور ابرک تھیں، ان میں سے چار تو بقول سرٹی۔ ہالینڈ براہ راست طریقوں سے استعمال ہوتی تھیں اور آخر الذکر دونوں چیزیں برآمد کے لیے پیدا کی جاتی تھیں، ہندوستان میں فلزی معدنیات کی کان کنی تقریباً معدوم تھی، "فلزی معدنیات سے لاپروائی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ موجودہ فلز یابی اور کیمیاوی ترقی کے دور میں ذیلی پیداواریں بھی منافع کی مد کا ایک اہم اور ناگزیر ذریعہ ہیں، ذیلی پیداواروں سے عدم استفادے کی صلاحیت لازمی طور پر ان معدنیات سے بے پروا کر دیتی ہے جن سے تنہا فلز کے ذریعے منافع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تک ہندوستان جیسے ملک کو ان اشیا کی درآمد کی صورت میں یہ جرمانہ ادا کرنے پر قانع رہنا چاہئے جب تک کہ وہ کیمیاوی اور فلزی صنعتیں جن کے معاشی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی ساخت و نوعیت کے لحاظ سے کافی مقدار میں کیمیاوی پیداواروں کی ضرورت ہے، مہیا نہ کر سکے۔"[1] یورپی صنعت اسی وقت ہندوستان کی قدیم فلزی اور کیمیاوی صنعتوں کو میدان سے ہٹا سکی جبکہ اس میں تمام ذیلی پیداواروں سے استفادہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت پیدا ہو گئی، اور جیسا کہ مندرجۂ بالا اقتباس میں بتایا گیا ہے ان صنعتوں کا احیا ہندوستان کی عام صنعتی ترقی پر منحصر تھا۔ ۱۱۳

معدنی پیداواروں اور صنعتوں کے بعد قابل لحاظ درجہ نخل بندیوں

[1] ہالینڈ اور فرمور حوالۂ گزشتہ صفحہ ۱، نیز دیکھیے سرٹی ہالینڈ کا مقالہ "ہندوستانی معدنی پیداواروں کا زوال" جو پہلی ہندوستانی صنعتی کانفرنس میں پڑھا گیا (سنہ ۱۹۰۵ء)۔

کا تھا، سوائے چائے کے ان کی تاریخ گوناگوں واقعات سے پر ہے، ان میں سب سے پرانی نیل کی صنعت تھی، جو ۱۸۶۰ء سے ۱۸۹۵ء تک یکساں حالت میں رہی، جرمن سائنس داں ایک عرصے سے مصنوعی نیل بنانے کی کوشش میں مصروف تھے، اور ان میں سے بعض کو کامیابی بھی ہوئی تھی، مگر ۱۸۹۷ء تک اس طریقے میں اتنی کامیابی نہ ہوسکی کہ مصنوعی تیار شدہ نیل تجارتی پیمانے پر بازار میں لایا جاسکے، نیز خشک سالی نے بھی اس کی کاشت کو بڑے رقبوں پر نہ پھیلنے دیا[1] ۱۸۹۷ء کے بعد دو موسم اس کی کاشت کے لیے بہت ہی خراب ثابت ہوئے، چنانچہ ۱۸۹۷ء کے بعد ہندوستانی نیل کی صنعت میں تیزی سے زوال شروع ہوگیا، نیل کے رقبے میں تخفیف اور مقدار برآمد میں کمی ہونے لگی، اگرچہ ابتدا میں مصنوعی نیل کی مقدار کچھ زیادہ پیدا نہ ہوسکی، لیکن اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اور قدرتی نیل کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت ہی ادنیٰ تھی، نخل بندوں نے جزوی طور پر دوسری چیزوں کی کاشت کرکے، نیز نیل کی کاشت اور مصنوعات میں بہتر طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش سے اپنی حالت کو درست کرنا چاہا، لیکن زوال رک نہ سکا برآمد کے اعداد سے پتا چلتا ہے کہ صنعت میں کس تیزی سے زوال ہو رہا تھا (اور یہ ایک بڑی اچھی دلیل ہے کیونکہ ہندوستان میں جتنا بھی نیل پیدا ہوتا تھا تقریباً سب کا سب برآمد کیا جاتا تھا، اور ملک میں بہت تھوڑی مقدار رکھی جاتی تھی اور وہ بھی بالکل ادنیٰ قسم کی ہوتی تھی) ۹۶-۱۸۹۵ء میں برآمد کی مقدار ۱٫۸۷،۳۰۸ ہنڈر ویٹ تھی تو ۱۴-۱۹۱۳ء میں صرف ۱۰٫۹۳۹ ہنڈر ویٹ رہ گئی۔

۱۱۴ کافی کی صنعت میں ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۶ء تک کا مختصر دورِ خوشحالی

[1] سی، رولین، نیل کی کاشت وغیرہ، جرنل آف دی رائل سوسائٹی آف آرٹس (سنہ ۱۹۱۲ء)۔

کا زمانہ گزر رہا ہے' لیکن سنہ ۱۸۹۶ء میں برازیل اپنے سیاسی ہنگاموں سے فارغ ہو چکا تھا' اور اس نے پھر پیدائش بڑے پیمانے پر شروع کر دی تھی' اور قیمت میں تخفیف شروع ہو گئی تھی' اس سال کے بعد سے کافی کے رقبے میں تیزی سے تخفیف ہونے لگی' مگر اس کے ساتھ برآمد میں کوئی قابل لحاظ فرق واقع نہ ہوا' سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء میں کافی کے متعلق سالانہ رپورٹ یہ ہے کہ "سنہ ۱۸۹۶-۹۷ء کے بعد کے موسم سے کافی کے رقبے میں برابر تخفیف ہو رہی ہے' لیکن جہاں تک برآمد کے لحاظ سے پیدائش کا تعلق ہے' جو اس فصل کے بڑے حصے پر مشتمل ہے اس میں سال بسال تغیرات ہوتے رہے' اور مختصر کاشت بڑی کاشت کی جگہ لیتی رہی"۔ برآمد مجموعی حیثیت سے یکساں رہی اور اس میں خفیف سا فرق رونما ہوا' لیکن اس کے برخلاف رقبۂ کاشت میں بہت زیادہ کمی ہو گئی' جو سنہ ۱۹۰۰ء میں ۲۸۸,۱۶۰ ایکر تھا تو سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۲۰۳,۶۷۷ ایکر رہ گیا۔[1]

---

[1] نیل اور کافی کی صنعتوں کی ترقی اور وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے اوپر جو اشاریٔ اعداد استعمال کیے گئے ہیں وہ رقبۂ کاشت اور برآمد کے اعداد ہیں' حالانکہ کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد زیادہ بہتر نمایندگی کرتی' لیکن ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا' اگرچہ حکومت کئی سال سے بڑی صنعتوں کے اعداد شایع کر رہی تھی لیکن وہ قابل اعتماد نہ تھے' اور چند سالوں کے تقابل کے لیے ان پر بالکل بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا' چنانچہ "ہندوستان کے مالیاتی اور تجارتی اعداد" کے گیارہویں شمارے کے اس اقتباس سے ان مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے "ان بڑی صنعتوں کے اعداد بھی مکمل نہیں جن کو جدول میں شامل ہونا چاہیے تھا' اور جو اعداد موجود ہیں ان کی صحت میں بھی شبہ ہے: سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد سے ان کارخانوں یا کاروبار کے اعداد نہیں ہیں جہاں سال بھر ۲۵ آدمیوں سے کم کام کرتے تھے' اور سنہ ۱۹۰۲ء کے صوبۂ بمبئی کے اعداد میں ان کارخانوں کو خارج کر دیا گیا جہاں اوسطاً پچاس سے کم آدمی کام کرتے تھے' لہٰذا سنہ ۱۹۰۱ء کے جدولی تختوں کا ان گزشتہ سالوں کے اعداد سے تقابل نہیں کیا جا سکتا جو

اس کے برخلاف زیرِ تبصرہ دور میں چائے کی صنعت برابر فروغ پذیر رہی، بیسویں صدی میں نیل کے عالمی بازار میں مصنوعی نیل کی بڑی اہمیت ہو گئی تھی، کافی کے بازار میں برازیل کی کافی اس سے پہلے سے سارے بازار پر قبضہ کر چکی تھی، لیکن چائے کے بازار میں ہندوستانی چائے اپنی حیثیت مضبوط کر رہی تھی، اور اب وہ اس کا ایک اہم جزو بن گئی تھی در اصل اس صنعت کی ترقی اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ ہندوستانی چائے، چین کی چائے کو، سلطنت متحدہ کے بازار سے آہستہ آہستہ نکال رہی تھی، اور یہ تغیر بہت مکمل تھا۔ ۱۸۹۶ء میں سلطنت متحدہ کی کل درآمد ہونے والی چائے میں سے صرف ۲ فی صدی ہندوستانی چائے ہوتی تھی اور بقیہ چینی، لیکن ۱۹۰۳ء میں کل درآمد کی ۵۹ فی صدی ہندوستان سے، ۳۱ فی صدی لنکا سے اور صرف ۱۰ فی صدی چین سے آنے لگی، ۱۸۹۵ء کے بعد سے چائے کے رقبے میں جو اضافہ ہو رہا تھا وہ برابر جاری رہا، سب سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ اس جلد کی ابتدائی اشاعتوں میں شایع ہوئے ہیں۔ جبکہ ہر رپورٹ کرنے والے عہدہ دار نے اپنی قوت فیصلہ سے کام لیا کہ کونسی صنعت بڑی ہے * (سطر الفاظ مصنف کا اضافہ ہیں) بعد میں سارے ہندوستان میں ان کارخانوں کے اعداد فراہم کیے جانے لگے جہاں ۲۰ یا زائد مزدور کام کرتے ہوں، لیکن پھر ہمیں نیل کی صنعت کے متعلق یہ اشارہ ملتا ہے کہ "جدول کو ایک مکمل فرد سمجھنے کے بجائے اس صنعت کی وسعت کا صرف ایک خاکا سمجھنا چاہئے" کافی کے متعلق ناظم شماریات لکھتے ہیں کہ "رقبے، پیداوار یا جنوبی ہند کے کافی کے باغات کی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کیونکہ نخل بند بعض نامعلوم اور ناقابل قیاس اسباب کی بنا پر صنعت کے متعلق اعدادی معلومات بہم پہنچانے کے مخالف ہیں" (ہندوستانی تجارت پر تبصرہ ۲-۱۹۰۱ء ص ۲۱) اس کے برخلاف ہندوستانی تجارت خارجہ کے اعداد بہت زیادہ قابل اعتماد ہیں، گویا بڑی صنعتوں کے مقابلے میں زرعی اعداد و شمار نسبتاً بہتر ہیں۔

زیادہ ترقی ۹۸-۱۸۹۷ء کے درمیان رہی، آیندہ دو سالوں میں اضافے کی شرح تیزی سے رک گئی اور ۱۹۰۲ء میں بالکل بند ہوگئی، مقدار پیدائش میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور پیدائش میں کثیر اضافے کی وجہ سے ۱۸۹۵ء کے بعد سے چائے کی قیمت میں بھی تیزی سے تخفیف شروع ہوگئی تھی، کچھ عرصے کے لیے سلطنت متحدہ کی طلب ایک نقطے پر جم گئی اور اس کی وجہ سے ۱۹۰۲ء کے درمیان اس صنعت میں سرد بازاری رہی، لیکن ۱۹۰۲ء کے بعد پھر ترقی شروع ہوگئی، اور سلطنت متحدہ کے بازار میں آہستہ آہستہ وسعت ہونے لگی نیز اس کا ایک اہم اور وسعت پذیر بازار ہاتھ آگیا۔

گویا مجموعی حیثیت سے ہندوستانی صنعتوں میں نخل بند کاروباروں کا تناسب گھٹ رہا تھا ان کی حالت دوسری صنعتوں سے مختلف تھی، یہ سب کی سب یورپی باشندوں کی ملکیت تھیں یہ ملک کے عام قانون مزدوران سے مستثنیٰ تھیں، اور نخل بند کو ایک متوسط کارخانہ دار کے مقابلے میں اپنے مزدوروں پر زیادہ اختیارات حاصل تھے، یہ صنعتیں نیم زرعی اور نیم صنعتی تھیں اور سب کی سب اپنی پیداوار کا بڑا حصہ برآمد کیا کرتی تھیں، چائے اور کافی کی صنعتوں کی بدولت بہت سے ویران رقبے زیر کاشت آگئے اور ہندوستان کی صنعتی ترقی میں ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ملک کے گنجان علاقوں کے مزدوروں کے لیے روزگار کے ذرایع مہیا کر دیے تھے۔

ہندوستان کی صنعت شکر سازی بھی ان دوسری صنعتوں میں شامل تھی جن کو انیسویں صدی کا آخری عشرہ راس نہ آیا تھا، اس عشرے کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ تجارت خارجہ میں شکر کی درآمد میں بہت زائد اضافہ ہوا، شکر کی درآمد میں اس سے پہلے سے کچھ اضافہ ہو رہا تھا، مگر اس وقت یہ زیادہ تر ماریشس اور

۱۱۶

جاوا سے آتی تھی، اور اس سے ہندوستانی صنعت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن دراصل ہندوستانی شکر کی صنعت کو زبردست دھکا اس وقت پہنچا جب ملک میں چقندر کی شکر درآمد ہونے لگی، اور خصوصیت سے اس وقت جبکہ امریکا نے درآمد پر تائینی گروہ گیری عائد کردی، چقندر کی شکر نے قیمتوں میں بڑی تخفیف کردی تھی، اور ہندوستانی کارخانوں میں شکر کو صاف کرنا غیر منافع بخش کام ہوگیا تھا[1]۔ اس صنعت کے خاص مرکز صوبہ جات متحدہ اور بنگال کے چند اضلاع تھے، سنہ ۱۸۹۵-۱۹۰۰ء کے درمیان صوبہ جات متحدہ میں ۱۸۰ سے زائد شکر صاف کرنے والی چھوٹی گرنیاں بند کرنا پڑیں، اور بنگال کے اضلاع میں بھی اکثر مثلاً جیسور وغیرہ کے کارخانے بند ہوگئے[2]۔ سرکاری امداد پانے والی چقندر کی شکر پر متوازن محصول عائد کیا گیا، مگر اس سے ملکی صنعت کچھ زیادہ مستفید نہ ہوسکی، یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ شکر کی قیمت میں تخفیف سے نیشکر کے رقبۂ کاشت یا گڑ کی قیمتوں پر کوئی اثر نہ پڑے گا[3]۔ لیکن یہ امید خلاف توقع ثابت ہوئی، اور رقبۂ کاشت میں کمی ہونے لگی، رقبۂ کاشت میں تخفیف کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت عام اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا، اور اشیائے خوردنی، کپاس اور دوسری فصلوں کی کاشت منافع بخش ثابت ہو رہی تھی، لیکن بیرونی مسابقت کی وجہ سے شکر، قیمتوں میں اضافہ ہونے والی اشیا کی فہرست میں شامل نہ تھی، لہٰذا نیشکر کی کاشت کے بجائے دوسری منافع بخش چیزوں کی کاشت کی طرف توجہ مبذول ہونے لگی[4]۔ اگرچہ

[1] ایس، ایم، ہادی، صوبہ جات شمال و مغرب و اودھ کی صنعت شکر سازی (سنہ ۱۸۹۹ء)۔
[2] قانون محصول متوازن، (شکر) مشرقی ہند، مراسلت وغیرہ، (سنہ ۱۹۰۱ء) پارلیمنٹری دستاویز۔
[3] یادداشت از مسٹر مویسن حوالۂ گزشتہ۔
[4] ایف، نول، پیٹن، ہندوستان میں شکر (سنہ ۱۹۱۱ء)۔

چقندر کی شکر کی مسابقت سے زوال کا آغاز ہوا، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو شکر کی صنعت لازمی طور پر ترقی کرتی، دراصل وہ بنیادی اسباب جن پر صنعت کا دارومدار تھا ناپائدار تھے، پیدائش کی اکائی بہت چھوٹی تھی، طریقے بہت ہی فرسودہ اور تضییع کن تھے، اکثر کاروباروں میں مشین کا استعمال قطعی طور پر موجود نہ تھا، اور نیز یہ سبب بھی اس صنعت کے لیے بہت مہلک ہوا کہ شکر براہ راست گنے کے رس سے بنانے کے بجائے گڑ سے تیار کی جاتی تھی، اس صنعت کے زوال کا ایک اور سبب حکومت کا راب سے شراب بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دینا تھا، نیز ہندوستان کا طریقۂ کاشت بھی اس صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے میں مانع تھا۔

۱۱۷ مدراس کی صنعت دباغت کا بھی تقریباً یہی حشر ہوا، ۱۸۹۹ء تک مدراس سے برآمد ہونے والی خام کھالوں اور چمڑوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن اس کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، اس صنعت کا زوال امریکا میں چمڑا پکانے کے ایک نئے طریقے یعنی کروم کے انکشاف کی بدولت ہوا، اسی کے ساتھ کفش سازی کی صنعت میں بڑے پیمانے پر مشینوں کا استعمال شروع ہوگیا تھا، اس کی وجہ سے مغرب میں خام کھالوں اور چمڑوں کی طلب بہت بڑھ گئی، قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے دباغوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے کام کو نفع بخش طریقے پر نہیں چلا سکتے، چمڑا پکانے کے جدید طریقے نے ایک اور طرح ہندوستان کی دباغت کو متاثر کیا، اس طریقے کی ترویج سے پہلے بیرونی ملکوں اور بالخصوص انگلستان میں مدراس کے نباتاتی اور چھالوں کے دباغت شدہ چمڑوں کی بڑی مانگ تھی، لیکن ان کو استعمال کرنے سے قبل بیرونی دباغ ان کو دوبارہ پکاتے تھے، لیکن یہ نیم خام چمڑے کرومی طریقے میں استعمال نہ ہوسکتے تھے،

ؔ چٹرٹن، حوالۂ گزشتہ اور دوسرے صوبہ واری رسالے۔

ایک اور برا اثر رائل سوسائٹی آف آرٹس کی مقرر کردہ کمیٹی کی اس تحقیقات سے پہنچا کہ ہندوستان کے دباغت شدہ چمڑے جلدسازی کے لیے قطعی غیر موزوں ہیں، اس وقت ہندوستان کی دباغت کی صنعت میں کرومی طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان میں زیادہ تر ناکامی رہی، بہرحال اس عشرے میں صوبۂ مدراس اور بالخصوص بمبئی میں بڑے پیمانے پر دباغت کی صنعت نے کچھ ترقی کی، اس کے دو بڑے مرکز بمبئی اور احمد آباد تھے، یہ صنعت مدراس کی زوال پذیر صنعت سے بہت بڑے پیمانے پر تھی، اور اس کو ورکشاپ کے بجائے کارخانہ کہنا زیادہ موزوں تھا، لیکن اسی کے ساتھ چند کارخانوں کو چھوڑ کر جو طریقے مستعمل تھے وہ بہت ہی فرسودہ تھے[1] اور مجموعی حیثیت سے اس صنعت کا کاروبار بہت ہی مختصر تھا۔

اس بیس سالہ دور میں ان صنعتوں میں قابل لحاظ اضافہ ہوا جو روئی کی کتائی اور بنائی، چاول اور چوبینے وغیرہ پر مشتمل تھیں، چاول کی گرنیاں جو اب تک کم و بیش برما تک محدود تھیں اب خاص ہندوستان میں بھی قایم ہونے لگیں، خصوصیت سے مدراس اور بمبئی کے صوبوں میں ان کی تعداد زیادہ رہی، انجینیری اور ریلوں کے ورکشاپ، لوہا اور پیتل ڈھالنے والے کارخانے بھی تیزی سے بڑھنے لگے، اس درجے کی صنعتوں میں ترقی کی اصل وجہ ہندوستان میں ریلوں کی توسیع اور سائیکلوں، موٹروں اور ٹریموں وغیرہ کا بڑھتا ہوا رواج تھا ان میں معمولی کاموں کے لیے چھوٹی قسم کی مشینیں بھی استعمال ہونے لگی تھیں، مثلاً پانی کھینچنے کے چھوٹے پمپ یا ورکشاپی صنعتوں میں مشین سے چلنے والی کلیں وغیرہ، حالانکہ پہلے ان صنعتوں میں میکانی طاقت کا استعمال ہوتا تھا سا تھوڑی سی

۱۱۸

[1] اے، گتھری، رسالہ مدراس چرمی صنعت (بمبئی سنہ۱۹۱۰ء)۔

ہندوستان کے اکثر حصوں میں آٹے یا تیل کی چھوٹی چھوٹی گرنیاں بھی قایم ہونے لگیں۔

مختلف شعبوں میں اچھی قسم کی مشینوں کے استعمال کی ترویج ان صنعتوں میں جہاں پہلے کوئی قوت استعمال نہ ہوتی تھی' انجن سے چلنے والی کلوں کا رواج' اور ان چھوٹی منتشر اور مقامی کارخانے کی صنعتوں کا قیام جن کے کام میں کوئی خاص پیچیدگی نہ ہوتی تھی' ان ہی کو اس دور کی ہندوستان کی حقیقی صنعتی ترقی سمجھنا چاہیے خواہ اس کی وسعت کم ہی کیوں نہ ہو۔

۱۹۱۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری کے صنعتی نتائج پر نظر ڈالی جائے تو اس بیان کی صداقت کا ثبوت مل جائے گا' نیز اس سے ہندوستان میں جدید صنعتوں کی مختصر وسعت کا اظہار بھی ہو جائے گا' کارخانے کی تعریف یہ کی گئی کہ ہر وہ صنعتی کاروبار جہاں اوسطاً بیس سے زائد افراد کام کرتے ہوں کارخانہ ہے' چنانچہ ملک میں ۷،۱۱۳ کارخانوں کا شمار ہوا' ان میں سے ۴،۵۶۹ یعنی دو تہائی سے کم' کسی نہ کسی صورت میں میکانی قوت استعمال کر رہے تھے' بقیہ کارخانوں میں مصنوعات کی تیاری کے لیے کسی قسم کی مشینیں استعمال نہ ہو رہی تھیں' ان صنعتوں میں کام کرنے والوں کی کل تعداد ۲،۱۰۵،۸۲۴ تھی' صنعت نہ صرف مختصر تھی بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے محدود بھی تھی' ناظم مردم شماری نے صنعت کو ۱۶ شعبوں میں تقسیم کیا تھا' اور ان میں سے صرف چار شعبوں میں ایک لاکھ سے زائد آدمی کام کر رہے تھے' اور وہ یہ تھے۔

	مزدوروں کی تعداد
(۱) مخصوص چیزوں کی کاشت یعنی نخل بندی وغیرہ	۸۱۰،۴۰۷
(۲) پارچہ بافی	۵۵۷،۵۸۹
(۳) معدنیات	۲۲۴،۰۸۷

	مزدوروں کی تعداد
(۴) نقل وحمل سے متعلقہ صنعتیں	۱٬۲۵٬۱۱۷
میزان	۱۷٬۱۷٬۲۰۰

ہندوستان کی کل صنعتی آبادی کا ۱۸ فی صدی حصہ ان چار شعبوں ۱۱۹ میں مصروف تھا، لیکن یہ شعبے کچھ پیچیدہ ہیں، اور ان سے جو خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس سے صنعت کی نوعیت مختلف تھی، لہذا صحیح رائے اسی وقت قایم کی جا سکتی ہے جبکہ ان صنعتوں پر انفرادی حیثیت سے نظر ڈالی جائے جہاں بیس ہزار سے زائد مزدور کام کر رہے تھے۔

صنعتی مردم شماری (سنہ ۱۹۱۱ء)

صنعت	مزدوروں کی تعداد	صنعت	مزدوروں کی تعداد
چائے کے باغات	۷٬۳۰٬۵۸۵	اینٹ اور کویلو کے کارخانے	۴۶٬۱۵۶
روئی	۳٬۰۸٬۱۹۰	آٹے اور چاول کی گرنیاں	۴۲٬۳۷۴
جوٹ، سن وغیرہ	۲٬۲۲٬۳۱۹	مطابع	۴۱٬۵۹۸
کول سایین	۱٬۴۲٬۹۷۷	نیل کے باغات	۳۰٬۷۹۵
ریلوں کے ورکشاپ	۹۸٬۷۲۳	سونے کی کانیں	۲۸٬۵۹۲
کافی کے باغات	۵۷٬۹۲۳	کلوں یا انجنیری کے کارخانے	۲۳٬۱۴۷

ان کے بعد آرہ کشی کی گرنیاں، پتھر اور مرمر کی کانیں، چوبینے کے کارخانے، لوہا ڈھلانے والے کارخانے اور پٹرول صاف کرنے والی گرنیوں کا درجہ تھا، ان سب کارخانوں کا اس زمرے میں شمار تھا جہاں دس ہزار سے زائد مزدور کام کرتے تھے، ان میں سے

صرف اول الذکر چار صنعتیں کچھ اہم تھیں، مغل بندیوں میں جو لوگ کام کرتے تھے ان کا بڑا حصہ خالص زرعی مزدوروں پر مشتمل تھا، معدنی صنعتوں کی یک طرفہ ترقی کا حال بیان کیا جا چکا ہے، اس طرح خاص کارخانے کی صنعت میں، معدنی صنعتوں کو چھوڑ کر، روئی اور جوٹ کی صنعتوں کے بعد صرف ضمنی صنعتیں یعنی ورکشاپ اور لوہا ڈھالنے والے کارخانے وغیرہ، یا اوٹنے اور دابنے والے کارخانوں کی قسم اور چاول اور چوبینے کی گرنیاں ہی تھیں، اگر آخر الذکر صنعتوں میں ہم آٹے اور تیل کی گرنیوں کا اور اضافہ کر دیں تو ہندوستان میں پارچہ بافی کے بعد جدید ترین صنعتوں میں یہی اہمیت رکھتی تھیں، اس وقت ہندوستان میں صنعتوں کا دائرہ بہت ہی محدود تھا اور اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ صنعتیں جن میں کسی طرح کے پیچیدہ طریق عمل کی ضرورت ہوتی ہے، ہندوستان میں قطعی موجود نہ تھیں۔

۱۲۰ جب ہم ہندوستانی کارخانوں کے مزدوروں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ۱۸۹۲ء کا قانون نظر آتا ہے جو ۱۹۱۲ء تک نافذ العمل تھا، جب ۱۸۹۲ء میں یہ قانون پاس ہوا تو اس کے دائرۂ عمل پر اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن قانون کے نفاذ کے تقریباً دس سال بعد اوقات کار کے سلسلے میں ایک نیا جزو داخل ہوگیا، جس پر اس وقت غور نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ کارخانوں میں برقی روشنی کی ترویج تھی، اتفاق سے بمبئی میں اس کے آغاز کے ساتھ ہی سوت کے بازار میں بڑی گرم بازاری پیدا ہوگئی، اس کی وجہ سے کارخانوں میں بہت دیر تک کام کرنا نفع کا باعث ہونے لگا اور برقی روشنی کے آغاز سے یہ چیز ممکن بھی ہوگئی، ۱۸۹۱ء کی کمیٹی نے ہندوستان میں طلوع سے غروب آفتاب تک اوقات کو متوسط سمجھا تھا، اور ان کو کچھ تکلیف دہ خیال نہ کیا تھا، لیکن اب ان

اندازوں میں گڑبڑ ہو گئی، ۱۹۰۵ء کی گرم بازاری کے دور میں بمبئی کی صنعت میں اوقات کار بہت طویل ہو گئے، یعنی صبح ۵ بجے سے رات کے ۹ بجے تک کام ہونے لگا، گویا اس زمانے میں صنعتوں میں روزانہ کام کا اوسط ۱۵½ گھنٹے کے قریب رہتا تھا۔ اخبارات میں مضامین کے ذریعے ان طویل اوقات کی طرف توجہ دلائی گئی، اور حکومت نے پارچہ بافی کے کارخانوں کے مزدوروں کی حالت کی تحقیقات کے واسطے ایک کمیٹی مقرر کی، کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تفصیلی اور وسیع تحقیقات کی ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ کارخانوں کے مزدوروں کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک دوسرے کمیشن کا تقرر ہوا، اس نے ۱۹۰۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، کمیشن کی رپورٹ سے اس دلچسپ بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اکثر صورتوں میں ۱۸۹۲ء کے قانون کی علانیہ خلاف ورزی ہو رہی تھی، صوبہ جات متحدہ، جنوبی مدراس، بنگال اور پنجاب کی روئی کی گرنیوں میں بچوں کو بھی بڑے مزدوروں کے برابر کام کرنا پڑتا تھا، نیز ۹ سال سے کم عمر بچوں کی اچھی خاصی تعداد کارخانوں میں نیم وقتی طور پر ملازم تھی، اس سلسلے میں کلکتے کی جوٹ کی گرنی کے ایک منتظم نے بیان کیا کہ وہ ملازمت سے قبل بچوں کو ڈاکٹر کے پاس معاینے کی غرض سے ہرگز نہیں بھیجتا، کیونکہ وہ اس کا یقین کامل رکھتا تھا کہ ان میں سے بیشتر بچوں کو غالباً خارج کر دیا جائے گا، نیز اس نے اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ ۱۸۹۱ء کے قانون کی ترمیمات کی رو سے گرنیوں نے اپنے مروجہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ [2] خاندیس کی اوٹنے کی گرنیاں جو ۱۸۹۱ء میں قانون کے تحت آگئی تھیں ان کی حالت اب نسبتہً بہتر تھی۔ لیکن روئی

[1] پارچہ بافی کے کارخانوں کے مزدوروں کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۰۶ء)۔
[2] ہندوستانی مزدوران کارخانہ کے کمیشن کی رپورٹ (۱۹۰۸ء) ص ۱۷۔

دبانے اور چاول کی گرنیوں میں اکثر مقامات پر اوقات کار اچھے خاصے طویل تھے، گجرات کی روئی دبانے والی گرنیاں جو قانون کے تحت نہ تھیں اکثر دنوں میں ۱۵ سے ۱۸ گھنٹے تک کام کرتی تھیں، ان کارخانوں کا سارا دارومدار چاول اور روئی کی رسد پر ہوتا تھا لہٰذا یہ مسلسل کام کرتی رہتی تھیں اور کام کی زیادتی کے زمانے میں ان پر بار بہت زیادہ ہوجایا کرتا تھا، اس کے نتیجے میں اوقات کار طویل ہوجاتے تھے، بالغ مردوں کے اوقات کار بالائی ملک کے مرکزوں کے چھوٹے کارخانوں میں بدترین تھے، اور یہ اوقات روئی کی صنعت میں زیادہ تھے شمالی ہند کے مرکز یعنی آگرہ، دہلی اور کانپور خاص طور پر برے تھے، یہاں اوسطاً ۱۳½ گھنٹے کام ہوتا تھا، کلکتے کی جوٹ کی صنعت میں اوقات کار بے حد طویل نہ تھے البتہ چلا ہوں کو یہاں بھی کبھی کبھی دن میں ۱۵ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا، بچوں کے اوقات کار ہر جگہ زیادہ تھے اور کارخانوں کے بچوں کی عام تندرستی کا معیار بیرونی بچوں کے مقابلے میں گرا ہوا تھا، لیکن اس وقت جو مسئلہ زیادہ زیر بحث رہا وہ بلغ مردوں کے اوقات کا تعین تھا، اراکین کمیشن کی اکثریت نے اگرچہ کسی خاص ضابطے کی سفارش نہ کی تاہم وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ مزدور ان طویل اوقات سے عاجز ہیں، انھوں نے عورتوں اور بچوں کے اوقات معین کئے، جن کی وجہ سے ان کی رائے میں مزدوروں کے اوقات میں خود بخود کمی ہوجائے گی، ڈاکٹر نائر نے اس بات پر اختلاف کیا، شہادتوں کا بڑا حصہ اوقات میں کمی کو قرین مصلحت سمجھتا تھا، زیادہ طویل اوقات کی تائید محض اس وجہ سے کی جارہی تھی کہ ہندوستانی مزدور کو کام کے اوقات میں بھی گشت کرنے کی راسخ عادت پڑی ہوئی تھی شہادتوں سے اس امر کا بھی اظہار ہوا کہ یہ عادت خود طویل اوقات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں کانپور الجن ملس نے ایک دلچسپ تجربہ کیا،

یہ گرنیاں ایک زمانے میں ۱۵ گھنٹے روزانہ کام کرتی تھیں، نگران کو اس طریقے کے غیر مفید اور تضیع کن ہونے کا احساس ہوا اس لیے انھوں نے رفتہ رفتہ اوقات گھٹا کر ۱۲ گھنٹے کر دیے اور اندازہ کیا کہ اس سے ان کی مجموعی پیداوار میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی، مزدوروں کو تنخواہ اب بھی وہی ملتی تھی لیکن اب وہ نسبتہً پہلے سے بہتر کام کرنے لگے تھے[1]۔ اس قسم کا دوسرا تجربہ مدراس کی بکنگھم ملس میں کیا گیا، جہاں کے منتظم کا تجربہ یہ تھا کہ "جب انھوں نے روزانہ کام کے اوقات میں پون گھنٹہ کم کر دیا (یعنی $12\frac{1}{2}$ کے بجائے $11\frac{3}{4}$ گھنٹے) تو مجموعی پیداوار میں کوئی کمی نہیں ہوئی" انھوں نے اس کو بہتر مشینوں، بہتر نگرانی اور کام کرنے والوں کی بڑھی ہوئی سرگرمی سے منسوب کیا[2]۔ اس قسم کی شہادت کا اظہار ناگپور ایکسپریس ملس کے تجربہ کار منتظم مسٹر (اب سر) بے زون جی دادا بھائی مہتا نے کیا[3]۔ اس وقت مختصر اوقات کار زیادہ مفید تھے، ڈاکٹر نائر کی رائے تھی کہ طویل اوقات نہ صرف مٹر گشت اور خراب کام کرنے کی ترغیب دیتے تھے بلکہ یہی ان فصلی چھٹیوں کا باعث بھی ہوتے تھے جو مزدور دیہات میں جا کر گزارا کرتے تھے اور کام سے غیر حاضریاں بھی اکثر اسی کا نتیجہ ہوتی تھیں ان طویل اوقات کا مزدوروں کی صحت پر بھی برا اثر پڑتا تھا اور وہ جلد ناکارہ ہو جاتے تھے، ڈاکٹر نائر نے اپنی اس دلیل کے جواز میں یہ بات پیش کی کہ کارخانوں میں معمر بزرگ تقریباً بالکل

۱۲۲

---

[1] کمیشن مزدوران کارخانہ، شہادت کی روئداد، الجن ملس کے مسٹر ہیوسن کی شہادت۔

[2] کمیشن مزدوران کارخانہ، مسٹر الکزنڈر کی شہادت، بہتر مشینوں کے جزو نے اس تجربے کی قدر و قیمت میں تھوڑا سا فرق پیدا کر دیا ہے۔

[3] حوالۂ بالا، شہادت، نیز صاحب موصوف کا وہ مقالہ بھی ملاحظہ ہو جو تیسری ہندوستانی صنعتی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ (منعقدہ سنہ ۱۹۰۷ء)۔

نظر نہیں آتے، اور اس طرح محنت کی ممکنہ رسد بھی محدود ہو جاتی تھی، کیونکہ صرف وہی لوگ ملازم رکھے جا سکتے تھے جو طبعی طور پر سخت محنت کرنے کے اہل ہوں[1]۔

کارخانے کی صنعت میں طویل اوقات نے اس وقت مزدوروں کی آنے والی رسد کو محدود کر دیا تھا، اور اکثر صنعتی مرکزوں پر صفائی وغیرہ کی ناقابل اطمینان حالت بھی اس کا سبب قرار دی جا سکتی تھی کیونکہ یہ اسباب مزدوروں کو ان مرکزوں پر آنے سے پست ہمت کر دیتے تھے، اس زمانے میں تمام صنعتی کاروبار میں مزدوروں کی قلت کی شکایت عام تھی، لیکن یہ قلت دو طرح کی ہوا کرتی تھی اور ہر ایک میں فرق تھا، بعض کاروبار ایسے تھے جہاں قلت کی شکایت دائمی تھی، لیکن یہ عام طور پر صرف اُن صنعتوں یا کارخانوں میں ہوتا تھا جہاں کام کے حالات یا مکانات کی حالت بہت بری تھی، یا جہاں کام کا بار آدمی کو بہت جلد کسلمند کر دیتا تھا، چنانچہ فولے کو بنگال میں صرف کلکتے کی روئی کی گرنیوں (جہاں اوقات بیحد طویل تھے، اجرتیں بہت ادنیٰ تھیں اور جوٹ کی صنعت کے مقابلے میں کام زیادہ سخت تھا) اور ہاوڑے کی چند جوٹ کی گرنیوں (جو بہت زیادہ گنجان مقام تھا اور جہاں مکانوں کی حالت بڑی خراب تھی) اور کوئلے کی صنعت میں کوئلہ کاٹنے والوں میں مزدوروں کی قلت کی دائمی شکایت نظر آئی[2]۔ چنانچہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس صنعت میں بالائی سطح پر کام کرنے والے مزدوروں میں کبھی قلت کی شکایت نہیں ہوئی، صوبہ جات متحدہ کے اکثر مزدوروں میں بھی محنت کی قلت کی شکایت دائمی تھی۔ اور یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، جب ہم		۱۲۳

[1] کمیشن مزدوران کارخانہ، مسٹر نری مینٹل کی شہادت۔

[2] بی، فولے، بنگال کے مزدوروں کی رپورٹ (۱۹۰۶ء)۔

یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی ترک وطن کرنے والی آبادی کا بڑا حصہ، اور کلکتے کی صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بڑی تعداد ان مرکزوں کے ملحقہ اضلاع ہی سے مہیا ہوا کرتی تھی، ان بیشتر مرکزوں میں محنت کی قلت کی دائمی شکایت کے دو اسباب تھے، یعنی کارخانوں میں کام کے ابتر حالات اور مکانوں کی بری حالت، گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ قلت کی دائمی شکایت کے وجوہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھے کہ صنعتوں کے مروجہ حالات خراب تھے۔

لیکن مزدوروں کی قلت کے مسئلے کا ایک اور پہلو بھی تھا، یہ ہنگامی قلت تھی، لیکن جن صنعتوں میں ایسی قلت محسوس نہ ہوتی تھی وہ یہ تھیں (ا) وہ صنعتیں جہاں محنت کی رسد کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا (ب) وہ صنعتیں جہاں مزدوروں کو حسب خواہش کام مل جاتا تھا (ج) وہ ہنگامی صنعتیں جو زراعت کے مصروف ترین زمانے میں کام نہ کرتی تھیں۔ گیردھی کی کوئلے کی کانیں پہلے سبب کی بڑی اچھی مثال ہیں یہاں محنت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اس لیے کبھی محنت کی قلت نہیں ہوئی، یہی حال کلکتے کی جوٹ کی کرنیوں کا تھا جنھوں نے اپنے قلیوں کا اچھا انتظام کر رکھا تھا، پھر ریلوں کی تعمیر میں کبھی محنت کی قلت نہیں ہوئی، کیونکہ یہ کام ہندوستانی مزدوروں کو بہت پسند تھا، جوٹ دابنے والی صنعت تیسرے سبب کی اچھی مثال ہے اس لیے یہاں بھی کبھی قلت کا سوال پیدا نہیں ہوا۔

لیکن ہنگامی قلت تمام دوسری صنعتوں میں محسوس کی جاتی تھی، البتہ یہ بات الگ ہے کہ قلت کا دور ہر مقام پر مختلف ہوا کرتا تھا دراصل اس کا انحصار صنعت کے مقام تخصیص پر تھا اس سلسلے میں کوئی عمومی کلیہ بیان کرنا مشکل ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان صنعتی مرکزوں میں جو زرعی علاقوں کے آس پاس تھے، اور جہاں وہیں سے مزدور آتے تھے، کٹنے کے زمانے میں قلت کی شکایت ہو جاتی تھی،

اس کے برخلاف ان صنعتی مرکزوں میں جہاں مزدور دور کے اضلاع سے آتے تھے، موسم گرما اور شادیوں کے زمانے میں قلت کی عام شکایت ہو جاتی تھی، اور اتفاق سے یہ دونوں چیزیں ایک ہی وقت میں جمع ہو جاتی تھیں، اس طرح کانپور میں شدید قلت فصل منتقل کرنے والے زمانے میں ہوتی تھی، اور شولاپور میں کٹنے کے وقت، یہی صورت کوئلہ کاٹنے والے مزدوروں کی تھی، جو عموماً جنگلی سنتھال ہوتے تھے۔ جو اپنے چاول کی فصل کے بوائی اور کٹائی کے زمانے میں نایاب ہو جایا کرتے تھے[1]۔　۱۲۴

اس کے برخلاف بمبئی اور کلکتے دونوں مقاموں پر موسم گرما اور شادی کے زمانے میں محنت کی قلت ہوتی تھی، پہلی قسم کی قلت کا سبب خود ظاہر ہے، یہ ایک بدیہی چیز ہے کہ مزدور نے اب تک زمین سے اپنا تعلق قطع نہیں کیا تھا، مزدور ابھی تک جزوی کاشتکار تھا اغلباً یا تو اس کے پاس خود کوئی قطعۂ زمین ہوتا تھا یا وہ کسی دوسرے کا شریک ہوتا تھا، اس لیے فصل کے زمانے میں وہ اپنے خاندان کی مدد کرنے گھر چلا جاتا تھا۔ ہر ملک کے صنعتی ارتقا میں یہ دور لازمی اور نمایاں ہوتا ہے، اس قسم کی ہنگامی قلت کو اس وقت تک دور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ صنعت بڑے پیمانے پر ترقی کر کے اپنی خاص صنعتی آبادی پیدا نہ کر لے، کلکتے اور بمبئی کی محنت اس سے ایک درجہ آگے تھی یہاں کا مزدور، اور کم از کم کلکتے کا، زرعی خاندان کا ایک رکن ضرور ہے، لیکن اس نے زمین سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے، کیونکہ اب وہ اس پر تسلسل سے کام نہیں کرتا، یہاں ہم کو کلکتے اور بمبئی کے مزدوروں میں فرق کرنا ہوگا، کلکتے کے مزدور صوبہ جات متحدہ سے آتے تھے اور وہ اپنے خاندان کو کلکتہ نہیں لاتے تھے، لہٰذا وہ اکثر

---

[1] ای، اے، ہورن "صنعتی ترقی اور مزدوروں کا مسئلہ" بنگال اکنامک جرنل (اپریل ۱۹۱۸ء)۔

گھر جایا کرتے تھے، گھر کے فاصلے نے بمبئی اور کلکتہ دونوں جگہ کے مزدوروں کو سب سے پہلے زمین سے قطع تعلق کرنے کی ترغیب دی، جہاں تک بمبئی کے مزدور کا تعلق تھا اس نے مکمل طور پر زمین سے تعلق قطع کر لیا تھا، کیونکہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ شہر آچکا تھا، بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کا سارا خاندان کارخانوں میں کام کرنے کے لیے بمبئی آجاتا تھا، لیکن بمبئی کا مزدور بھی ابھی تک پوری طرح شہری مزدور نہ بنا تھا اس کے تعلقات اپنے آبائی گاؤں سے برقرار تھے وہ اکثر اپنے گھر جایا کرتا تھا اور عموماً بڑھاپے میں وہیں واپس چلا جاتا تھا وہ زچگی کے موقعوں پر اپنی بیوی کو اپنے گاؤں بھیجدیا کرتا تھا، اس کا کوئی خاص مقصد سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ مزدوروں کا زمین سے براہ راست اب کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا[1]۔ اس سلسلے میں کمیشن کارخانہ کے سامنے جو شہادت پیش ہوئی اس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ ایک گروہ نے بیان کیا "معمر آدمی اپنے گاؤں واپس چلے جاتے ہیں وہ کارخانوں میں کام نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اعصاب مضمحل ہو جاتے ہیں، اور چونکہ ان کے پاس کچھ پس انداز نہیں ہوتا اس لیے وہ گزر اوقات کے لیے کھیتی باڑی شروع کر دیتے ہیں[2]۔

[1] اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بڑے شہروں میں زچہ کی دیکھ بھال اور تیمارداری مشکل تھی، نیز جہاں خاندان یا رشتہ داروں کی دوسری عورتیں بھی کام کرتی تھیں وہاں ان کو زچہ کی دیکھ بھال کی فرصت نہ تھی، کیونکہ اس کا مطلب کام سے غیر حاضری اور اجرت میں تخفیف تھی، پھر اس زمانے میں شہروں میں اسپتالوں، ڈاکٹروں اور دائیوں کی کمی تھی، اور ان پر اخراجات زیادہ آتے تھے اور نیم شہری مزدوران سے کچھ مانوس بھی نہ تھے، لہٰذا مناسب یہی تھا کہ عورت کو گاؤں بھیجدیا جائے جہاں اس کے میکے یا سسرال والے دیکھ بھال کریں، اور نیچ ذات کی مقامی غیر تربیت یافتہ دائی پیدائش میں امداد دے جس کو عموماً معاوضہ بشکل جنس ادا کر دیا جائے۔ (مترجم)۔

[2] کمیشن مزدوران کارخانہ شہادتیں علی الترتیب مسٹر کلو سکر، مسٹر نرلے اور بھیوا باداجی (۱۸۰۸ اسطر الفاظ مصنف کا اضافہ ہیں۔

دوسرے نے کہا ''معمر لوگ جہاں ۴۰، ۵۴ کے ہوئے وہ اپنے گھر واپس چلے جاتے ہیں، اگر انھوں نے کچھ روپیہ بچا لیا تو وہ چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دیتے ہیں، اور اگر کچھ نہیں ہوتا تو وہ بمبئی ہی میں رہتے ہیں، اور ان کے بال بچے ان کی کفالت کرتے ہیں[1]''
125

لیکن سب سے زیادہ مستند شہادت ایک کام کرنے والے کی زبانی تھی کہ ''بمبئی کے مزدوروں کی بہت کم تعداد یہاں سکونت اختیار کرتی ہے، ہم لوگوں کے گھر بیشتر کونکن میں ہیں، اور ہم وہاں سال، دو سال میں کچھ دنوں کے لیے ضرور جاتے ہیں، جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور کام کے قابل نہیں رہتا تو وہ بمبئی میں نہیں ٹھہرتا بلکہ اپنی آخر عمر گھر پر گزارتا ہے، جہاں بمبئی میں کام کرنے والے افراد خاندان اس کی گزر اوقات کے لیے رقمی امداد بھیجتے رہتے ہیں[2]۔ بڑھاپے میں پس اندازی اور فرستادہ رقموں پر بھروسا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مزدور کا زمین میں کوئی حصہ باقی نہ رہا تھا، وہ دیہات میں زرعی کام کرنے نہیں جاتا تھا بلکہ اس کا مقصد آرام کرنا ہوتا تھا، معاشی طور پر ایسے مزدور کا تعلق زمین سے پورے طور پر منقطع ہو چکا ہے، لہذا کچھ ایسے قوی اسباب ضرور ہونا چاہییں جو اس کی بمبئی کی مستقل سکونت میں مانع ہوا کرتے تھے، اور اغلبا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکانات کی ابتر حالت اور صفائی وغیرہ کے معقول انتظامات کی عدم موجودگی ہی کی وجہ سے شہر میں مستقل سکونت رکھنے والی صنعتی آبادی میں اضافہ نہ ہو سکا۔

لہذا اس وقت محنت کی ہنگامی قلت صنعتی ارتقا کے اس

[1] و [2] کمیشن مزدوران کارخانہ، شہادتیں علی الترتیب مسٹر کلوسکر، مسٹر نرلے اور بھیوا باداجی (مسطر الفاظ مصنف کا اضافہ ہیں)۔

پہلو کا ایک قدرتی نتیجہ تھی جس سے ہندوستان گزر رہا تھا، اور اس کو ان حالات سے اور زیادہ تقویت ہوئی جو فی الوقت ہندوستانی صنعتوں میں مروج تھے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو بی، فوے، حوالۂ گزشتہ، مسٹر فوے محسوس کرتے ہیں کہ بنگال کے موجودہ حالات کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں زرعی طبقوں اور کارخانوں کے مزدوروں کے حالات زندگی میں کوئی غیر موافقت موجود نہ تھی، دراصل آجرین کی غیر معمولی رنگ آمیزی کا نتیجہ تھی۔

باب نہم

۱۲۶

ریلیں اور آبپاشی

ہندوستان میں ریلوں اور نہروں میں وہ باہمی تعلق نہیں ہے جو دنیا کے اکثر دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے، کم و بیش ہر جگہ وہ ذرائع نقل و حمل کی دو شاخیں ہیں، انگلستان میں تجارتی انقلاب کی تکمیل ریلوں کی کثیر التعداد تعمیر ہی سے ہوئی، لیکن ابتدا نہروں کے ایک انگریزی طریق سے ہوئی، یہی حال یورپ کے اکثر ممالک کا رہا۔ ہندوستان میں نقل و حمل کے واسطے نہروں کی تعمیر شاذ صورتوں ہی میں ہوئی، ہندوستان میں آبی نقل و حمل صرف بڑے دریاؤں کے ذریعے سے ہوا کرتی تھی اور ان میں بھی وہ حصے جہاں پورے سال کشتی رانی ہو سکتی تھی کچھ زیادہ نہ تھے۔ بنگال و مدراس میں چند ایسے نہری علاقے تھے جہاں کچھ بڑے پیمانے پر کشتی رانی ہو سکتی تھی[1]۔ لہذا ہندوستان میں ریلیں اور نہریں دوسرے کی لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

[1] ہندوستان میں سوائے کرشنا اور گوداوری کے ڈیلٹاؤں کے اور کہیں کشتی رانی کا ایسا طریقہ نہیں جو عوام کے لیے کسی حد تک مفید ہو، ہندوستان کے کمیشن آب پاشی کی رپورٹ۔

لیکن بعض دوسری صورتوں میں وہ ایک دوسرے سے متعلق تھیں، پہلے یہ کہ حکومت ہند نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ہندوستان میں ریلوں اور نہروں کی توسیع کے سلسلے میں خانگی مہمات پر کچھ زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اس لیے حکومت کے ایک اہم محکمے (محکمۂ امورِ عامہ) نے مفادِ عامہ کی ان دونوں چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہ لارڈ ڈلہوزی کا کارنامہ تھا، آب پاشی اور ریلوں میں ایک دوسرا تعلق بھی ہے کیونکہ ان دونوں کی تعمیر کے اضافے میں ایک ہی بنیادی جذبہ کار فرما تھا، یعنی قحطوں سے تحفظ، اور اس مقصد کے لیے ان دونوں کے علی الترتیب فوائد انیسویں صدی کے آخری تین عشروں میں بڑے گرم مباحثے کا موضوع رہے ہیں۔

فصل اول

ریلیں

ریلوں کی تعمیر میں حکومت کی ابتدائی پالیسی ضمانتی کمپنیوں کا طریق تھا، خانگی کمپنیوں کے سرمایے سے تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا جن کو اصل پر ۵ فی صدی سود کی ضمانت دی گئی، اور اگر پانچ فی صدی سے زائد کچھ منافع ہو تو زائد منافع کمپنی اور حکومت کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہوگا، نیز حکومت نے ان معاہدوں میں اپنے لیے یہ حق ۱۲۷

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۱۰؎ ایضاً باب اشارہ۔

محفوظ رکھا کہ اگر وہ چاہے تو پچیس یا پچاس سال کے بعد ریل خریدلے
سنہ ۱۸۶۹ء تک ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر اسی طریقے پر جاری رہی
لیکن یہ طریقہ بہت ہی غیر مفید ثابت ہوا، اور ہر سال حکومت کو
ضمانت کے تحت کمپنیوں کو اچھی خاصی رقم ادا کرنا پڑتی تھی، ابتدا
میں یہ خیال تھا کہ ریلیں تھوڑے ہی عرصے میں پانچ فی صدی سے
زائد منافع ادا کرنا شروع کردیں گی، لیکن یہ ایک غیر مستند مفروضہ
ثابت ہوا، ریل کی کمپنیوں کو ضمانتی طریق کی وجہ سے کوئی ترغیب
نہ تھی کہ وہ اپنے انتظامات میں کفایت کریں[1]۔ جب بنیادی تجویز
کے غیر سودمند ہونے کا احساس ہوا تو یہ طریقہ ترک کردیا گیا، اور
سنہ ۱۸۶۹ء سے سنہ ۱۸۷۹ء تک حکومت نے تجربے کے طور پر ذاتی طور
سے ریلیں تعمیر کیں، سنہ ۱۸۷۹ء کے بعد خانگی کمپنیوں کو پھر میدان میں
آنے کی اجازت دی گئی، ان نئی کمپنیوں کو سود کی کوئی ضمانت نہیں
دی گئی، لیکن اکثر صورتوں میں حکومت نے ان کی رقمی امداد کی اور
زمین تو ہر ایک کو بلاقیمت دی گئی[2]۔ لیکن اس کے ساتھ حکومت نے
اپنے طور پر بھی ریلوں کی تعمیر جاری رکھی اور دیسی ریاستوں کی حکومتوں
نے بھی ان کی تعمیر شروع کردی، گویا ان سب اداروں کی بدولت
اس دور میں ریلوں کی توسیع میں اچھا خاصہ اور مسلسل اضافہ ہوتا رہا
سنہ ۱۹۱۴ء میں حکومت نے ان تمام ریلوں کو اپنے قبضے میں لے لیا
جو پرانے ضمانتی طریق کے تحت جاری تھیں، سنہ ۱۸۷۹ء کے بعد جن
خانگی کمپنیوں کو امداد دی گئی ان کا کام کچھ زیادہ وسیع نہ تھا، اور سنہ ۱۹۱۴ء
میں ہندوستان کی ریلوں کا بڑا حصہ حکومت کی ملک بن چکا تھا۔

---

[1] امور عامہ کی مجلس منتخبہ کی رپورٹ (سنہ ۱۸۷۹ء) نیز کمیٹی کے روبرو پیش ہونے والی میجر جنرل ڈکسن جولینڈ ڈین واٹسن اور دوسری شہادتیں۔

[2] ہندوستانی ریلوں کے امیے اور نظم و نسق کی کمیٹی کی رپورٹ (سنہ ۱۹۰۷ء)۔

سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ہندوستانی ریلوں کی مختلف صورتیں

آمد و رفت کے لیے کل ریلوں کا طول ۳۴،۶۵۶ میل

سرکاری ریلوں کا طول جو کمپنیوں کے زیر انتظام تھیں۔ ۱۸،۶۸۰ } ۲۵،۹۱۱ میل

〃 〃 〃 جن کا انتظام خود سرکار کرتی تھی۔ ۷،۲۳۱ } مجموعی سرکاری ملک

ریاستوں کی ریلوں کا طول جن کا انتظام ریاست اور کمپنیاں کرتی تھیں۔ ۴،۲۹۶ میل

باقی ریلیں چھوٹی خانگی کمپنیوں کی ملکیت میں تھیں۔

۱۲۸ ریلوں کی توسیع کے لیے پہلا خاکا لارڈ ڈلہوزی نے تیار کیا جنھوں نے خاص خاص شاہراہوں کے راستے بھی معین کر دیے، اور بیشتر صورتوں میں ان کی تعمیر اس طریقے پر ہوئی جس طرح کہ لارڈ موصوف نے تجویز کی تھی، ہندوستان میں جس طریقے پر ریلوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا اس میں جلد منافع حاصل کرنے کے خیال کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا لہذا یہاں ریلوں کی ترقی بڑی عجیب رہی، قریبی تجارتی مرکزوں کو ملانے کی طرف بالکل توجہ نہ کی گئی، اور نہ ریل گزرنے والے اضلاع کی تجارت کا بغور مشاہدہ کیا گیا، تاکہ باقاعدہ طور پر معاونی لائنوں کی تعمیر ہو سکے۔ اس کے بجائے جس اصول پر عمل کیا گیا وہ یہ تھا کہ ملک کے طول و عرض سے گزرنے والی خاص ریلیں تعمیر کر دی جائیں، اور ملک کے اندرونی بڑے شہروں کو بڑی بندرگاہوں یعنی کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے ملا دیا جائے، اس طرح سنہ ۱۸۷۱ء تک اکثر بڑے مرکز ملا دیے گئے، ان شاہراہوں کی تعمیر کا بیشتر کام ضمانتی کمپنیوں نے انجام دیا، بندرگاہوں سے ایسے راستے اختیار کیے گئے، جو ملک کے اہم اندرونی زرعی علاقوں سے گزریں، تاکہ زرعی پیداوار کی برآمد میں سہولت پیدا ہو جائے، مثلاً احمد آباد اور گجرات کے روئی کے علاقے کو

بمبئی سے ملادیا گیا، خاندیس اور برار کے روئی کے خطے کو ناگپور سے، اور کرناٹک کے ملحقہ اضلاع کو شولاپور سے ۱۸۷۰ء سے قبل ملادیا گیا کلکتے سے سب سے پہلی توسیع صوبہ جات شمال و مغرب کے زرخیز اور گنجان علاقوں اور رانی گنج کی کوئلے کی کانوں تک ہوئی اور شمال کے بڑے بڑے شہروں مثلاً مرزاپور، الہ آباد، کانپور اور دہلی سے گزرنے والا راستہ اختیار کیا گیا، ۱۸۷۰ء میں براہ جبلپور بمبئی اور کلکتہ ملادیا گیا، ۱۸۷۱ء میں مدراس، بمبئی سے اور ۱۸۶۷ء میں دہلی کو کلکتے سے ملادیا گیا۔ لیکن کافی طویل عرصے تک بمبئی کو شمالی ہند کے شہروں سے براہ راست نہیں ملایا گیا اور اس نے کلکتے کی حیثیت کو شمال مغربی صوبوں کی پیداوار کی برآمد کے سلسلے میں کافی اہم بنا دیا۔ کراچی سے پنجاب تک کا دوسرا اہم راستہ تھا جہاں کافی عرصے تک ریل تعمیر نہیں ہوئی اور اس کی وجہ سے کراچی کو بندرگاہی حیثیت حاصل کرنے میں بڑی دیر لگی، غلے کے جس خطے میں ابتدائی ریلوں کی تعمیر نہیں ہوئی وہ چھتیس گڑھ تھا جہاں آٹھویں عشرے تک ریل کا گزر نہیں ہوا اور اس وقت تک وہاں قیمتوں اور خشک سالیوں کی نوعیت پر معقول ذرائع آمد و رفت کی کمی کی وجہ سے غیر معمولی اثرات پڑتے رہے، محض رائچور تک ریل کی تعمیر سے کرناٹک کی ساری روئی پر قبضہ نہ ہو سکا، اور بلگام، دھارواڑ، اور ہبلی جیسے اہم مرکزوں تک آٹھویں عشرے کے اختتام تک ریلیں تعمیر نہیں ہوئیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر تیز رہی اور بڑے اہم مرکز ایک دوسرے سے بہت جلد ملادیے گئے۔ ۱۲۹

قحطوں سے حفاظت ہندوستان میں ریلوں کی توسیع کا ایک خاص سبب تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ریلوں کی موجودگی نے قحطوں کی شدت میں بڑی کمی کر دی۔ ارکان قحط کمیشن (۱۸۸۰ء)

نے اموات کے اعداد کا تقابل کیا تو معلوم ہوا کہ ان علاقوں میں قحط کی وجہ سے شرح اموات بہت زیادہ رہی جہاں ذرایع نقل و حمل کی حالت سب سے خراب تھی، ۱۸۸۰ء تک ریلوں کی تعمیر میں اس حد تک توسیع ہو چکی تھی کہ قحط پڑنے والے بیشتر علاقوں کے تحفظ کا مناسب بندوبست ہو گیا لیکن ریلوں کی توسیع کا سبب تنہا قحطوں سے حفاظت ہی نہ تھا، ایک ابتدائی کمیٹی نے حسب ذیل وجوہ بیان کیے تھے جن کے پیش نظر ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر میں تیزی سے ترقی ہونا چاہیے تھی۔

(ا) قحطوں سے تحفظ۔

(ب) اندرونی و بیرونی تجارت کی ترقی۔

(ج) ریل کا گزر ہونے والے علاقوں میں کافی منافع بخش فصلوں کی ترقی۔

(د) کوئلے کی کانوں کا فروغ۔

(ھ) اور ملک کے باشندوں کی معاشی حالت کی بہتری[1]۔

کمیٹی نے، دوسری تمام کمیٹیوں کی طرح جو ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر کے سلسلے میں مقرر ہوئیں یہ محسوس کیا کہ ریلوں کی تعمیر کا کام بہت تیزی سے شروع ہونے کی ضرورت ہے، اس تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سب سے بڑی دقت آٹھویں عشرے میں اور اس کے بعد یہ تھی کہ حکومت کی مالی حالت اچھی نہ تھی، جس کی وجہ سے ریلوں کی تعمیر کے لیے ساری رقم قرض لی جانے لگی جو آیندہ چل کر خطرناک ثابت ہوئی کمیٹی امور عامہ (۱۸۷۸ء) نے ریلوں کی غرض کے واسطے قرضہ لینے کی سفارش اسی حالت میں کی تھی جبکہ یہ امید تھی کہ ریلیں تھوڑے ہی عرصے میں منافع بخش کاروبار بن جائیں گی، لیکن کمیٹی کی رپورٹ کے چند ہی

---

[1] ہندوستان میں ریلوں کی کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۸۴ء)۔

سال بعد حکومت کی حکمت عملی بالکل متضاد ہو گئی، حکومت نے بیمہ قحط کی رقموں کو بھی اس کام کے واسطے صرف کرنا شروع کر دیا حکومت کی اس حکمت عملی کی کہ ریلوں کی تعمیر کو ہر قیمت پر آگے بڑھایا جائے اکثر حلقوں میں مذمت کی گئی، اور مسٹر گوکھلے نے ایک عام مروجہ جذبے کی ترجمانی کی تھی جب یہ کہا "میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ بذات خود ریلوں کی مذمت کی جائے، بلکہ اس طریقے پر اعتراض ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ ریلیں تعمیر کر رہی ہے اور دوسرے زائد مفید کاموں کو پس پشت ڈال رہی ہے[1]۔ بہر حال تمام مالی دقتوں کے باوجود ریلوں کی تعمیر کا یہ سلسلہ اس دور میں برابر جاری رہا۔ ۱۳۰

ہندوستان میں ریلوں کی پالیسی کو متاثر کرنے والے دو اسباب تھے، پہلا وہ لائنیں تھیں جن پر ریلوں کی تعمیر کا خاکا بنایا گیا، اور دوسرا انتظام کا مسئلہ تھا، پہلے سبب یعنی شاہراہوں کی تیزی سے تعمیر نے درآمد کرنے والے مرکزوں اور بالخصوص اندرونی بڑے بازاروں اور بڑی بندرگاہوں میں براہ راست تجارت کو فروغ دیا۔ اس وقت ریلوں کی تعمیر میں ملک کی اندرونی تجارت کو ترقی دینے کے بجائے بیرونی تجارت کے فروغ کا زیادہ خیال رکھا گیا اور اس وقت ہندوستان میں بڑی صنعتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ پالیسی قدرتی بھی تھی لیکن اس نے شرح کرایے کی نوعیت پر ایک مستقل اثر ڈال دیا، جس نے آگے چل کر ہندوستانی مصنوعات کی ترقی کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ ۱۹۱۴ئہ تک اس حکمت عملی میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا، اس تاریخی سبب کا نتیجہ (صنعتی کمشنروں کے الفاظ میں) یہ ہوا کہ "عمومیت کے ساتھ بندرگاہوں کو جانے والی خام پیداواروں کے لیے کرایے موافق ترین

---

[1] ویلبی کمیشن کے روبرو شہادت سنہ ۱۸۹۶-۱۹۰۰ء۔

ہوگئے[1]، مزید براں یہ کہ ملک کے اندرونی صنعتی مرکزوں میں کرایے
اور زیادہ شدید تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بندرگاہوں میں صنعتوں
کی تحصیر شروع ہوگئی۔ کوئلے کی صنعت نے کرایوں کی اس زیادتی کو
خصوصیت سے محسوس کیا[2]۔ اور ان کا دوسرا لازمی اثر یہ ہوا کہ ان
ترجیحی کرایوں نے بندرگاہی صنعتوں اور بدیسی صنعتوں کو ملک کی
اندرونی صنعتوں سے مسابقت کرنے میں تھوڑی بہت مدد پہنچائی

انتظام کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا، اگرچہ ریلیں
بالخصوص اس صدی کے ابتدائی زمانے سے، بیشتر حکومت کی ملک
تھیں، لیکن ان کے بڑے حصے کا انتظام سرکاری جانب سے
مختلف کمپنیوں کے سپرد تھا، لہٰذا مشترک ریل کی حکمت عملی کے فوائد
جو عموماً واحد ملکیت کا نتیجہ ہونا چاہئیں ہندوستان میں مفقود تھے مختلف
کمپنیوں میں مال اور مسافروں کی آمد و رفت کے لیے خواہ مخواہ کی
مسابقت پیدا ہوگئی تھی جو کہ عام ملکی مفاد کے واسطے مضر تھی، پھر یہ
کمپنیاں بھی خود مختار نہ تھیں بلکہ حکومت کے انجینیروں کو نگرانی کے
وسیع اختیارات حاصل تھے جو ریلوں کے کام میں مزید مشکلات پیدا
کیا کرتے تھے، اس کا نتیجہ اس قدر مضر تھا کہ مسٹر رابرٹسن کو قطعی طور پر ۱۳۱
اپنی رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ یا تو ریلوں کا انتظام بالکل سرکاری ہو
یا پھر پورے طور پر کمپنیوں کے سپرد ہو[3]۔ تجارت خارجہ کی کشمکش اور
اس دوعملی انتظامی حکمت عملی کی وجہ سے ایک اہم خدمت جس کو
ریلیں انجام نہیں دے رہی تھیں یہ تھی کہ انھوں نے اپنی لائینوں کے
پاس کی مقامی صنعتوں کو ترقی دینے سے قطعاً لاپروائی اختیار کر لی تھی[4]۔

---

۱ ہندوستانی صنعتی کمیشن کی رپورٹ ۱۹۱۶-۱۸ء باب انیس۔
۲ ٹی رابرٹسن (اسپیشل کمشنر) ہندوستانی ریلوں کے نظم و نسق اور کارگزاری کی رپورٹ (۱۹۰۳ء)۔
۳ و ۴ حوالہ جات گزشتہ ابواب اول و سوم۔

ریلوں کا ساز و سامان یعنی ڈبے اور انجن وغیرہ، بیسویں صدی کے آغاز تک، تجارتی ضروریات کے لحاظ سے کافی رہے، لیکن اس کے بعد جب اندرونی و بیرونی تجارت کا دائرہ بڑھنے لگا تو یہ چیزیں، مال و اسباب کا ساتھ نہ دے سکیں، ڈبوں اور انجنوں کی اس کمی نے بعض اوقات بڑے بڑے نتائج پیدا کیے مثلاً سنہ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء کے قحط میں ریلیں صوبہ جات متوسط کے پیش کردہ غلے کو گجرات پہنچانے میں ناکام رہیں، سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد سے یہ دشواری اور زیادہ شدید ہو گئی۔[1] مال و اسباب میں کثیر اضافے، بالخصوص غلے کوئلے اور خام معدنیہ کی بڑی مقداروں کو منتقل کرنے کی ضرورت نے یہ صورت پیدا کی، اور اب انجن اور مال گاڑیوں، چند راہی اسٹیشنوں اور بغلی پٹریوں وغیرہ میں اضافے کی حمایت کی جانے لگی۔[2] لیکن بعض وقت یہ صورت اس طرح پیدا ہوتی کہ ریلوں کے قابو سے باہر ہوتی تھی، ان مقامات پر جہاں آمد و رفت یک طرفہ تھی اور کسی مختصر سے وقت میں مجتمع ہو جاتی تو اس زمانے میں گھماگھمی کا ہو جانا لازمی تھا، کراچی کے ذریعے سے پنجاب کے گیہوں کی برآمد کا یہی حال تھا اور یہی صورت برما کے چاول کی دریائی نقل و حمل کی تھی۔[3]

ریلوں کی تعمیر کے براہ راست اثرات یہ ہوئے کہ سارے ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ اشیائے خوردنی کی قیمتیں ایک سطح پر آگئیں، زرعی خام پیداواروں کی برآمد بڑھ گئی، برآمدی فصلوں کی کاشت میں اضافہ ہوا اور اندرونی تجارت کو بھی اچھی خاصی

---

[1] ہندوستانی ریلوں کے مالیے اور نظم و نسق کی کمیٹی کی رپورٹ (سنہ ۱۹۲۱ء)۔

[2] ایف، نول پیٹن: برمی چاول (سنہ ۱۹۱۲ء) نیز ملاحظہ ہو ان کی کتاب ہندوستانی گیہوں اور غلوں کے بالائی گودام۔

تقویت پہنچی۔ ریلیں ہندوستانی صنعتوں خصوصاً کوئلے اور روئی کی ترقی کی معاونت کا باعث بھی ہوئیں، مثلاً کوئلے کی صنعت کا سارا مسئلہ کان سے مقام صرف تک لے جانے کا سوال تھا؛ بعض اسباب جو ۱۳۲ اوپر بیان کیے گئے انھوں نے صنعتی ارتقا کے ذیل میں ریلوں کو ہندوستان کی صنعتی ترقی میں وہ حصہ نہیں لینے دیا جتنا کہ عام حالات میں لینا چاہیے تھا۔

ریلوں کی تعمیر کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں پختہ سڑکوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری رہا، شاہراہ لاینوں کی حکمت عملی کی وجہ سے عمدہ سڑکوں کی ضرورت ناگزیر ہوگئی، کیونکہ ان کے بغیر ریلوں سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا سڑکوں کی تعمیر میں بھی ریلوں کی طرح تیزی سے اضافہ ہوا ریلوں کی بہ نسبت، سڑکوں کی تعمیر نے ہندوستان کی دیہی زندگی کو براہ راست زیادہ متاثر کیا، سڑکوں نے دیہی معیشت میں ہفتہ واری بازاروں کی اہمیت بڑھا دی، نیز مقامی میلوں کی اہمیت بھی بڑھ گئی، اور اسی کے ساتھ ریلوں کی توسیع نے ان بازاروں اور میلوں کے ذریعے سے سارے ملک میں بدیسی سامان کی تقسیم کو ممکن بنا دیا۔ سڑکوں کی تعمیر نے دیہات کی خود کفالتی حیثیت ختم کر دی اور دیہی کاشت کی نوعیت اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی اب کم از کم دیہات کے ملحقہ دائرے میں کسی حد تک تخصیص کا امکان پیدا ہو گیا، اس طرح ذرائع نقل و حمل کی توسیع نے دیہی جماعت کے مشترک رشتے کو توڑنے میں بڑا خاص حصہ لیا ہے۔

فصل دوم

آبپاشی

اگر ریلوں کی تعمیر قحطوں کی مشکلات پر غالب آنے کا ایک جدید طریقہ تھا تو ذرائع آبپاشی ایک پرانی صورت تھی، جنوب کی شاندار "انی کٹین[1]"، جن میں سے بعض بہت قدیم ہیں، اس بات کی شاہد ہیں۔ نیز اس طرح کی مغل شاہنشاہوں کی گنگا وجمنا سے نکالی ہوئی متعدد نہریں، دریائے سندھ کی سیلابی نہریں، تالاب، کنویں، بند اور پشتے جو ملک کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستانی اپنی فصلوں کی سیرابی کی طرف خاص توجہ کرتے تھے۔ برطانوی راج میں، ہندوستان میں ذرائع آبپاشی کی تعمیر کا کام قدیم ہندوستانی حکمرانوں اور ہندوستانی کاشتکاروں کے دستور کے مطابق ہی شروع ہوا، اور انجینیری کے جدید طریقوں نے اس کا پیمانہ بہت وسیع کر دیا جو پہلے ممکن نہ تھا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم ہندوستان پر اچھی طرح جم گئے تو اس نے اس مسئلے کی طرف کچھ توجہ کی، اس سلسلے میں جو ابتدائی کام کیے گئے وہ بے التفاتی کا شکار ہونے والے قدیم ذرائع یعنی جمنا کی شرقی اور مغربی نہریں، اور کاویری اور کولی رون کے ۱۲۴

[1] انی کٹ نہروں کو کہا جاتا ہے یہ جنوب کی غالباً کسی مقامی زبان کا لفظ ہے (مترجم)۔

انی کٹوں کی تجدید تھی۔ آبپاشی کے چند نئے ذرایع بھی تعمیر ہوئے مثلاً نہر گنگ، نیز گوداوری کا انی کٹ بھی اسی دور میں مکمل ہوا جو سرارتھر کاٹن کا کارنامہ تھا، کمپنی کا دورِ حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی ان علاقوں میں ذرایع آبپاشی کی تعمیر جاری رہی، بلکہ کام اور زیادہ سرعت سے ہونے لگا، ان کی تعمیر ہمیشہ حکومت ہی کی جانب سے ہوئی، خانگی کمپنیوں کے طریقے کو آزمایا گیا لیکن وہ بالکل ناکام رہا۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء کے درمیان جو بڑے کام شروع ہوئے ان میں گنگا کی زیرین نہر، نہر آگرہ پنجاب کی نہر سرہند اور رکھڈک واسلا کا بند تھا جو بمبئی دکن علاقے میں سب سے پہلا برطانوی کارنامہ ہے، ۱۸۸۰ء تک ترقی کی رفتار اچھی نہیں رہی، رقم کا بڑا حصہ بعض جلد بازانہ تجاویز پر ضایع کیا گیا، اور ذرایع آبپاشی کے لیے کوئی معین حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی۔ آبپاشی کی قدر ہمیشہ قحطوں کے زمانے میں تسلیم کی جاتی رہی، اور ذرایع آبپاشی میں توسیع تمام قحط کمیشنوں کی خاص سفارش ہوا کرتی تھی ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے کام کے ایک باقاعدہ لایحۂ عمل کی سفارش کی، جن میں سے اکثر کی تکمیل ۱۸۹۵ء تک ہو گئی۔ یہ پنجاب میں ستلج و چناب کی نہریں اور صوبہ جات متحدہ میں زیرین گنگا اور بیتوا کی نہروں کا سلسلہ تھا۔ کٹک اور ہگلی کے درمیان کشتیاں چلنے والی نہروں کی تکمیل ہوئی، ذخیرۂ بیمہ امداد قحط خود ۱۸۷۷-۱۸۷۶ء کے قحط کا ایک براہ راست نتیجہ تھا اس ذخیرے سے متعدد تامینی کاموں مثلاً ریلوں اور نہروں کی امداد کی گئی۔ تامینی کاموں کے آغاز کا سلسلہ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوا جب اس سال بندیل کھنڈ میں نہر بیتوا کی اسکیم کی منظوری دی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء تک ہندوستان کے دوسرے حصوں خصوصاً بمبئی دکن علاقے میں بعض تامینی کاموں کی تکمیل ہوئی ابتدائی کاموں میں سب سے اہم کارنامہ نیرا کی

لہ اڑلیسہ کمپنی کی بدنام مثال سے مقابلہ کیجیے۔

نہروں کا سلسلہ تھا۔ سنہ ۱۸۹۶ء کے کمیشن نے بھی ایک باقاعدہ دستور العمل
تیار کیا، لیکن بعد میں جن اصولوں پر کام ہوا وہ سنہ ۱۹۰۱-۰۳ء کے آبپاشی
والے کمیشن کی سفارشات پر مبنی تھا، اس کمیشن نے اپنی رپورٹ
میں اس سارے مسئلے پر بہت ہی جامع تبصرہ کیا، نیز اس نے
قابل لحاظ کاموں کے متعلق تفصیلی سفارشات بھی پیش کیں اور ساتھ ہی ساتھ ۱۳۴
عام پالیسی کا خاکہ بھی تیار کیا، کمیشن کی توجہ اس طرف خاص طور پر
مبذول کرائی گئی کہ ذرائع آبپاشی کی توسیع کا مقصد قحطوں سے تحفظ
ہونا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۰۳ء کے بعد جن نئے کاموں کا آغاز ہوا وہ اسی کمیشن
کی سفارشات کا نتیجہ تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء تک اگرچہ بہت سی تجاویز زیر کار
تھیں لیکن ان میں سے بہت زیادہ مکمل نہیں ہوئیں۔ ان میں خاص
طور پر سندھ وغیرہ میں پیداآور ذرائع اور تامینی کاموں میں بہار
کی تری بینی کی نہر، بندیل کھنڈ میں کین کی نہر اور اسی قسم کے بعض
دوسرے ذرائع شامل تھے[۱]۔

لیکن ہندوستان میں ذرائع آبپاشی کی ترقی میں سب سے
زیادہ دلچسپ حصہ پنجاب کی نہری نوآبادیوں کی پیدائش تھی آبپاشی
کی دوسری عام تجاویز کا خاص مقصد یا تو موجودہ کاشت کو ترقی دینا
یا اس کا تحفظ کرنا تھا، لیکن پنجاب کی نہری نوآبادیاں ان افتادہ
علاقوں کو زیر کاشت لے آئیں، جہاں پہلے کوئی زرعی آبادی موجود
نہ تھی۔ پہلا اہم کام زیریں نہر چناب کا اجرا تھا جو سنہ ۱۸۹۲ء میں ہوا۔
اس علاقے کو قابل کاشت بنا کر آباد کرنے کی تجویز بہت ہی زیادہ
کامیاب ثابت ہوئی تو حکومت کو خیال پیدا ہوا کہ وہ اسی قسم کے مزید
تجربات بھی کرے۔ یہ نہری نوآبادیاں حکومت کے لیے بہت زیادہ
منافع بخش کاروبار ثابت ہوئیں اور ان کی بدولت پنجاب میں کئی ہزار

[۱] ہندوستان میں آبپاشی پر تبصرہ باب نہم (۱۹۱۸-۱۹ء)۔

مربع میل رقبہ کاشت کا اضافہ ہوگیا' اور انھوں نے شرقی پنجاب کے گنجان اضلاع کی آبادی کے دباؤ میں بڑی کمی کر دی' جہاں سے کہ آباد کاروں کا بڑا حصہ بھرتی کیا گیا تھا۔

۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے اندازہ لگایا کہ اس وقت برطانوی ہند میں کل رقبۂ آبپاشی ۲۹۰ لاکھ ایکر تھا۔ ۱۹۰۲ء میں کمیشن آبپاشی نے ہندوستان کے رقبۂ آبپاشی کا اندازہ ۴۴۰ لاکھ ایکر کیا۔ اس کا تخمینہ تھا کہ انیسویں صدی کے آخری ربع حصے میں حکومت کے رقبۂ آبپاشی میں ۸۰ لاکھ ایکر اور خانگی رقبے میں ۳۰ لاکھ ایکر کا اضافہ ہوا' ۱۹۱۳-۱۹۱۲ء میں کل رقبۂ آبپاشی ۴۶۸ لاکھ ایکر تھا۔

ہندوستان میں ذرائع آبپاشی کی دو قسمیں کی گئی ہیں' تمام ذرائع یا تو کلاں ہیں یا خورد کلاں ذرائع میں اصل اور اخراجات کی تفصیل الگ الگ رکھی جاتی ہے' خورد ذرائع میں اس قسم کی تفصیل علیحدہ نہیں رکھی جاتی۔ کلاں ذرائع کو پھر پیدا آور اور تامینی ذرائع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پیدا آور ذرائع وہ ہیں جہاں نہر کی تعمیر سے رقبۂ کاشت میں اضافہ ہو یا فصلوں کی قیمت اس قدر بڑھ جائے کہ جو آبیانہ ادا کیا جائے اس سے تعمیر کی لاگت پر اچھی خاصی شرح سے سود ملنے لگے تامینی ذرائع وہ ہیں جن سے کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہوتی' بلکہ بعض اوقات تو ان سے اصل لاگت بھی وصول نہیں ہوتی' لیکن جو اپنے تعمیری علاقوں کو قحطوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بیحد ضروری ہیں' پیدا آور ذرائع بیشتر گنگا اور سندھ کے میدانوں' سندھ کی سیلابی نہروں اور صوبۂ مدراس کے ڈیلٹائی علاقوں میں واقع ہیں اور تامینی ذرائع زیادہ تر بمبئی' مدراس دکن اور بندیل کھنڈ وغیرہ کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

صرف یہی نہیں ہے کہ ذرائع آبپاشی کی تعمیر ہر جگہ منافع بخش نہیں ہے بلکہ ہر جگہ ان کی حتیٰ کہ تامینی ذرائع تک کی توسیع بھی قطعی طور پر

محدود ہے۔ اس سلسلے میں کمیشن آبپاشی نے بتایا کہ "ہم کو اس بات کا یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے اکثر حصے ایسے ہیں جہاں ذرایع آب پاشی کی ہر ممکنہ کوشش کے باوجود بارش کی قلت کا پورا تحفظ نہیں ہوسکتا۔[1] ہندوستان میں جو ذرایع آبپاشی تعمیر ہوئے ان سے خاص طور پر صرف ملک کے چند علاقے ہی مستفید ہوئے۔ ارکان آبپاشی کمیشن نے ہندوستان کو زمین کی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا تھا۔

(ا) دریا برآمد۔

(ب) سنگ ریزہ۔

(ج) دکن کا چٹانی علاقہ۔ دریا برآمد زمین زیادہ تر سندھ اور گنگا کا میدان ہے۔ خاص دکن دکنی چٹانی علاقے پر مشتمل ہے اور باقی ہندوستان اور خصوصاً صوبۂ مدراس، میسور، اڑیسہ، اور چھوٹا ناگپور سنگ ریزی علاقہ ہے۔ انھوں نے تخمینہ لگایا تھا کہ دریا برآمد حصے کا ۲۵ فی صدی اور سنگ ریزی علاقے کا ۱۵ء۵ فی صدی حصہ آبپاشی کے تحت ہے اور دکن کے چٹانی علاقے میں صرف ۳ء۲ فی صدی حصہ آبپاشی سے محفوظ کیا گیا ہے، تمام بڑے دریا اول الذکر حصوں میں بہتے ہیں، لیکن سطح کی ہمواری کی وجہ سے دریا برآمد حصے میں نہریں بنانا سب سے آسان ہے، سنگ ریزی علاقوں میں آبپاشی کے لیے تالابوں کی صورت میں پانی جمع کرنا زیادہ موزوں ہے، لیکن تیسرے حصے میں بڑے دریاؤں کی کمی اور زمین کی نوعیت کی وجہ سے تعمیر بہت ہی گراں ہو جاتی ہے، اس طرح سرکار کے ذرایع آبپاشی کی وسعت کا دائرہ محدود ہو گیا ہے، نیز ان کاموں سے افادہ کی صلاحیت کو بھی سارے ملک پر برابری سے نہیں پھیلایا جاسکتا تھا

۱۲۶

[1] آبپاشی کمیشن کی رپورٹ، باب دوم۔

سرکار نے جن ذرائع کی تعمیر کی وہ سارے میدان پر تھے بعض نہ تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کل رقبہ آبپاشی کا صرف ۲ ، ۲۴ فی صدی، سرکاری ذرائع سے سیراب ہوتا تھا اور بقیہ کی آبیاری خانگی ذرائع سے ہوتی تھی خانگی ذرائع میں سب سے زیادہ اہم صورتیں تالاب، کنوؤں اور کنٹوں کی تھیں۔ ایسے قابل اعتبار اعداد موجود نہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ خانگی ذرائع سے سیراب ہونے والے رقبے میں کس حد تک اضافہ ہوا، مگر کمیشن آبپاشی کا اندازہ تھا کہ اس کی مقدار بہت کافی تھی، یہاں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان ذرائع سے بھی اول الذکر دونوں حصے ہی زیادہ مستفید ہوئے دکن کے چٹانی علاقے میں آبپاشی کا اہم ذریعہ صرف کنوؤں کی تعمیر ہی تھی، لیکن اس حصے میں سطح آب کی گہرائی اور زمین کی نوعیت کے لحاظ سے کنواں کھودنا بہت زیادہ گراں پڑتا تھا، البتہ یہ بات ضرور تھی کہ جب ایک مرتبہ بن جاتا تو دوسرے حصوں کے مقابلے میں زیادہ پائدار ہوتا تھا، کنٹوں کا مقصد کھیتوں میں بارش کے پانی کو جمع کرنا اور پانی کے بہاؤ سے زمین کٹ جانے کی ضرورت کو روکنا تھا[1] ان تمام ذرائع کے فوائد کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا تھا اور جب کاشتکار کے حالات اور ذرائع اجازت دیتے وہ ان میں توسیع کیا کرتا تھا۔ خانگی ذرائع آبپاشی کی مزید توسیع کے لیے اراکین آبپاشی کمیشن نے تقاوی امداد کو آسان شرائط پر دینے کی پُرزور حمایت کی تھی۔

آب پاشی ہمیشہ ایک خاص نعمت ہی نہیں رہی، اور پانی کی نکاسی کا اچھا انتظام نہ ہونے کی صورت میں اکثر پانی کی سطح بلند ہو جانے

[1] بعض وقت ان کی بڑی اہمیت ہوتی تھی، مثلاً صوبۂ بمبئی کے اضلاع خاندیس اور ناسک میں بھنڈاروں کا طریقہ تھا۔

اور ملیریا کی شکایات پیدا ہو جاتی تھیں۔ بعض ابتدائی نہروں میں تعمیر کے وقت اس خرابی کو محسوس نہ کیا گیا، اور آس پاس کی زمین کے پانی کی نکاسی پر کوئی خاص توجہ نہ کی گئی، صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں پانی کی سطح بلند ہو جانے کے ساتھ ہی نمکین قسم کا ایک مادہ جو "ریہہ" کہلاتا تھا زمینوں پر جمنے لگا، جس نے زمینوں کو غیر زرخیز بنا دیا، اس خرابی کا واحد علاج نہروں کی تعمیر سے قبل اور تعمیر کے زمانے میں پانی کی نکاسی کا عمدہ انتظام ہی ہے۔

۱۳۷ آبپاشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی وجہ سے موسموں کی پریشانیوں کا خوف بڑی حد تک کم ہو گیا اور جب ہم ہندوستان پر قحط کے شدید اثرات کو پیش نظر رکھیں تو اس کی قدر کا بخوبی احساس ہو جائے گا، اس طرح آبپاشی نے نہ صرف براہ راست زائد خوشحالی کے آثار پیدا کیے بلکہ قحطوں کے تمام برے اثرات یا ان کے اندیشوں کو بھی زائل کر دیا۔ اس کا سب سے اہم فائدہ بخش اثر یہ ہوا کہ اس نے زرعی اصلاح کی ہمت افزائی کی، اور کاشتکار کا دل بڑھایا کہ وہ بارش کی غیر یقینی حالت سے نڈر ہو کر اپنی زمین پر اصل لگائے چنانچہ جہاں اس قسم کے تحفظات موجود نہ تھے وہاں اور سیراب ہونے والے علاقوں کے طریق کاشت میں جو بین فرق نظر آتا ہے وہ بہت نمایاں ہے، اس فرق کی سب سے اچھی مثال نیرا اور سنتھا کے نہری رقبوں اور بمبئی دکن کے دوسرے حصوں کے زرعی معیار میں نظر آتی ہے، مزید براں کاشتکار کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اگر وہ ایک سیرابی قطعۂ زمین پر آبیانہ اور زائد لگان ادا کرنا چاہتا ہے تو زائد منافع بخش فصلوں مثلاً نیشکر کی کاشت عمیق طریقے پر کرے۔ گویا اس طرح ان دو اسباب یعنی پیداوار کے نسبتہً مستقل ہونے کا یقین اور اعلیٰ لگان اور دوسرے مطالبات نے زائد منافع بخش اور مخصوص فصلوں کی عمیق کاشت کرنے کی ترغیب

دی۔ کاشتکار کے لیے حسبِ معمول اپنے خاندان کے خرچ کے واسطے اشیائے خوردنی کی کاشت کرنا قطعاً منافع بخش نہ رہا۔ وہ مجبور تھا کہ زائد قیمت والی فصل کی کاشت کرے جس کی مانگ بیرونی بازار میں ہو' خواہ یہ بازار ہندوستانی ہو یا بیرونی۔ اثرات ایک ہی تھے خواہ وہ پنجاب کا گیہوں ہو یا دکن کی نیشکر' اس نے زرعی تجارتیت کی تحریک میں بڑی امداد کی اور لازمی طور پر گھر کے بجائے بازار کے واسطے پیدا کرنے کے رجحان کو کافی تقویت پہنچائی۔

باب دہم

قصبات کا نشوونما[1]

ڈاکٹر کلاپ ہم کہتے ہیں کہ "موجودہ حالات میں کسی قوم کی زندگی کی صنعتی ترقی کا اندازہ کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ اس کے قصبوں کی شرح اضافہ اور ان کی نوعیت ہی ہے۔"[2] لہذا ہندوستان کی حالیہ صنعتی ترقی پر کچھ روشنی اس طرح ڈالی جائے کہ ہندوستانی شہری آبادی کے اضافے کی شرح اور نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

اگرچہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن یہ ایک مشہور بات ہے کہ ہندوستان کی شہری ترقی اس کی صنعتی ترقی سے زیادہ بڑھی ہوئی رہی، مثلاً ہم کو معلوم ہے کہ کلائیو کی رائے میں اس زمانے میں مرشد آباد، لندن سے زیادہ آباد تھا۔ اس وقت شمالی ہند اور بنگال میں اکثر شہر بڑے اور کافی آبادی والے تھے، پھر ہمارے پاس یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں ہیں کہ سنہ ۱۸۰۰ء اور سنہ ۱۸۷۲ء کے درمیان ہندوستان کی شہری آبادی ترقی کر رہی

[1] یہ باب تمام تر مختلف مردم شماریوں کی مرکزی اور صوبہ جاتی رپورٹوں پر مشتمل ہے۔

[2] ایچ، کلاپہم، فرانس اور جرمنی کا معاشی ارتقا ۱۸۱۵ء–۱۹۱۴ء ص ۵۳ (سنہ ۱۹۲۱ء)

تھی۔ اس زمانے میں جن چند شہروں میں ترقی ہوئی وہ یا تو کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے بندرگاہ تھے یا کانپور کی طرح بعض اندرونی مقامات۔ لیکن اس کے برخلاف قدیم دارالحکومتوں مثلاً ڈھاکہ، مرشدآباد، لکھنؤ، تنجور وغیرہ کی آبادی میں نمایاں کمی نظر آتی ہے، البتہ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں جدید صنعتیں تقریباً موجود نہ تھیں، اور ذرائع نقل وحمل کی سہولتوں میں ابھی تک کوئی خاص اضافہ نہ ہوا تھا تو اغلباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس صدی کی ابتدا میں ۱۸۷۲ء کے مقابلے میں شہری آبادی کا تناسب بڑھا ہوا تھا۔ ۱۸۷۲ء میں شہری آبادی ۸ء۸ فی صدی تھی، لہٰذا اس صدی کے آغاز پر شہری آبادی کا تناسب کم از کم ۹ سے ۱۰ فی صدی کے درمیان رکھا جاسکتا ہے، انیسویں صدی کے آغاز میں مغربی ملکوں کی شہری آبادی کا فی صدی یہ تھا۔ انگلستان اور ویلز ۲۱ء۳، اسکاٹ لینڈ ۱۷ء۰، فرانس ۹ء۵، پروشیا ۲ء۲۵، روس ۳ء۷، ریاست ہائے متحدہ امریکا ۳ء۸۰[1] اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس صدی کے آغاز پر ہندوستان کی شہری ترقی کم سے کم فرانس کی شہری ترقی کے برابر ضرور تھی۔

ان قصبوں کی آبادی کی نوعیت کا حال بیان کیا جاچکا ہے، ہندوستان کی آبادی کے گھٹنے سے پہلے حاصل شدہ اعداد ۱۸۷۲ء کے ہیں لیکن ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کے نتائج کی صحت خود مشتبہ ہے لیکن بعد کی مردم شماریاں اچھی خاصی صحیح تھیں، ہندوستان کی شہری آبادی کے اعداد میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ قصبے کی تعریف میں ہر مردم شماری میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا رہا ہے، صرف یہی نہیں ہوا بلکہ مردم شماری کے صوبہ واری ناظموں نے اس تعریف کی تادیل اپنے لحاظ سے الگ الگ کی، عام طور پر

[1] اے، یف، ویبر، انیسویں صدی میں شہروں کی ترقی (۱۸۹۹ء)۔

قصبے کی تعریف یہ کی گئی کہ وہ جگہ جس کی آبادی پانچ ہزار سے زائد ہے یا وہ مقام جس کی آبادی دو ہزار سے زائد ہو مگر اس میں شہری خصوصیات موجود ہوں، لیکن اسی کے ساتھ اکثر وہ مقامات جن کی آبادی پانچ ہزار سے زائد تھی ان کو محض بڑے گاؤں سمجھ کر فہرست میں شامل نہیں کیا گیا، لہٰذا دس ہزار سے کم آبادی والے قصبوں کے اعداد بہت زیادہ مشتبہ ہیں لیکن شہری حدود کی مسلسل تبدیلی کی وجہ سے یہ دشواری ہر ملک میں پیش آئی ہے اور یہ ان اعداد میں بھی موجود ہے لیکن بحیثیت مجموعی عام حالات میں اور بڑے درجوں میں تقابل کے لحاظ سے یہ اعداد بالکل قابل اعتماد ہیں۔

لیکن پھر ہندوستان کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے ان اعداد پر بحث کرنے میں بعض دشواریاں ہیں، کیونکہ ان میں بڑا اختلاف ہے مثلاً صوبۂ بنگال میں کل آبادی کے لحاظ سے شہری آبادی کا تناسب صرف ۵ فی صدی ہے لیکن صوبۂ بمبئی میں یہ ۱۷ فی صدی سے زیادہ ہو گیا ہے، بدقسمتی سے موجودہ زمانے میں صوبوں کے انتظامات اس قدر الگ پیچ ہیں کہ ان میں سے کسی میں بھی کوئی ہم آہنگ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ مختلف معاشی علاقوں میں یہ اختلافات اور بھی زیادہ وسیع ہیں، مثلاً چھوٹے ناگپور کی سطح مرتفع پر آبادی کا تین فی صدی حصہ قصبوں میں رہتا ہے، اس کے برخلاف گجرات کے گنجان صوبے میں آبادی کا پانچواں حصہ قصبوں کا رہنے والا ہے، اگر ہم ان شدید مثالوں کو نظر انداز کر دیں تو ہم کو ہندوستان کے بیشتر مقامات پر کل آبادی کے لحاظ سے تناسب ۸ سے ۱۲ فی صدی کے درمیان نظر آتا ہے اگرچہ تناسب میں اختلاف ہے لیکن قصباتی آبادی کی نوعیت اور اس کی آبادی کو بڑھانے یا گھٹانے والے اسباب ہر جگہ ایک ہی رہے۔

عہدہ داران مردم شماری نے قصبوں کو مختلف درجوں میں تقسیم

کیا ہے، لیکن ان کی مکمل تقسیم کو یہاں اختیار کرنا غیر ضروری ہے[1] ہم تین قسم کی تقسیم کریں گے، چھوٹے قصبے جن کی آبادی بیس ہزار یا اس سے کم ہے، درمیانی قصبے جن کی آبادی ۲۰ ہزار سے ۵۰ ہزار کے درمیان ہے، اور بڑے قصبے یا شہر جن کی حد ہندوستان میں پچاس ہزار اور اس سے زائد رکھی جا سکتی ہے، چھوٹے قصبوں میں بیس ہزار کی حد مقرر کر دینے سے چھوٹے قصبوں کے ناقابل اعتبار اعداد خود بخود خارج ہو جاتے ہیں، مختلف مردم شماریوں میں کل آبادی کے لحاظ سے شہری آبادی کا تناسب حسب ذیل رہا ہے۔

۱۸۷۲	۸٫۷۲	فی صدی
۱۸۸۱	۹٫۴۱	”
۱۸۹۱	۹٫۴۶	”
۱۹۰۱	۹٫۸۸	”
۱۹۱۱	۹٫۴۲	”
۱۹۲۱	۱۰٫۲۰	”
۱۹۳۱[2]	۱۱٫۰۰	”

اس نقشے سے کسی خاص سمت میں کسی غیر معمولی تغیر کا پتا نہیں چلتا جن عشروں میں تناسب میں کسی قدر اضافہ ہوا ہے وہ سالہا ۱۸۷۲-۱۸۸۱ء اور سالہا ۱۸۹۱-۱۹۰۱ء ہیں، سالہا ۱۸۸۱-۹۱ء کے درمیان تناسب برقرار رہا اور سالہا ۱۹۰۱-۱۱ء میں تو اس میں حقیقی کمی ہو گئی، سالہا ۱۹۲۱ء کی رپورٹوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ اس عشرے میں تھوڑا سا اضافہ ہوا مگر اس سے کوئی خاص تغیر واقع نہیں ہوا۔

---

[1] جدول باب کے اختتام پر ملاحظہ ہو۔

[2] مقابلے کی خاطر جا بجا سالہا ۱۹۳۱ء کے اعداد بھی درج کر دیے گئے ہیں، رپورٹ مردم شماری سالہا ۱۹۳۱ء جلد اول حصہ اول صفحہ ۴۹ (مترجم)۔

سنہ ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کی عدم صحت کی بنا پر یہ امر خود مشتبہ ہے کہ آیا سنہ ۱۸۷۲ء-۱۹۲۱ء کے درمیان جو اضافہ ہوا وہ واقعی اتنا ہی ہے جتنا کہ ظاہر ہوتا ہے، اور اگر ملک کی کل آبادی کے اضافے کے لحاظ سے شہری آبادی میں کچھ اضافہ ہوا تو وہ بہت ہی قلیل تھا۔

تناسب میں اسی قسم کی یکساں حالت ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب ہم شہری آبادی کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں یعنی کیا مختلف درجوں کے تناسب میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ یہ بھی کم و بیش ایک ہی سی حالت میں رہی۔

کل شہری آبادی کے لحاظ سے تینوں قسم کے قصبوں کی آبادی کا فیصد

رہنے والوں کی تعداد	سنہ ۱۸۷۲ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۳۱ء
بیس ہزار اور اس سے کم	۴۷،۳	۴۷،۴	۴۵،۵	۴۲،۷
بیس اور پچاس ہزار کے درمیان	۱۸،۳	۱۸،۷	۱۸،۳	۲۰،۹
پچاس ہزار اور اس سے زائد	۳۴،۴	۳۳،۹	۳۶،۲	۳۶،۴

۱۴۱ اگر یہ دور مجموعی حیثیت سے لیا جائے تو ہمیں لی ویز یور کے مفروضے میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا کہ انسانی جتھوں کو ترغیب دینے والی قوت عام طور پر ان کی کثیر التعدادی کے متناسب ہوتی ہے[1]۔ اصل میں

[1] دیکھو حوالہ گزشتہ باب نہم۔

بڑے قصبے اپنی حیثیت گنوا بیٹھے تھے اور ان سے جس چیز کا اظہار ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سالت ۱۹۰۱ء میں ہندوستان کی شہری آبادی میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا وہ ایک لاکھ سے زائد آبادی والے قصبوں میں تھا۔

اس طرح شہری آبادی کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے ہم کو کوئی خاص مدد نہیں ملتی اگر ان سے کوئی چیز ظاہر ہوتی ہے تو وہ صرف ہندوستان کا معاشی جمود ہے، لہٰذا ہم یہاں مجبور ہیں کہ ان دوسرے مختلف اسباب پر نظر ڈالیں جو گزشتہ چالیس سال کے اندر ہندوستانی قصبوں کی ترقی میں کارفرما رہے ہیں۔

سب سے اہم سبب جو اس وقت ہندوستان میں قصبوں کی ترقی کا باعث ہو رہا تھا وہ ریلوں کی تعمیر تھی، یہ ایک ایسا سبب تھا جو دو طرح سے قصبات کی ترقی کو متاثر کر رہا تھا، اول یہ کہ کسی قصبے سے ریل گزرنے کے یہ معنی تھے کہ اس کی تجارت میں ترقی ہوگی اور اگر قصبہ پہلے ہی سے تجارتی مرکز تھا تو ریل اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ریل جن مقامات سے گزرتی وہاں نئے تجارتی مرکز پیدا کر دیتی تھی، اگر اس طرح ریلیں قصباتی آبادی کو بڑھانے کا ایک سبب ہوئیں تو ان کا متضاد اثر بھی پڑا۔ ریلوں کی تعمیری ضروریات اکثر اس بات کی متقاضی تھیں کہ پرانے تجارتی مرکزوں کو ریل کی گزرگاہ سے چھوڑ دیا جائے، اس نے قدرتی طور پر تجارت کے قدیم راستوں میں تقسیم پیدا کر دی اور پرانے قصبوں کو تنزل پذیر بنا دیا۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر ریلوں سے قطع نظر کر لی جائے تو وہ دوسرے اسباب جو قصباتی آبادی میں اضافے کا باعث ہو رہے تھے یہ تھے:-

(۱) نئی یا پرانی صنعتوں کی ترقی۔

(ب) قحط
(ج) ذاتی زمین نہ رکھنے والے مزدور طبقے کی پیدائش۔
(د) دولتمند زمینداروں اور دوسرے لوگوں کا قصبوں میں رہنے کا رجحان۔ ان مختلف اسباب میں صنعتوں کی ترقی ہی ایک ایسا سبب ہے جو تمام دوسرے ملکوں میں شہروں کی ترقی کا ایک اہم عنصر رہا ہے، لیکن ہندوستان میں اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں رہا۔ اس وقت ہندوستان میں بمشکل چند ایسے شہر ملیں گے جو نئی صنعتوں کی بدولت پیدا ہوئے ہوں، البتہ جمشید پور قطعی طور پر استثنائی صورت رکھتا ہے، جس کے قیام کا تمام تر سہرا ٹاٹا کے لوہے اور فولاد کے کارخانے کے سر ہے، لیکن دوسرے شہروں کی ایسی صورتیں بہت ہی شاذ ہیں جہاں محض صنعتوں کی بدولت ترقی ہوئی ہے۔ ۱۴۲

نئی صنعتوں کی پیدائش یا ترقی کے مقابلے میں ہندوستان میں قحطوں کا سلسلہ، زیادہ نمودار ہونے والی صورتوں میں شامل تھا، قحطوں کی بدولت شہری آبادی میں کافی اضافہ ہوا، قحط کے زمانے میں دیہی آبادی بے روزگار ہو جاتی تھی اور چونکہ کھیتوں پر کوئی کام نہ ہوتا تھا اسلیے وہ کام کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتی تھی، پرانے زمانے کے قحطوں میں آبادی کا شہروں کی طرف نقل وطن کرنے کا رجحان بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۶۸ء کے راجپوتانے کے بڑے قحط کے زمانے میں آگرہ، دہلی اور دوسرے ملحقہ شہروں کی آبادی تقریباً دوگنی ہو گئی لیکن ذرائع نقل وحمل کی ترقی اور اچھے امدادی طریق کی ترقی کی بدولت شہروں کی طرف نقل پذیری کی یہ خصوصیت بڑی حد تک رک گئی تھی لیکن اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دو عشروں یعنی ۱۸۷۲-۸۱ء اور ۱۸۹۱-۱۹۰۱ء جن میں شہروں کی طرف رجوع ہونے کی خصوصیت زیادہ نمایاں رہی، دونوں ایسے

عشرے تھے جن میں سارے ہندوستان میں بڑے قحط پڑے تھے لیکن یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اگرچہ قحط لوگوں کو قصبوں کی طرف دھکیل دیتے تھے لیکن جب تک قصبوں میں ایسے پیشے نہ ہوں جن میں اس کثیر آبادی کی کھپت ہو۔ یہ رجحان عارضی نوعیت سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا، اس قسم کے پیشوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے لوگوں کے وہ جتھے جو شہروں میں امنڈ کر آجاتے تھے، جیسے ہی ان کو زرعی روزگار ملنے کا یقین ہوجاتا وہ پھر دیہات میں واپس لوٹ جاتے تھے۔

یہی سبب ذاتی زمین نہ رکھنے والے مزدور طبقے کی پیدائش کے متعلق پیش کیا جاسکتا ہے، اس طبقے کی پیدائش کا ایک سبب تو قحطوں کے نتائج تھے، نیز خود کاشت زمینداروں کی بتدریج بے دخلی کے رجحان کو بھی اس میں دخل تھا، جو ہندوستان میں تقریباً پچاس سال سے کام کر رہا تھا، بلا اراضی والے مزدور طبقے کی پیدائش محض منفی طور پر شہریت کی پیدائش میں مدد یا ترقی کا باعث ہوتی ہے، خود کاشت زمینداروں کی طرح یہ طبقہ زمین سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا، لہٰذا یہ بہت آسانی سے قصبوں میں نقل پذیری کے لیے تیار ہوجاتا ہے، لیکن یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ لوگ قصبوں میں اسی صورت میں توطن اختیار کرسکتے ہیں جبکہ وہاں ان کو روزگار مل جائے، حقیقۃً کسی آبادی کی نقل پذیری کے لیے کوئی موثر ترغیب ہونا چاہئے، اگر یہ ترغیب بڑھی ہوئی اجرت کی شکل میں یا عام معیار زندگی کے اضافے کی صورت میں موجود ہو تو بڑی طاقتور ہوجائے گی۔

سب سے آخر میں ہم مالدار زمیندار اور دوسرے لوگوں کے قصبوں میں رہنے کے رجحان سے بحث کریں گے، اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں شہری زندگی میں کچھ ایسی دلفریبیاں پیدا ہوگئیں ۱۴۳

ہیں جس کی وجہ سے غائب زمینداری طریق کو تقویت پہنچی اور اس طرح قصبوں کی کچھ آبادی میں اضافہ ہو گیا۔
لیکن یہ ظاہر ہے کہ مالدار طبقوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی، لہٰذا اس کا تعدادی پہ کچھ زیادہ اثر نہ پڑا تھا۔
اس طرح ان مختلف اسباب پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن اثرات کے تحت دیہات سے قصبوں میں توطن کی حقیقی اور مستقل تحریک پیدا ہوئی وہ تجارت میں اضافہ اور صنعتوں کی ترقی تھی۔
لیکن اس کے برخلاف اس وقت بعض دوسرے اثرات برعکس کام کر رہے تھے جو حسب ذیل تھے۔
(ا) تجارتی راستوں کا مختلف نئی راہوں میں میلان۔
(ب) قدیم دستکاریوں کا زوال۔
(ج) بیماریاں۔
(د) شہروں کی عدم صفائی اور مکانوں کی ابتر حالت۔ تجارتی راستوں میں تبدیلی ریلوں کی توسیع اور بعض دوسرے اسباب کا نتیجہ تھی، بہت سے قدیم قصبات کے زوال کا یہ ایک بڑا نمایاں سبب تھا۔ مثال کے طور پر ہم مرزا پور کو لے سکتے ہیں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، گنگا کے کنارے یہ اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بڑا تجارتی بازار تھا۔ یہ چھٹے عشرے میں لنکا شائر کے قحط کے زمانے میں عروج کی انتہائی حد پر پہنچ گیا تھا، شمالی اور وسطی ہند کی روئی کی ساری درآمد یہیں سے ہو کر گنگا کے زیریں حصے میں جاتی تھی، لیکن جب دریائے گنگا کے قریب ریل کی تعمیر ہو گئی تو دریائی نقل و حمل کم ہو گئی اور اس کی اہمیت گھٹ گئی۔ دوسری مثال ساگر کی ہے جو ریلوں کی تعمیر سے قبل، ایک بڑا تجارتی مرکز اور نمک کی بڑی منڈی تھا، وادی نربدا اور وسط ہند کی ایجنسی میں نمک یہیں سے تقسیم ہوا کرتا تھا، مگر تجارتی راستے کی تبدیلی

نے ساگر کی اہمیت گھٹا دی۔ لیکن صرف ریلیں ہی تجارتی راہوں کی تبدیلیوں کی تنہا ذمہ دار نہ تھیں بلکہ اس سلسلے میں دریاؤں کے راستوں کی تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، منگیان، بالائی برما کا ایک اچھا خاصا شہر تھا لیکن جب اراودی نے اپنا راستہ بدل دیا تو تقریباً بالکل تباہ ہو گیا، زیریں بنگال میں اکثر قصبے گنگا کے بہاؤ میں تبدیلی کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ مقامی تجارتی مرکزوں میں ریلوں کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے تجارت کا رخ بدل گیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ریلوں نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا، ایک قصبے کے مقابلے میں دوسرے قصبے میں ریلوں کی تعمیر میں صرف چند سال کا فصل، تجارتی راہوں میں تبدیلی کے واسطے کافی ہوا کرتا تھا۔ اس طرح کانپور کو اودھ کے غلے اور چمڑے کی تجارت میں لکھنؤ پر محض اس لیے فوقیت حاصل ہو گئی کہ کانپور میں لکھنؤ سے قبل ریل تعمیر ہو گئی تھی۔[1]

قدیم دستکاریوں کا زوال تجارتی راہوں کی تبدیلیوں سے زیادہ اہم ہے، جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے پرانے قصبوں کی صنعتیں عموماً آسائشی یا فنی مصنوعات تھیں اور ان کی خوشحالی کا انحصار درباروں اور امرا کی طلب پر ہوا کرتا تھا، درباروں کے خاتمے کے بعد طلب کا بڑا حصہ ختم ہو گیا، اگرچہ صنعتیں ایک دم تنزل نہیں ہوئیں کیونکہ وہ پرانی جمی ہوئی دستکاریاں تھیں اور ہندوستانی امرا کے یہاں ان کی تھوڑی بہت طلب باقی تھی۔ نیز یورپی باشندوں کی ہلکی پھلکی صنعت کارانہ اشیا کی مانگ پیدا ہو گئی، جس نے اگرچہ فنی نقطۂ نظر سے صنعتوں کو کمتر کر دیا مگر بہرحال دستکاروں کو گھٹنے نہ دیا لیکن تعلیم کی ریل پیل اور ہندوستانی طبقۂ پرثروا کی پیدائش کی بدولت طلب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی، دستکاریوں کو ارزاں یورپی سامان سے

[1] ہوٹے، حوالہ گزشتہ۔

مسابقت کرنا پڑی جس کی وجہ سے یہ بہت غیر اہم ہو گئیں، دستکاروں نے آہستہ آہستہ اپنے قدیم پیشے ترک کر دیے اور زراعت یا ان پیشوں میں جہاں ان کو راہیں نظر آئیں داخل ہونے لگے، اس طرح قدیم دستکاریوں کا زوال اور اس کے نتیجے میں زیادتی کی تخفیف ہندوستان کے اکثر و بیشتر قصبوں کی قسمت میں لکھی تھی، رفتار اگرچہ قدرتی طور پر سست تھی مگر بہت واضح تھی اور صرف وہ قصبے جہاں ان کے بجائے دوسرے پیشے شروع ہوئے یا صنعتیں پیدا ہوئیں بہت زیادہ خسارے میں نہیں رہے، اس قسم کی بحالی کی بڑی اچھی مثال ڈھاکے میں ملتی ہے، نوابوں کے دربار کے خاتمے کے بعد ڈھاکہ اپنی مشہور و معروف ململ کی صنعت اور دوسری دستکاریوں سمیت تیزی سے تنزل کرنے لگا اور سنہ ۱۸۷۰ء تک تنزل برابر جاری رہا، لیکن اسی زمانے میں مشرقی بنگال میں جوٹ کی کاشت بہت مقبول ہو رہی تھی اور ڈھاکے کے اردگرد جوٹ دبانے والے متعدد کارخانے قایم ہو گئے اس مزید تجارت اور صنعت کی وجہ سے ڈھاکے نے اپنی اہمیت دوبارہ حاصل کر لی اور اس میں گزشتہ پچاس سال سے برابر ترقی ہو رہی ہے، نویں عشرے میں امرتسر میں شال کی تنزل پذیر صنعت کا معاوضہ قالین کی شاداب صنعت کے قیام سے ہو گیا، بدقسمتی سے قالین کی صنعت پائدار بنیاد پر قایم نہ تھی اور اس طرح امرتسر کو دوسرے عشرے میں پھر ایک صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مرشد آباد کی صورت ڈھاکے سے بالکل متضاد تھی، کلائیو کے زمانے میں اس کی آبادی لندن سے زائد تھی لیکن الحاق کے بعد سے یہ برابر تنزل کر رہا تھا، یا مالدہ جو اپنی قدیم ریشمی صنعت کے لیے مشہور تھا یا شانتی پور جس کی ململ ڈھاکے کے بعد دوسرا درجہ رکھتی تھی، یہ مثالیں صرف بنگال سے پیش کی گئی ہیں، لیکن ایسی مثالیں ہندوستان کے ہر حصے سے پیش کی جا سکتی ہیں، بہرحال افسانہ ایک ہی ہے خواہ برما کا مانڈلے ہو یا دکن کا پٹن۔

۱۸۵

تجارتی راستوں کی تبدیلی اور دستکاریوں کا زوال قصباتی آبادی کو گھٹانے والے دو خاص اسباب تھے۔ لیکن وباؤں اور مکانات کی ابتر حالت نے بھی قصبوں کی ترقی میں مزاحمت کی، وبائیں قحطوں کے برخلاف، لوگوں کو شہر کے گنجان رقبوں سے کھلے دیہات میں منتقل کرنے کا باعث ہوتی تھیں، چنانچہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس صدی کے پہلے عشرے میں شہری آبادی کے تناسب میں جو تھوڑی سی کمی ہوئی دراصل اس کی وجہ وہ طاعونی وبا تھی جو اس عشرے میں ہندوستان کے وسیع حصوں میں پھیلی رہی، خاص طور پر یہ دکن، صوبۂ متوسط اور بہار میں بہت شدید تھی، اس وبا نے شہری آبادی کے بڑے حصے کو ہلاک کر دیا، نیز بڑی تعداد میں لوگوں کو قصبات سے نکال دیا، لیکن یہ اثر بھی قحطوں کی طرح عارضی نوعیت کا تھا اور جیسے ہی بیماری ختم ہوئی لوگ قصبوں کی طرف واپس لوٹنے لگے۔

لیکن ناقابل اطمینان صفائی اور مکانات کی قلت نے قصبوں کی ترقی کو کچھ دوسرے طریقے سے متاثر کیا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دیہات سے قصبوں کی طرف توطن کا کوئی سلسلہ تھا تو یہ اسباب اس کی راہ میں حائل تھے، کلکتے کی "بستیوں" اور بمبئی کی "چالوں" کی صفائی کے ناقابل اطمینان حالات بہت مشہور ہیں[1]۔ اور اس میں کلام نہیں کہ مکانات کی ابتر حالت نے سارے امکانی مزدوروں کو ان مقامات سے دور رکھا، مشاہدے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ کلکتے کی جوٹ کی گرنیاں مزدوروں کی بڑی شاکی رہا کرتی تھیں، لیکن ان گرنیوں کو ایسی مشکلات کبھی پیش نہ آئیں جو اپنے قلیوں کے لیے صفائی وغیرہ کے معقول انتظام کر لیا کرتی تھیں۔

---

[1] مزدوروں کے رہنے کے گنجان ترین مقامات یا مزدوروں کے اڈے کلکتے میں بستی اور بمبئی میں چال کہلاتے ہیں (مترجم)۔

ایک اور سبب بھی ہے، پرانے زمانے میں ہندوستان کے اکثر حصوں میں یہ رجحان تھا کہ شہر پناہ کے اندر اجتماع بہت زیادہ گنجان ہوتا تھا، اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ فصیل والے قصبے، لیٹروں کے جتھوں سے، جو بعض ادوار میں ہندوستان میں عام تھے، زیادہ بہتر حفاظت کر سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی کھلی ہوئی لوٹ مار گزشتہ سو سال کے عرصے میں بہت ہی کم رہی، اور اب شہر پناہوں سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا اور زراعت پیشہ لوگوں کے لیے یہاں رہنا تکلیف دہ ہونے لگا، لہذا ساتویں عشرے سے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اور بالخصوص صوبہ جات متوسط میں یہ رجحان نظر آنے لگا کہ چھوٹے قصبوں کی آبادی ادھر ادھر منتشر ہو جائے۔ ۱۴۶

اب تک محض قصبات کی ترقی کا ذکر تھا، اب ہم شہریوں کی ترقی کا حال معلوم کریں گے جو چھوٹے قصبوں کا استخفاف کر کے بڑھے، اعداد و شمار سے اس قسم کی صورت حال کا پتا نہیں چلتا لیکن جو صورت رہی اس کا ذکر مردم شماریوں کی مختلف رپورٹوں میں ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے قصبے یا تو جمود میں رہیں یا تنزل کر رہے ہیں، اور بڑے شہر ترقی کر رہے ہیں، اس کے برخلاف بعض صوبہ واری ناظموں کی رائے ہے کہ چھوٹے قصبوں میں زیادہ ترقی ہوئی لیکن یہ باور کرنے کے متعدد اسباب ہیں کہ چھوٹے قصبوں کے مقابلے میں بڑے شہروں میں اضافے کی رفتار زائد رہی سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے بڑے شہروں میں تجارت کے مجتمع ہونے کا سلسلہ جاری ہے، چنانچہ دہلی جیسے مرکزی مقام پر یہ نظر آتا ہے کہ یہاں تجارت کی زیادہ آسانیاں ہیں اور یہ نسبتۃً عمدہ بازار ہے، اس وجہ سے آس پاس کے چھوٹے قصبوں کے لوگ کھنچکر یہاں آتے ہیں لیکن اس اجتماع کے متضاد ایک اور صورت بھی ہے اور وہ ریلوں کے دور میں انتشار کی صورت ہے پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ

سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ بیان ہے کہ "تقریباً ریل کا ہر اسٹیشن برآمد کا ایک مرکز ہے غلہ روئی وغیرہ آس پاس کے علاقوں سے اسٹیشنوں پر پہنچتا ہے اور جیسے ہی یہ پیداوار یہاں پہنچتی ہے، برآمد کرنے والی کمپنیوں کے گماشتے اس کو خریدنا شروع کر دیتے ہیں، اور اس طرح یہ صورت کہ پیداکنندہ خود اپنی ماحصل پیداوار کو تجارتی مرکزوں میں فروخت کرنے جائے اس کی ضرورت باقی نہ رہی" اس کا اثر مقامی تجارتی مرکزوں کے زوال کی صورت میں نمودار ہوا انیسویں صدی کے آخری عشرے میں فیروزپور کا تنزل اس وجہ سے ہوا کہ اس کی تجارت گھٹ گئی دور اور نزدیک کے دیہات کے جو لوگ پہلے اپنی پیداوار یہاں لایا کرتے تھے انھوں نے اب ان اسٹیشنوں پر جانا شروع کر دیا جہاں یورپی اور ہندوستانی کمپنیوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ایجنسیاں قائم کر دی تھیں[1]۔ ان دونوں طریقوں میں تجارت کے اجتماع اور انتشار نے چھوٹے قصبوں اور تجارتی مرکزوں کو زیادہ متاثر کیا۔ اسی کے ساتھ گزشتہ تیس سال میں بڑے صنعتی شہروں کے مقابلے میں چھوٹے قصبوں کی شرح اجرت میں اس رفتار سے اضافہ نہیں ہوا جتنا کہ اشیا کی قیمتوں میں ہو گیا تھا۔ شرح اجرت کے پیچھے رہ جانے کے اس سبب سے چھوٹے قصبوں کی صنعتی آبادی میں بڑے قصبوں میں جانے کا رجحان پیدا ہو گیا۔

ایک اور سبب بھی ہے اور وہ انتظامی مرکزیت ہے، موجودہ نظام میں تمام آبادی جس کا ذریعۂ معاش محکمۂ عدالت یا مالگزاری وغیرہ تھا نیز قانون پیشہ اور دوسرے لوگ ضلعے کے مستقروں میں جمع ہونے لگے، تمام دوسرے ملکوں میں شہری زندگی میں اس کا تناسب بہت ہی غیر اہم ہوتا ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں

[1] پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ (سنہ ۱۹۱۱ء)۔

وہ بڑا قابل لحاظ تھا، اس طرح اضلاع کے مستقروں نے ضلع کے دوسرے مرکزوں کا استخفاف کر کے ترقی کرنا شروع کی، مثلاً برار میں ایلچ پور اور وسیم دونوں کی آبادی میں اسی وجہ سے تخفیف ہوئی کہ اضلاع کے مستقر دوسرے مقامات پر تبدیل کر دیے گئے۔ بڑے پیمانے پر قابل لحاظ اضافہ سالت ۱۹۰۱ء کے درمیان ڈھاکے کی آبادی میں ہوا اور اس کا ایک سبب یہ تھا کہ مشرقی بنگال اور آسام کا ایک نیا صوبہ بنایا گیا اور ڈھاکہ اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ گویا چھوٹے قصبات کے مقابلے میں بڑے قصبوں میں اضافہ کرنے والے چند خاص اسباب تھے لیکن یہ اثرات بڑی حد تک اس وقت باطل ہو جاتے ہیں جبکہ بڑے قصبوں کی کافی تعداد بتدریج رو بہ زوال ہو۔

مختلف النوع اثرات پر ایک عام نظر ڈالنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند خاص شہروں کی رفتار ترقی پر مزید غور کیا جائے، یہ مثالیں کلیتہً بڑے شہروں کے زمرے کی ہیں، ہندوستان کے دو بڑے شہروں یعنی کلکتے اور بمبئی میں اضافہ قابل لحاظ ضرور ہوا مگر وہ بہت نمایاں نہیں ہے اور نہ وہ جمودی حالت میں ہیں، اوپر سے نظر ڈالتے ہوئے ہم کو بڑے شہروں میں سب سے پہلا قابل لحاظ اضافہ رنگون میں نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۸۷۱ء میں رنگون کی آبادی ایک لاکھ سے کم تھی سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ ۲ لاکھ ۹۳ ہزار ہو گئی گویا چالیس سال میں ایک لاکھ ۹۴ ہزار کا اضافہ ہوا، سنہ ۱۸۷۱ء میں رنگون کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا اس کی ترقی کا آغاز بالائی برما کے الحاق اور چاول کی تجارت برآمد کی وجہ سے ہوا اور رنگون نے ایک بندرگاہ کی حیثیت سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ اس کی ترقی مسلسل جاری رہی برما کل ہندوستان کے برآمدی چاول کی تین چوتھائی مقدار سے زاید برآمد

کرتا ہے اور تقریباً یہ ساری برآمد رنگون کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ بعد میں دو اور صنعتیں یعنی چاول صاف کرنے اور لکڑی چیرنے کی گرنیاں بھی رنگون میں قایم ہونے لگیں، لیکن یہ صنعتیں نسبتہً نئی ہیں اور ان میں کل مزدوروں کے لحاظ سے تناسب بہت کم ہے۔ رنگون کی آبادی کے متعلق ایک دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی آبادی میں یہ اضافہ ہندوستان کے تارکان وطن قلیوں کی بدولت ہوا اور رنگون کی ترقی کا دار و مدار ہی ہندوستانی مزدوروں کی مسلسل رسد پر ہے۔

کراچی کی صورت بھی رنگون ہی کی طرح ہے، ہندوستان کے گیہوں کی برآمد میں کراچی کی وہی حیثیت ہے جو رنگون کی برما کے چاول کی تجارت میں ہے۔ کراچی کی آبادی گزشتہ چالیس سال کے اندر دوگنی ہوگئی، اس کا تمام تر سبب کراچی کو بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہو جانا ہے، اور یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کراچی میں کسی قسم کی اہم صنعتیں بالکل نہیں ہیں۔ آبادی کی ترقی کا سارا دار و مدار بندرگاہ سے ہونے والی تجارت پر ہے، رنگون اور کراچی سے جن درجوں کو ظاہر کیا گیا ہے وہ غالباً ہمارے بڑے شہروں کی بہت ہی اہم قسم ہے یہ بندرگاہیں، جن کی خوش حالی کا سارا دار و مدار ان کی تجارت برآمد پر ہے، اس درجے میں نیم جزوی طور پر کلکتے اور بمبئی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں بندرگاہوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

دوسرا قابل لحاظ درجہ صنعتی شہروں کا ہے، اس کی سب سے اچھی مثال احمد آباد کی ہے، احمد آباد ایک پرانا شہر ہے، جو اپنی دستکاریوں اور صناعوں کی ہوشیاری کی وجہ سے مشہور رہا لیکن اس کی موجودہ خوش حالی کا انحصار صنعتوں کے اضافے پر ہے، گزشتہ چالیس سال میں اس کی آبادی میں تقریباً ایک لاکھ کا اضافہ ہوا احمد آباد کی تجارت

سوائے سوت اور سوتی سامان کے کچھ زیادہ اہم نہیں اور ہندوستانی شہروں میں اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی آبادی کا نصف سے زائد حصہ صنعتوں میں لگا ہوا ہے، یہاں کی خاص صنعت کتائی اور بنائی ہے جس کے لیے احمد آباد کو مخصوص سہولتیں حاصل ہیں، لیکن اب یہاں بعض نئی صنعتیں مخصوصاً دباغت اور چرم سازی بھی توجہ کا مرکز بن رہی ہیں۔

لیکن اس واقعے کو تسلیم کرنا چاہیے کہ احمد آباد کی مثال ایک مستثنیاتی صورت ہے[1]۔ ہندوستان میں اس قسم کے خالص صنعتی شہروں کی اور کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ورنہ مدورا اور کانپور کو ہندوستان کے صنعتی شہروں کا نمایندہ کہا جا سکتا ہے ان دونوں کی خوش حالی کا آغاز اہم تجارتی مرکزوں کی حیثیت سے ہوا، کانپور بہت ہی جلد چمڑے کی فروغ پذیر صنعت کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد روئی اور پھر اون کی صنعتیں بھی وہاں قایم ہو گئیں۔ اس شہر میں برابر ترقی ہو رہی ہے اگرچہ اس صدی کے پہلے عشرے میں یہ طاعون سے کافی متاثر ہوا لیکن غالباً وہ اس وقت شمالی ہند کا سب سے زیادہ اہم صنعتی مرکز ہے لیکن اس کے باوجود کانپور بڑی حد تک ایک تجارتی منڈی ہے۔ مدورا کی تاریخ دوہری ہے، بیسویں صدی کے آغاز تک یہ روغنی تخم روئی اور غلوں کی ایک بڑی تجارتی منڈی تھا، پرییار کی آبپاشی کی تجویز اس کی خوش حالی میں مزید اضافے کا باعث ہوئی۔ لیکن اس صدی کے پہلے عشرے سے صنعتوں خصوصاً دستی پارچہ بافی اور رنگائی نے مدورا کی آبادی کے بڑے حصے کو اپنے اندر ضم کر لیا ہے

[1] اب یہ خصوصیت نہیں رہی، اور دوسرے خالص صنعتی شہر مثلاً جمشید پور، شولا پور اور کولار وجود میں آچکے ہیں (مترجم)۔

۱۴۹

اس کے بعد بڑے بڑے قصبوں کا درجہ ہے جن کی بیشتر خوش حالی کا انحصار تجارت پر ہے، ان میں اندرونی تجارت کی بڑی منڈیاں مثلاً دہلی اور لاہور ہیں، لیکن دہلی کی آبادی کا بڑا حصہ صنعت میں بھی معروف ہے[1]۔ لیکن لاہور یا پنجاب کے دوسرے قصبوں مثلاً ملتان اور راولپنڈی کا یہ حال نہیں، ملتان کی ترقی بہت ہی حالیہ ہے اور چونکہ یہ کراچی کے تجارتی راستے میں ایک موزوں جگہ پر واقع ہے اس لیے عام برآمدی تجارت کے اضافے نے اس شہر کو فائدہ پہنچایا۔ اس قسم کے قصبات میں کوئی چیز نمایاں نہیں ہے، یہ تمام ریلوں کے بڑے مرکز ہیں اور غلے، روئی، جوٹ اور روغنی تخموں کی بڑی منڈیاں ہیں، ان کی بڑی تعداد میں سے خصوصی مثالیں صوبہ جات متحدہ میں بریلی، میرٹھ، مشرقی بنگال میں نرائن گنج صوبجات متوسط میں ناگپور، بمبئی میں ہبلی ہیں، یہ سب زرعی خام پیداواروں کے مرکز ہیں۔

اس کے برخلاف دوسری طرف تنزل پذیر قصبوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے، ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے پٹنہ، تیزی سے تنزل کر رہا ہے، اس کے زوال کا سبب اس کی قدیم صنعتوں اور دریائی تجارت دونوں کا خاتمہ ہے۔ اور اس میں مزید اضافہ طاعون کی مہلک مصیبت نے کیا، اس کی دوسری مثال لکھنؤ ہے جس کے زوال کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ شاہی سلسلے کے قصبات تھے، اس کے بعد متبرک قصبات کا درجہ ہے، لیکن ان میں سے بھی اکثر کی حالت خراب تھی۔ گیا تیزی سے تنزل کر رہا تھا، الہ آباد صوبجات متحدہ کا دارالحکومت ہونے کے باوجود بھی ایک حالت پر قائم تھا، سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک بنارس کی آبادی میں ۱۹ ہزار

[1] ہندوستان کے دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے دہلی کی مستقل آبادی میں کافی اضافہ ہوگیا (مترجم)

کی تخفیف ہو گئی۔ متھرا بھی اپنی اہم حیثیت تیزی سے کھو رہا تھا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے
کہ زوال اس وجہ سے ہو رہا تھا کہ ہندوستان میں لا ادری جذبے[1] کی
کوئی لہر پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ زائرین اب بھی حسب معمول تعداد میں
جمع ہوتے تھے، بالخصوص اس وجہ سے کہ بہتر ذرائع آمد و رفت نے 150
سفر کو کم خطرناک اور ارزاں بنا دیا تھا، لیکن ان قصبوں کی قدیم
صنعتی پیداواروں کی طلب زائرین کے ہاں بہت کم ہو گئی تھی، لہٰذا
دونوں قسم کے قصبوں یعنی دار الحکومتوں اور متبرک مقامات کی آبادی
میں تخفیف کی خاص وجہ ایک ہی تھی، یہ در اصل قدیم دستکاریوں کا
زوال تھا چنانچہ اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض قصبے مثلاً بڑودہ
اندور اور راجپوتانے کے اکثر مشہور شہروں میں برابر تخفیف ہو رہی تھی،
اگرچہ وہاں دربار ابھی تک موجود تھے۔

جب ہم اعداد و شمار پر غور کرتے ہیں تو ہمیں دو متضاد رجحانات
کے اثرات ایک گونہ متوازن نظر آتے ہیں، بڑھتے ہوئے قصبوں میں
ترقی کی شرح اس قدر تھی کہ وہ ہندوستان کی شہری آبادی کے تناسب
کو برقرار رکھ سکے، باوجود اس کے قصبوں کا بڑا حصہ یا تو جمود میں تھا
یا تنزل کر رہا تھا، لیکن قدیم قصبوں کا زوال ہندوستان ہی کے لیے
کوئی عجیب واقعہ نہیں ہے، یہی چیز ہمیں انگلستان میں نظر آتی ہے جب
صنعتی مرکز جنوب سے شمال میں منتقل کر دیے گئے تو پرانے صنعتی شہر
مثلاً نارویچ یا برسٹل اپنی اہمیت گنوا بیٹھے، لیکن انگلستان یا اکثر
دوسرے ملکوں میں نئے صنعتی مرکزوں کی ترقی، قدیم شہروں کے زوال
سے بہت آگے نکل گئی۔

واقعہ یہ ہے اور جس کو اس امر سے بھی کافی تقویت ملتی ہے کہ

---

[1] یہ اعتقاد کہ خدا یا دوسری غیر مادی اشیا کی ہستی کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ تو ہے اور نہ غالباً کبھی ہو، ایک قسم کی دہریت (مترجم)۔

ہندوستان میں صنعتوں کی رفتار ترقی بہت سست ہے، قصبوں میں جو کچھ ترقی ہوئی اس کا بڑا سبب صنعت کے بجائے تجارت ہے، چند مستثنیات مثلاً احمد آباد یا جمشید پور یا ہگلی کے چند جوٹ کے قصبوں کے علاوہ ہندوستان میں صنعتی شہر موجود نہیں، ملے جلے درجے یعنی نیم تجارتی اور نیم صنعتی قصبوں میں بھی تجارت کا جزو صنعت کے مقابلے میں بہت بڑھا ہوا ہے، پھر ہندوستان میں بڑے شہروں کا مجموعہ یا پروفیسر گیڈس کی اصطلاح میں "اجتماع قصبات" کا بالکل فقدان ہے اگر قصبوں کا کوئی مجموعہ مغربی ملکوں کے بڑے شہروں کے مجموعے سے کچھ ملتا جلتا ہے تو وہ کلکتے اور دریائے ہگلی پر جوٹ کے دیگر قصبات کا مجموعہ ہے، اور اس کا امکان ہے کہ بہار میں کوئلے اور لوہے کے علاقے میں اس قسم کا کوئی مجموعہ پیدا ہو جائے، اس سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بیشتر ملکوں میں قصبوں کے بیشترین مجموعے کوئلے اور لوہے کے علاقوں کے آس پاس ہی پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جدید صنعتوں کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی، اور یہ چیز یوں بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جدید تجارت و صنعت میں صرف اتنی ترقی ہوئی کہ وہ اس توازن کو برقرار رکھ سکے جو قدیم دستکاریوں کے زوال کی بنا پر ہو رہا ہے۔

مختلف مردم شماریوں میں شہری آبادی کا تفاوت

مردم شماری کے سال	۱۸۷۲ء	۱۸۸۱ء	۱۸۹۱ء	۱۹۰۱ء	۱۹۱۱ء	۱۹۲۱ء	۱۹۳۱ء[1]
کل آبادی	۲۰،۶۱،۶۲،۳۶۰	۲۵،۳۸،۹۶،۳۳۰	۲۸،۷۳،۱۴،۶۱۷	۲۹،۴۳،۶۱،۰۵۶	۳۱،۵۱،۵۶،۳۹۶	[2] ۳۱،۶۰،۷۴،۷۵۱	۳۵،۲۸،۳۷،۷۷۸
شہری آبادی	۱،۸۰،۰۲،۴۸۴	۲،۳۹،۲۵،۳۸۲	۲،۷۲،۵۴،۶۱۱	۲،۹۱،۸۳،۵۲۸	۲،۹۷،۴۸،۲۲۸	۳،۲۴،۱۸،۷۷۶	۳،۸۹،۸۵،۳۲۷
شہری آبادی کی تقسیم							
ایک لاکھ اور اس سے زائد والے شہر	۴۳،۳۱،۹۱۷	۵۲،۹۵،۰۹۷	۶۱،۷۰،۴۸۰	۶۶،۴۴،۷۴۹	۷۰،۷۵،۷۸۲	۸۲،۱۱،۷۰۴	۹۶،۷۴،۰۲۳
۵۰ ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان	۱۸،۵۶،۲۹۷	۲۴،۱۱،۴۷۰	۲۷،۱۰،۲۵۹	۲۹،۳۰،۵۶۵	۳۰،۱۰،۲۸۱	۳۵،۱۷،۷۴۹	۴۵،۷۲،۱۱۳
۲۰ ہزار سے ۵۰ ہزار کے درمیان	۳۲،۳۸،۴۹۰	۴۴،۷۰،۹۹۵	۵۰،۹۹،۷۷۰	۵۴،۷۳،۹۸۹	۵۵،۴۵،۸۲۰	۵۹،۲۵،۹۷۵	۸۰،۹۱،۲۸۸
۱۰ ہزار سے ۲۰ " " "	۳۶،۳۴،۳۷۳	۴۸،۴۲،۰۶۲	۵۴،۱۰،۰۶۳	۵۹،۷۵،۱۸۰	۶۱،۶۳،۹۵۴	۶۲،۰۹،۵۸۳	۷۴،۳۹،۴۰۲
۵ " " ۱۰ " " "	۳۵،۸۷،۳۷۲	۵۰،۲۹،۴۵۷	۵۷،۶۲،۹۸۵	۵۹،۴۳،۴۷۱	۵۹،۴۴،۵۰۳	۶۲،۲۳،۰۱۱	۶۹،۹۲،۸۳۲
۵ ہزار سے کم	۱۳،۴۴،۰۳۵	۱۸،۸۶،۲۹۱	۲۱،۰۴،۰۵۴	۲۱،۷۵،۵۷۴	۲۰،۰۷،۸۸۸	۲۳،۳۱،۰۵۴	۲۲،۰۵،۷۹۰
ہر مردم شماری پر پچھلے چھوٹے ہوئے علاقوں کی آبادی کا اضافہ۔		۳۳،۳۹،۰۸۱	۵۷،۱۳،۹۰۲	۲۶،۷۲،۰۷۷	۱۷،۹۳،۳۶۵	۸،۶۱،۴۳۲	

[1] تقابل کی خاطر ۱۹۳۱ء کے اعداد درج کر دیے گئے ہیں، ملاحظہ ہو رپورٹ مردم شماری، جلد اول، حصہ اول صفحہ ۲۶ (۱۹۳۱ء) مترجم

[2] شہری تقسیم کے لحاظ سے بعض علاقوں کے اعداد فراہم نہ تھے اس وجہ سے مجموعی آبادی میں کمی ہو جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے بعض اعداد[1]

۱۔ ہندوستان کی کل آبادی برما کے علاوہ ۳۸۸،۸۰۰،۰۰۰ تھی۔

۲۔ ایک لاکھ سے زائد آبادی والے شہروں کی تعداد ۵۸ تھی، جس میں سے ۱۲ صوبہ جات متحدہ میں، ۷ پنجاب میں، ۶ مدراس میں اور ۵ صوبۂ بمبئی میں واقع تھے۔

۳۔ چند بڑے بڑے شہروں کی آبادی مندرجۂ ذیل تھی۔

(۱) کلکتہ ۲،۱۰۸،۹۰۰
(۲) بمبئی ۱،۴۸۸،۳۰۰
(۳) مدراس ۷۷۷،۵۰۰
(۴) حیدرآباد دکن ۷۲۸،۷۰۰
(۵) لاہور ۶۷۱،۷۰۰
(۶) احمدآباد ۵۹۵،۲۰۰
(۷) دہلی ۵۳۳،۳۰۰

۴۔ چند اہم صنعتی مرکزوں کی آبادی حسب ذیل تھی۔

(۱) کانپور ۴۸۷،۳۰۰
(۲) امرتسر ۳۹۱،۰۰۰
(۳) شولاپور ۳۸۷،۲۰۰
(۴) مدورا ۲۳۹،۱۰۰
(۵) ڈھاکا ۲۱۳،۲۰۰
(۶) جمشیدپور ۱۴۸،۷۰۰
(۷) کولار (معدنہائے طلا) ۱۳۳،۰۰۰

[1] سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری جنگ کے زمانے میں ہوئی، اس لیے صوبوں اور مرکزی حکومت نے رپورٹیں شایع کرنے کا خیال ترک کردیا۔ البتہ مرکزی حکومت کے ناظم مردم شماری نے ایک مختصر سا خلاصہ شایع کیا ہے، تقابلی سہولت کی خاطر اس میں سے بعض اہم چیزیں یہاں درج کردی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو اعداد مردم شماری سنہ ۱۹۴۱ء شایع کردہ ناظم مردم شماری (مترجم)۔

باب یازدہم

تغیراتِ زراعت

۵۲

گزشتہ ابواب میں مختلف ادوار کی تقسیم موسمی خصوصیات کے لحاظ سے کی گئی ہے، حقیقۃً قحطوں نے ہندوستان کی زرعی اور صنعتی معیشت میں بڑا اہم حصہ لیا ہے، اس وجہ سے یہ تقسیم بہت زیادہ قرین مصلحت بھی ہے۔ اوپر یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ زیرِ تبصرہ دور کے آغاز پر ہندوستانی قحطوں کی نوعیت تیزی سے بدل رہی تھی، اور یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اس دور میں بحیثیت مجموعی قحطوں کی اہمیت میں بتدریج کمی ہو رہی تھی، اور اس طرح اگر ہم سنہ ۱۸۶۱ء کے صوبہ جات شمال و مغرب کے قحط اور سنہ ۱۸۶۹ء کے راجپوتانے کے قحط سے بعد میں آنے والے قحطوں کا مقابلہ کریں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۶-۷۷ء میں اس کے اثرات نسبتۃً کم تھے۔ بلکہ گزشتہ صدی کے آخری اور مسلسل اور شدید قحطوں نے بھی اس قدر تباہی اور ہلاکت نہیں پھیلائی جیسی سنہ ۱۸۷۶-۷۷ء میں ہوئی تھی۔ قریب کے حالیہ دور میں سنہ ۱۹۰۰-۰۱ء کے قحط سے بحالی بہت جلد حاصل ہو گئی اور سنہ ۱۹۱۸ء میں بارش کی جیسی شدید قلت رہی اس کے اثرات نسبتۃً بہت ہی کم محسوس ہوئے بیشتر صورتوں میں ان واقعات سے یہی نتیجہ نکالا جاتا

ہے کہ موجودہ زمانے میں زرعی طبقے گزشتہ زمانے یعنی ۷۰ سال پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات ہر صورت میں صحیح نہیں، قحطوں کے اثرات محسوس نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں اشیائے خوردنی کو منتقل کرنے کے ذرائع بہت اچھے ہو گئے تھے۔ اور امدادی ذرائع کا کام نسبتہً زیادہ منظم ہو گیا تھا، اگر قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے ان زرعی طبقوں کی خوش حالی میں اضافہ بھی ہو گیا جو خرید کے بجائے فروخت زیادہ کرتے تھے تو بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ ان زرعی طبقوں کی حالت میں کس حد تک اصلاح ہوئی جن کے پاس بہت ہی مختصر اراضی تھی اور جو اپنی آمدنیوں میں اضافہ دوسرے مزید کاموں سے کرتے تھے، یہ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے آغاز سے زرعی مزدوروں کی اجرت صحیحہ میں اضافہ ہو رہا تھا[1] لیکن یہ چیز واضح نہیں ہے کہ اس اضافے نے ان کو موسم کی خرابیوں سے کس حد تک محفوظ کر دیا تھا۔ لہٰذا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب دراصل مزارعین کی مادی خوش حالی نہ تھی۔ بلکہ حمل و نقل کے ذرائع کی بہتر حالت تھی جس نے قحطوں کے اثرات کو کم کر دیا تھا۔

ذرائع آمد و رفت کی سہولت کے باعث ہندوستانی زراعت میں ایک دوسری تبدیلی ہو رہی تھی اور اس تبدیلی کو کسی اچھی اصطلاح کی عدم موجودگی کی وجہ سے زراعت کی تجارتیت کہا جا سکتا ہے ہندوستان میں جس اصول پر زراعت ہو رہی تھی اس میں بتدریج تغیر ہو رہا تھا، عام طور پر اس تبدیلی کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اب

۱۵۳

[1] کے ایل، دتا، ہندوستان میں قیمتوں کے اضافے کی تحقیقاتی رپورٹ، جلد اول، صفحات ۱۶۹-۱۷۰ (۱۹۱۴ء) اس کے مقابلے میں ملاحظہ ہو کیٹنگ، زرعی ترقی، باب ہشتم، وہ لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اجرت صحیحہ میں بالکل تغیر نہیں ہوا۔

زراعت گھر کے بجائے بازار کے لیے ہونے لگی تھی - اس دور میں ہندوستان میں ہر تغیر بتدریج واقع ہوا اور ہندوستان میں آج تک زراعت کا بڑا حصہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے کام پر مشتمل ہے لیکن ان تمام مقامات پر جہاں مخصوص فصلوں یا اناج کی بہتر قسموں کی کاشت ہونے لگی وہاں اس سب کا مقصد بازار کے لیے ہی پیداوار مہیا کرنا تھا - خود کفالتی دیہی معیشت میں جہاں جنس میں ادائیاں کرنے کا رواج ہوا اور بیشتر خدمات کا معاوضہ فصل پر ادا کیا جاتا ہو . وہاں یہ بات قدرتی تھی کہ تمام تر زراعت کاشتکار کے خاندان کے لیے ہی غلہ مہیا کرنے کے واسطے ہوا کرے نقل و حمل کی سہولتوں نے جب دیہات کی اجتماعی نوعیت کو منتشر کرنا شروع کیا تو اس نے زرعی معیشت کو بھی متاثر کیا - اور یہ تغیر صنعتی فصلوں کے رقبۂ کاشت میں توسیع اور مختلف اضلاع میں فصلوں کی تخصیص کی صورت میں نمودار ہونے لگا - تجارت خارجہ اور اس کے ساتھ اندرونی تجارت بھی بڑھ گئی ، رقبۂ آبپاشی کے اضافے نے بھی اس رجحان کی معاونت کی ، لیکن دراصل یہ تغیر صنعتی فصلوں کے رقبے میں اضافے کی صورت میں اتنا ظاہر نہیں ہوا جتنا کہ فصلوں کی خرید و فروخت میں ہوا گویا مختلف فصلوں کے رقبے تناسب میں اضافہ ہونے کے بجائے زراعت کے اصول میں تبدیلی ہو گئی[1] کاشتکار اب اس بات کی کوشش نہیں کرتا کہ اپنے گھر کی تمام ضروریات کی چیزوں کی کاشت خود ہی کرے جیسا کہ وہ ناقص ذرایع آمد و رفت کے زمانے میں کیا کرتا تھا اب وہ اپنی زائد پیداوار کو بازار میں فروخت کرنے اور اپنی ضروریات کے واسطے بازار پر بھروسا کرنے کے لیے زیادہ تیار رہے - یہ کہا جا سکتا ہے

[1] ملاحظہ ہو حوالۂ بالا صفحات ۲ و ۱۷ -

کہ گزشتہ صدی کے وسط سے قبل، تمام زرعی پیداواروں کا ایسا بازار بالکل موجود نہ تھا۔ اور تجارتیت کے اس رجحان کو پہلی تقویت اس بات سے ہوئی کہ جب دیہات میں معیشت زر کا آغاز نقد تشخیصات کی شکل میں ہوا، لیکن اس کے اثرات اس وقت تک دور رس نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ذرایع آمد و رفت اچھے نہ ہوں۔ اس کے بعد جنس کی شکل میں لگان ادا کرنے کا رواج متروک ہو گیا اور لگان زر نقد میں ادا کیا جانے لگا، اس نے اور معینہ مالگزاری کے اثر نے کاشتکار کو مجبور کیا کہ وہ اپنی پیداوار کا کچھ حصہ فصل کے فوراً بعد ہی فروخت کر دے، نیز اسی زمانے میں عموماً مہاجن کا سود بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ اور پیداوار کا جو حصہ اس وقت فروخت کیا جاتا وہ اس کی کل فصل کا بڑا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اکثر صورتوں میں سال کے آیندہ حصے میں کاشتکار اپنی اس پیداوار کا کچھ حصہ جو اس نے فصل کے موقع پر مہاجن کو بیچ دیا تھا، واپس خرید لیا کرتا تھا (یعنی ان صورتوں میں جبکہ فصل اشیائے خوردنی پر مشتمل ہوتی تھی) اس طرح ذرایع آمدورفت کی سہولت، جس نے گاؤں سے زرعی پیداواروں کی برآمد ممکن کر دی، اور معیشت زر کے آغاز نے ہندوستانی زراعت کو تجارتیت کی طرف مائل ہونے کی ترغیب دی، لہٰذا ان صورتوں میں بھی جہاں کاشتکار زیادہ تر گھر کے واسطے زراعت کرتا تھا، ان خصوصیات کی بنا پر فصل کے بعد اس کی پیداوار بازار میں آجاتی تھی، زرعی تجارتیت نے ان حصوں میں بہت زیادہ ترقی کی جہاں کاشت، زیادہ تر بیرون ملک برآمد کرنے کے واسطے کی جاتی تھی۔ چنانچہ برما کے چاول، پنجاب کے گیہوں، مشرقی بنگال کے جوٹ، خاندیش، گجرات اور برار کی روئی کے علاقوں میں یہی صورت نظر آتی ہے۔ برآمد کرنے والوں کی کوششوں سے، فصلوں کو بندرگاہوں تک منتقل کرنے کے لیے ایک اچھا خاصا منظم بازار وجود میں آگیا۔ برار کے روئی کے علاقے میں بہت سے

ایسے مرکز تھے جہاں فصل کے بعد ہی، برآمد کرنے والی کمپنیوں اور گرنیوں کی جانب سے بڑی بڑی مقداریں خرید لی جاتی تھیں، ان بازاروں میں اپنی روئی کاشتکار خود ہی لے آتے تھے، لہذا اس کو متعدد درمیانی آدمیوں کے ذریعے سے گزرنا نہیں پڑتا تھا۔ مسٹر نول پیٹن، برمی چانل کی تجارت میں، بازاری تنظیم کا حال، اس کے برخلاف یوں بیان کرتے ہیں "اکثر صورتوں میں دھان، گاہنے کے فرش ہی سے مقامی تاجروں، چھوٹے دلالوں یا درمیانی آدمیوں کے ذریعے سے لے لیا جاتا ہے جو گرنی والوں یا محنتوں کی جانب سے کام کرتے ہیں۔ مقامی چھوٹا تاجر جو "جنگلی دلال" کہلاتا ہے، اس کو ریلوے اسٹیشن کے تاجر یا دوسرے لوگ پیشگی دیتے ہیں، اور یہ گاہنے کے فرشوں کا چکر لگا کر اسٹیشنوں سے کم نرخ پر خریدتا ہے حالانکہ بڑے تاجر اس کو زائد قیمت دیتے ہیں[1]۔ تقریباً یہ تمام چاول صفائی کے لیے رنگون منتقل کیا جاتا ہے۔ روئی اور جوٹ کے علاقوں میں ایسی تجارتی منڈیوں میں داہنے والے کارخانے بھی قائم ہو جاتے ہیں پنجاب اور صوبہ جات متحدہ میں جہاں خام پیداوار دل کو برآمد کرنے کے لیے کوئی خاص کام نہیں کیا جاتا، وہاں تقریباً ہر ریل کا اسٹیشن برآمد کی منڈی بن گیا ہے اور یہاں مقامی تاجر اور برآمد کرنے والوں کے گماشتے کام کرتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کی ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے مصنف مرہٹواڑی میں روئی کے رقبے میں وسیع اضافے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب اشیائے خوردنی کے بجائے کسی ملک میں مصنوعات کے واسطے خام پیداوار مہیا کرنے کا آغاز ہو جاتا ہے تو وہ صنعتی راہ پر لگ جاتا ہے"۔ لیکن اس بیان کا مجموعی حیثیت سے سارے ہندوستان پر انطباق نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہاں کسی بڑے پیمانے پر

۱۵۵

[1] یف، نول پیٹن، برمی چاول (۱۹۱۲ء)۔

اشیائے خوردنی میں تبدیلی نہیں ہوئی، بلا شبہ بعض حصوں میں صنعتی فصلوں نے اشیائے خوردنی کو خارج کر دیا لیکن دوسرے علاقوں میں یہ زیادہ مقبول ہو گئیں۔ مختلف فصلوں کی ملک کے مختلف حصوں میں از سر نو تقسیم ہو گئی اور جو حصے جن خاص فصلوں کے لیے زیادہ موزوں تھے وہاں ان کی کاشت شروع ہو گئی، لیکن اس طریقے کا مطلب صنعتیت نہیں تھا، حقیقتاً یہ امر مشتبہ ہے کہ ہندوستان میں ابھی صنعتیت کس حد تک ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ زرعی تجارتیت ضرور ہوئی۔ گھر پر رکھنے کے بجائے کل پیداوار کا بڑا حصہ بازار میں آجاتا تھا اور اس کا انحصار پیداوار کی اندرونی یا بیرونی تجارت پر نہ تھا، مثلاً باجرے کی پیداوار کی اندرونی تجارت کچھ زیادہ اہم نہ تھی مگر اس کا بھی بڑا حصہ بعض مخصوص حالات کی بنا پر بازار میں آجایا کرتا تھا۔

یہ مخصوص حالات حکومت کی مالگزاری اور ساہوکار کے سود کی ادائیاں تھیں، ان دونوں مطالبوں کو ادا کرنے کے لیے کاشتکار فصل کے بعد ہی بازار کی طرف دوڑتا تھا اور جو قیمت بھی ملتی اس پر اپنی پیداوار کا بڑا حصہ فروخت کر دیا کرتا تھا، اکثر غریب کاشتکاروں کو چھ ماہ کے بعد اس پیداوار کا کچھ حصہ واپس خریدنا پڑتا تھا جو وہ فصل کے موقع پر فروخت کر دیتے تھے، فصل کے زمانے میں قیمتیں بہت ادنیٰ ہوتی تھیں مگر چھ ماہ بعد جب کاشتکار بازار میں خریدنے آتا تو قیمتیں بہت بڑھی ہوئی ہوتی تھیں جو اس کے لیے تباہ کن تھیں[1]۔ اس لیے مسٹر نول پیٹن مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ برمی ساہوکار کے منافع کا بڑا انحصار چھ مہینے کی قیمتوں میں اضافے کے تعین پر مبنی تھا۔ کاشتکار جب اب بازار میں آتا تو قرضے میں

[1] ایف، نول پیٹن، حوالۂ گزشتہ، نیز ہندوستانی گیہوں وغیرہ۔

١٥٦

دبتا ہی چلا جاتا تھا اور چند سال کا یہ الٹ پھیر اس کی تباہی کے لیے کافی ہوتا تھا۔

قرضداری کی لعنت ہندوستانی زراعت کی راہ میں سب سے بڑی دشواری تھی، گزشتہ باب میں قرضداری کے چند اسباب سے بحث کی گئی ہے، کاشتکار کے قرضے کی بنیاد موروثی تھی، اور موسموں کے تغیرات اس میں مسلسل اضافے کا باعث ہو رہے تھے، صرف دکن ہی میں یہ نہیں ہوا کہ خود مالکانہ حقوق کے حاصل ہونے اور انتقال حقیت کی بنا پر کاشتکاروں کے قرضے میں مزید اضافہ ہوا، بلکہ انھی اسباب کی بنا پر پنجاب میں بھی اسی قسم کے نتائج ظاہر ہوئے[1]۔ مسٹر او، ڈائر نے ایک مقالے میں جو رائل سوسائٹی آف آرٹس میں پڑھا گیا کاشتکاروں کو اراضی پر مطلق حقوق حاصل ہو جانے کے اثرات کو ظاہر کیا ہے[2]۔ وہ راجپوتانے کی چند ریاستوں کا برطانوی علاقے سے مقابلہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان ریاستوں میں کاشتکار محض اس وجہ سے کم مقروض ہیں کہ ان کو زمین پر مکمل حقوق حاصل نہیں ہیں، بلوہ جات دکن کی کمیٹی کی رپورٹ کے بعد یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ تمام ہندوستان میں یہی صورت ہے اور انیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس قسم کے قانون نافذ کیے گئے اور کاشتکار کو اپنی زمین کی منتقلی کے سلسلے میں متعدد پابندیوں کے تحت لایا گیا۔ قانون امداد مزارعین دکن کو بعض ترمیمات کے ساتھ صوبۂ بمبئی کے دوسرے اضلاع میں نافذ کیا گیا، لیکن دکنی قانون میں انتقال اراضی پر براہ راست کوئی بندش نہ تھی، البتہ بعد کے نئے قانون مثلاً صوبہ جات متوسط کا قانون لگان (۱۸۹۸ء) جس کی رو سے سیر

[1] ایس، ایس، تھارنٹ برن، مسلمان اور مہاجن (۱۸۸۸ء)۔

[2] او، ڈائر، زرعی حالات وغیرہ، سوسائٹی آف آرٹس کا رسالہ (۱۸۹۹ء)۔

(خود کاشت اراضی) زمین کے انتقال کو ممنوع کر دیا' یا پنجاب کے قانون انتقال اراضی (سنہ ۱۹۰۰ء) میں اس قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں' پنجاب کے قانون انتقال اراضی نے زرعی اور غیر زرعی طبقوں کے اندر اراضی کے منتقل ہونے میں فرق کیا اور آخر الذکر طبقے میں اراضی کا منتقل ہونا ممنوع قرار دیا۔ لیکن کسی ایسے قانون کا فوری اثر یہ ہوتا تھا کہ قرضے میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ مثلاً قانون امداد مزارعین دکن کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ مہاجنوں کے کاروبار بیٹھ گئے اور چھوٹے ساہوکار کنگال ہو گئے[1]۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ اب کاشتکاروں کو اس آسانی سے قرض نہ ملتا تھا جیسا کہ قانون کے نفاذ سے قبل مل جاتا تھا' پنجاب یا دوسرے مقامات پر جہاں انتقال اراضی پر بندشیں لگائی گئیں وہاں بھی یہی صورت پیش آئی' لیکن ان قوانین سے حسب منشا نتائج ضرور حاصل ہوئے یعنی زمین کی منتقلی بڑی حد تک رک گئی' پنجاب کے قانون کو مزارعین کے لیے حقیقی طور پر منشور اعظم کہا جا سکتا ہے' لیکن برمحل مسئلہ یہ ہے کہ آیا ان قوانین نے قرضداری کے اضافے کو روکا' تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان سے کسی خاص حد تک فائدہ نہیں ہوا' جہاں انتقال اراضی پر براہ راست بندش تھی وہاں اس قانون کے اثر سے انتقالات میں کمی آگئی مختلف دفعات جن کی رو سے مجسٹریٹوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ قرضے کی پرانی تاریخ کے متعلق تحقیقات کریں' مہاجنوں کی دھوکے بازانہ کارروائیوں کو روکا' لیکن ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہاجن اب کاشتکاروں کو قرض دینے سے قبل قابل اعتماد ضمانت طلب کرتے یا زمین کو براہ راست رہن رکھنا چاہتے تھے۔ بہرحال قانون سازی کاشتکاروں کی قرضداری کو نہ روک سکی اور نہ روک سکتی تھی' البتہ اس نے ہندوستان کی

[1] قانون امداد مزارعین دکن کے متعلقہ کاغذات' دو جلدیں' (۱۸۹۷ء۔۱۸۹۴ء)۔

زرعی قرضداری میں جو چند بدترین طریقے رائج تھے ان میں ترمیم کر دی، لیکن مختصر قطعات اراضی اور موسموں کی غیر یقینی حالت کی بدولت کاشتکار کو قرضے کی ضرورت اب بھی ویسی ہی شدید تھی جیسی کہ پہلے تھی، اور صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ خلاف موسموں میں قرضوں میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ خوش حالی کے دور میں بھی عام طور پر قرضے بڑھ جایا کرتے تھے، روئی کی گرم بازاری کے دور میں جب خوش حالی پھیلی اور قرضہ لینے میں سہولتیں پیدا ہوگئیں تو دکن کے کاشتکار بری طرح مقروض ہو گئے[1] اس صدی کے آغاز میں جب پنجاب میں خوش حالی پیدا ہوئی تو وہاں بھی یہی صورت نظر آنے لگی[2] اکثر مقامات پر اس عادت قبیحہ کی وجہ سے خوش حالی اور قرضداری دونوں چیزیں دوش بدوش پھیلتی رہیں۔ خوش حالی کے دور میں یہ اس لیے ہوتا تھا کہ اس وقت قرضہ ملنا آسان تھا پھر خوش حالی کے یہ معنی بھی تھے کہ لگان اور زمین دونوں کی قدر میں اضافہ ہو گیا ہے، اس طرح ملکی کاشتکار یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرنے میں بھی نہ جھجکتا تھا۔ اور اس طریقے کے مضر اثرات کا احساس اس کو اس وقت ہوتا تھا جب شداید کا زمانہ آتا تھا، پھر قرضہ حاصل کرنے کی سہولتیں اور خوش حالی، بعض پہلوؤں سے قرضے کے کھنچاؤ کی بعض منفی بندشیں تھیں، اور یہ کچھ زیادہ موثر نہ تھیں، یہ واقعہ ہے کہ بعض صورتوں میں اس قسم کی بندشوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار کو قرضہ ملنے میں پہلے سے زیادہ دشواریاں ہو گئیں جس چیز کی ضرورت تھی اور جو چیز واقعی اس خرابی کو دور کر سکتی تھی وہ ان شرائط میں حقیقی ترمیم تھی، جن پر قرضہ حاصل کیا جاتا تھا، اور کاشتکار جن اغراض کے لیے

[1] حوالۂ بالا، باب دوم۔

[2] ایم ایل ڈارلنگ، پنجاب میں قرضداری و خوش حالی، انڈین جنرل آف اکنامکس (جنوری ۱۹۲۱ء)۔

قرض لیتا تھا ان پر موثر بندش عائد کرنا تھی، یہ مقصد کبھی بھی قوانین کی تعداد سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، اور اب تک اس کا جو کچھ کامیاب علاج معلوم ہوا تھا وہ قرضۂ امداد باہمی کا طریق اور کاشتکاروں میں امداد باہمی کے جذبے کا نفوذ تھا۔

ساہوکاروں نے کتنے قدیم کاشتکاروں کو بے دخل کر دیا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ یہاں رہبری رہنوں کے اعداد اور عدالتوں کی ڈگریوں سے ہوتی ہے، لیکن یہ رہبری خود ناقص ہے اور جو اعداد مدون کئے گیے وہ نا مکمل ہیں، عام رپورٹوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ گزشتہ صدی کے اختتام تک اس طریقے میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، اضافۂ آبادی بھی ایک اہم سبب ہے، انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جب زمین بکثرت تھی اور محنت کی قلت تھی تو مہاجنوں کو زمین پر قبضہ کرنے کی کوئی ترغیب موجود نہ تھی، ۱۸۶۰ء کے بعد صورت حال یہ نہ رہی، اور زمینوں کی قیمت میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ لہذا یہی تاریخ کاشتکاروں کی اراضی مہاجنوں کے پاس منتقل ہونے کی ابتدا قرار دی جا سکتی ہے۔

اوائل موجودہ صدی میں اس طریقے کی شدت کو حکومت نے ان حصوں میں روکنے کی کوشش شروع کی جہاں خرابی بہت بڑھ گئی تھی مثلاً صوبہ جات متوسط، پنجاب، بندیل کھنڈ وغیرہ۔ لیکن پرانے ملکی کاشتکاروں کی بے دخلی کا سلسلہ برابر جاری رہا، اگرچہ قانون نے اضافے کی رفتار میں کمی کر دی تھی۔ ہندوستان میں اس طریقے کے اثرات یوں اور برے ہوے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں مہاجن زرعی طبقے سے تعلق نہ رکھتا تھا اور جہاں زمین منتقل ہو کر زرعی طبقوں کے پاس بھی گئی وہاں محض انتقال سے طریقۂ کاشت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ اکثر صورتوں میں کاشت

اب بھی پرانا کاشتکار ہی کرتا تھا، اور اب اس کو اپنے قدیم قرضے پر سود ادا کرنے کے بجائے زیادہ لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ منتقلی کا محض یہ اثر ہوا کہ حقیقی کاشتکار کی حیثیت پہلے سے زیادہ غیر مستقل ہوگئی، اور اس کو بہتر طریقے پر کاشت کرنے کی جو کچھ بھی ترغیبات تھیں اب وہ بھی بالکل ختم ہوگئیں، دوسرے بیشتر ممالک کی طرح ہندوستان میں اس طریقے کا یہ مطلب نہ تھا کہ کاشت کی اکائی میں اضافہ اور انضمام ہوگیا، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کاشت کے منافعوں کی تقسیم میں کچھ رد و بدل ہوگیا حتیٰ کہ جہاں کہیں بڑے یکجائی کھیت واحد ملکیت میں تھے وہاں بھی عموماً وہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرکے متعدد چھوٹے کاشتکاروں کو لگان پر اٹھا دیے جاتے تھے، اس طرح اگر کاشت کی حقیقی اکائی (مالکان زمین انفرادی حیثیت سے اوسطاً جو رقبہ رکھتے ہیں اس میں ہندوستان میں اختلاف ہیں) ایک مختصر قطعۂ زمین ہی ہو تو اس صورت میں خود کاشت زمینداری طریق، آسامی کاشتکارہ طریق کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے، جس وجہ سے یہ صورت اور زیادہ خراب ہوگئی وہ یہ تھی کہ ملک کے اکثر حصوں میں مالکان اراضی طویل المیعاد پٹوں کو پسند نہ کرتے تھے اور اس طرح آسامیوں کا بڑا اثنا سب غیر دخیل کار آسامیوں پر مشتمل ہوجاتا تھا۔ کسی بڑے پیمانے پر کاشت کرنے والے حوصلہ مند مالکان اراضی کے طبقے کی کمی نے، خود کاشت زمینداروں کو محض آسامیوں میں تبدیل کرنے کا رجحان پیدا کیا جو قابل افسوس ہے، ہندوستان میں بلا اراضی والا مزدور طبقہ غیر دخیل کار آسامیوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا۔[1]

یہ کہا جاتا ہے کہ زمینوں کا بہت مختصر ہونا قرضداری کے اضافے

۱۵۹

[1] ین، جی، گنگولی، آگرے کے آسامیوں کی شکایات (۱۹۱۵ء)۔

کا ایک اہم سبب تھا اس طرح ہم ہندوستان کے اہم ترین سوال
یعنی تقسیم و انتشار اراضی کے مسئلے پر آجاتے ہیں، یہ بار بار کہا جا چکا ہے
کہ موجودہ ہندوستان میں متوسط کھیت کا رقبہ غیر معاشی ہے،
بڑودہ کمیٹی نے معاشی کھیت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ کھیت جس پر
ایک کاشتکار اپنے خاندان کی محنت کے ساتھ زراعت کر سکے، اگرچہ
تعریف میں عیب نکالے جا سکتے ہیں، لیکن جہاں تک خاندان
کی اکائی، محنت کی کم و بیش وہ اکائی ہے، جو ہر کاشتکار کو اپنی
زمین کی کاشت کے واسطے مہیا ہے تو یہ تعریف ٹھیک معلوم
ہوتی ہے، بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر حصوں میں متوسط کھیت
میں کاشتکار اپنے سارے خاندان کو نفع بخش طریقے پر مصروف
نہیں رکھ سکتا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس محنت کا
کچھ جزو دوسرے پیشوں کی طرف کھنچتا ہے تاکہ خاندان کی آمدنی
میں اضافہ کیا جائے، اور ہندوستان میں جہاں کہیں اس قسم کے
ردوبدل والے پیشے آسانی سے مل جاتے ہیں وہاں یہی ہوتا ہے[1]،
لیکن ملک کے اکثر حصوں میں زرعی مزدوری کے علاوہ اس کے
مماثل اور کوئی پیشے نہیں ہیں فصل کے زمانے کے علاوہ اس قسم
کی زرعی محنت کی اجرت[2] اس قدر ادنیٰ ہوتی ہے کہ خاندان کی
آمدنی میں جو مزید اضافہ کیا جاتا ہے وہ بہت ہی قلیل ہوتا ہے،
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان کی ساری محنت اسی مختصر سے قطعۂ زمین
پر مصروف رہتی ہے اور اس کے باوجود کاشت سے صرف اتنا
نفع ہوتا ہے جو کاشتکار اور اس کے خاندان کی کفالت کے واسطے

۱۶:

[1] ڈاکٹر ایچ، ایچ، مَن، ایک دکنی گاؤں میں زمین و محنت (نمبر ۱) پمپلا سنداگر (زیر تذکرہ گاؤں) کی محنت کا بڑا حصہ کھڑکی کے ورکشاپ وغیرہ کی طرف کھنچتا تھا، جو اتفاق سے قریب تھے۔

[2] لیکن فصل کے زمانے میں کاشتکار کو اپنے سارے خاندان کی محنت کی خود ضرورت ہوتی تھی۔

بمشکل کافی ہو سکتا ہے، اس کا ایک اور بدترین پہلو تھا یعنی زمین نہ صرف مختصر تھی بلکہ وہ منتشر بھی تھی مثلاً پانچ ایکڑ کا ایک کھیت مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا سارے گاؤں میں پھیلا ہوا تھا[1]۔ اس سے ایک اور طرح کاشت غیر معاشی ہو جاتی تھی کیونکہ انتشار کی وجہ سے کاشتکار اپنے تمام سرمایے کو نفع بخش طریقے پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

ہندوؤں کے قانون وراثت، جس کی رو سے باپ کی ساری جائداد اس کے سب لڑکوں میں برابر برابر تقسیم ہونی چاہیے اس کو تقسیم وانتشار اراضی کی ایسی افسوسناک تحریک کا نتیجہ بتایا جاتا ہے، یہ معلوم ہوگا کہ دراصل تقسیم اراضی کا رجحان بہت ہی نقصان دہ ہے، کیونکہ اگر کسی وقت ایک خاص گاؤں میں منتشر زمینوں کو یکجا کر دیا جائے مگر تقسیم اراضی کا سلسلہ برابر جاری رہے تو انتشار اراضی کی خرابیاں کچھ عرصے کے بعد پھر ظاہر ہو جائیں گی، اس کو عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جن قوانین کی سفارش کی گئی ان کا مقصد تقسیم اراضی کی خرابی کو روکنا ہے، اگرچہ یہ مسلمہ بات ہے کہ ہندو قانون وراثت اس خرابی کا بڑا سبب ہے لیکن اس کے دوسرے اسباب کے لیے ادھر ادھر بھی نظر ڈالنا چاہیئے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اولاد ذکور میں جائداد کی مساوی تقسیم محض ہندو قانون ہی کی کوئی خاص خصوصیت نہیں بلکہ اس قسم کے مماثل قوانین اکثر یورپ کے ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں، یہاں بھی زمین کو تقریباً اسی طرح اولاد ذکور میں تقسیم کئے جانے کا دستور ہے، لیکن ان ملکوں میں تقسیم اراضی کی ۱۶۱

[1] تقسیم وانتشار اراضی کی حد تک ڈاکٹر منّ کی دو معاشی تحقیقیں ملاحظہ ہوں ہنری کیٹنگ مغربی ہند میں زرعی ترقی، ضمیمہ اول، اور ریچ، لیس، جیونس، صوبہ جات متحدہ میں زرعی اراضیات کا انضمام۔

وہ شکل نظر نہیں آتی، جس صورت میں کہ وہ ہندوستان میں موجود ہے۔ بلجیم کی صورت کو لے لیجیے، یہ چھوٹے قطعات اراضی والا ملک مشہور ہے۔ یہاں زائد تقسیم کو اس طرح روکا کہ یہ دستور بنادیا گیا کہ جائداد اولاد ذکور میں تقسیم ہونے کے بجائے مشترک رہتی ہے اور ان میں سے ایک کاشت کرتا ہے اور اس کی آمدنی دوسروں کو ادا کرتا ہے، لیکن مسٹر راون ٹری کا خیال ہے کہ " اس طریقے سے جائداد بہت سے ٹکڑوں میں بٹ کر غیر منافع بخش ہوجاتی ہے[ا] ہندوستان میں ایسا رواج نہ ہونے کا سبب محض ہندوستانی کاشتکار کی قدامت پسندی یا تمرد نہ تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے، کاشتکار کو اگر کام مل جاتا تو وہ مزید کام کے ذریعے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے بالکل تیار ہوجاتا تھا، اگر اس کے سامنے متبادل پیشے نہ ہوں تو اس کو الزام نہیں دیا جاسکتا کہ وہ بلا اراضی والے مزدور طبقے میں شامل کیوں نہیں ہوتا اور اپنی آبائی جائداد کے حصے پر کیوں زور دیتا ہے، دراصل حقیقی اہم نکتہ یہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اکثر حصوں میں ہمیں زرعی مزدوروں کی قلت کی شکایت سنائی دیتی ہے، اب سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قلت کی شکایت صرف فصل کے زمانے میں ہوتی ہے، اور اس کی کچھ وجہ تو یہ ہے کہ چھوٹے کاشتکار اور اس کے خاندان کی زائد محنت جو دوسرے زمانوں میں دستیاب ہوجاتی ہے وہ فصل کے زمانے میں فراہم نہیں ہوتی، مسٹر کیٹنگ اس قلت کے تین اور اسباب پیش کرتے ہیں[۲]۔ پہلا رقبہ کاشت میں اضافہ، دوسرا شہروں میں صنعتوں کی ترقی، یہ امر مشتبہ ہے کہ اگر ہم ہندوستان پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو آیا دوسرا سبب کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے، بعض حصوں میں توطن خارجی کی وجہ سے محنت کی

[ا] آر، ببو ہم راون ٹری، زمین و محنت، بلجیم کے نتائج باب چہارم صفحہ ۴۷۔
[۲] کیٹنگ، حوالۂ گزشتہ، باب ہشتم۔

رسد متاثر ہوتی تھی، صوبۂ مدراس کے بعض حصوں میں یہ صورت خصوصیت سے نظر آتی ہے، جہاں سے محنت کا بڑا حصہ لنکا اور آبنائی نوآبادیوں میں چلا گیا تھا یہاں کے مزدوروں کے نقل مقام کی ترغیب میں سماجی اسباب بھی بڑا اہم حصہ لیتے ہیں، مسٹر کیٹنگ نے جو تیسرا سبب بتلایا ہے وہ بہت ہی اہم ہے، یعنی اس زمانے میں ذی حیثیت کاشتکار نے اپنے خاندان کے ساتھ کھیتوں پر کام کرنے کے رواج کو ترک کر دیا ہے، اور جہاں وہ اس قابل ہوا وہ اپنے کھیتوں پر اجرتی مزدوروں سے کام کرانے لگتا ہے، اگر یہ چیز سارے ہندوستان کے لیے صحیح ہے اور واقعی ایسا رجحان وسیع تھا تو تنہا اسی کو زرعی مزدوروں کی قلت کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، بہرحال فصل کے زمانے میں زرعی مزدوروں کی قلت اس مفروضے کے عدم ثبوت کی دلیل نہیں ہے کہ زمین پر اس تعداد سے زائد لوگ کام کر رہے تھے جن کی وہ اچھے طریقے سے کفالت کر سکتی تھی۔ ۱۶۲

مختصراً تین اہم تغیرات بتائے گئے جو ہندوستانی زراعت میں واقع ہو رہے تھے، اور ہر وقت اس امر پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ ان تینوں رجحانوں کی رفتار بہت ہی سست تھی، اور پھر یہ کہ ان کی ترقی کی وسعت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے، تغیرات یہ تھے کہ پہلے زراعت کی تجارتیت، جو بذاتِ خود ایک مفید تحریک تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے فصلوں کی تقسیم نسبتاً کچھ بہتر ہو گئی، اور زراعت کے منافعے بڑھ گئے اور یہ زیادہ تر ذرائع آمد و رفت کی بہتر حالت کا نتیجہ تھا، دوسرے دو رجحانات (قدیم مالکوں کی بے دخلی اور تقسیم اراضی کی شدت) متوسط کاشتکار پر متضاد عمل کر رہے تھے، آبادی میں اضافہ ان دونوں کا ایک اہم جزو تھا، اور کسی بڑی صنعتی ترقی کا فقدان بھی اس کا بڑی حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے کثیر تعداد کا زمین پر گزارہ

زرعی تحریک کے لیے نامساعد تھا، وہاں کھیتی بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکتی جہاں جمع بندیاں اعلیٰ ہوں اور چھوٹے قطعات کے لیے مسابقت تیز ہو، اس لیے مسٹر راون ٹری نے بہت ہی صحیح بتایا ہے کہ ان ملکوں میں جہاں تقسیم اراضی کی کثرت ہو وہاں شرح لگان اور قیمتیں بھی دوسرے مقامات سے اعلیٰ ہوا کرتی ہیں[1]۔ اس سے مالکان زمین کے واسطے منافع بخش صورت یہی تھی کہ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے کے بجائے زمین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں لگان پر اٹھا دیں۔ اس نے کس طرح ایک دوسرے طریقے سے اصلاح کی رفتار میں روڑا اٹکایا اس کا اندازہ اس وقت بخوبی ہو سکتا ہے جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ دوسرے بیشتر ملکوں میں زراعت میں مشینوں کے استعمال کا آغاز اسی وقت ہوا جب زرعی محنت گراں ہو گئی۔

---

[1] راون ٹری، حوالۂ گزشتہ، باب چہارم۔

باب دوازدہم

دیہی صناع

ہندوستان کے قدیم معاشی نظام میں دیہی صناع کی حیثیت معین تھی، شہری دستکاریاں اگرچہ کافی طور پر منظم تھیں، لیکن تعداد کے لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور اس طرح ہند قدیم میں تعداد کے لحاظ سے دیہی صناع ہی اہم صنعتی مزدور تھے، زمانے کی رفتار کے ساتھ ان کی یہ فوقیت غائب ہوگئی، لیکن آج بھی ہندوستان کی صنعتی آبادی کا بڑا حصہ انھی کاریگروں پر مشتمل ہے، اگرچہ ان کی تعداد میں کوئی قابل لحاظ کمی نہیں ہوئی لیکن اس کے برخلاف ان کی حیثیت اور قدیم معینہ خدمات میں بڑا فرق ہوگیا، اور آج دیہی صناعوں کی آبادی سیال حالت میں ہے۔

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جاچکا ہے گاؤں کے تمام کاریگر معین حیثیت نہ رکھتے تھے، کاریگروں کا ایک طبقہ گاؤں کا خدمتگار تھا، اور دوسرا طبقہ خود مختار، مندرجۂ ذیل اقتباس سے ان طبقوں کے رتبے کا فرق بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔ "دیہات میں گاؤں کے کمینوں اور خود مختار کاریگروں میں بڑا بین فرق ہے نجار، لوہار، کمہار بھنگی اور (جہاں عورتیں پردہ کرتی ہیں وہاں دھوبی) مختلف طبقے میں

جن کی خدمات کی زراعت یا روزانہ کی گھریلو زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو خدمت کے لحاظ سے معاوضہ نہیں ملتا بلکہ زرعی پیداوار میں ان کے دستوری حقوق معین ہیں، اور جو خدمات یہ انجام دیتے ہیں ان کو مقدار کے بجائے جنس سے ناپا جاتا ہے وہ کاریگر جن کی خدمات کی کبھی کبھی ضرورت ہوتی ہے مثلاً جولاہا، تیلی، رنگریز، ان کو کام کے لحاظ سے معاوضہ دیا جاتا ہے لیکن وہ نقد کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ یا تو بشکل جنس ادا کیا جاتا یا ان کو اس بات کی اجازت ہوتی کہ وہ اس خام مال میں سے کچھ حصہ رکھ لیں جو مالک انھیں کام کرنے کے واسطے دیتے ہیں[1]۔ اس سے کاریگروں کے دونوں طبقوں کی حیثیت کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے، لیکن دیہی جماعتوں میں حیثیت کے اس فرق کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان کی معاشی نوعیت میں بھی کوئی اختلاف تھا، دراصل ان دونوں طبقوں کی معاشی زندگی میں کوئی ایسا فرق نہ تھا جیسا کہ ادائیوں کے وقت اور طریق ادائی میں تھا۔ اول الذکر طبقے کو ایک قدرتی فائدہ حاصل تھا کہ اس کی آمدنی بندھی ہوئی اور مستقل تھی، لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ اس کو حقیقی فائدہ کہنا کس حد تک مناسب ہے، یہ ٹھیک ہے کہ فصلوں کی خرابی کی صورت میں گاؤں کے جولاہے یا رنگریز کو کام نہ ملتا تھا اور اس کو فاقے کرنا پڑتے تھے، لیکن کمین طبقے کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہ رہتا تھا کیونکہ خراب فصلوں کی وجہ سے پیداوار میں ان کے حصے کا تناسب گھٹ جاتا تھا۔ دراصل ان دونوں طبقوں میں یہ فرق آسانی کی خاطر کیا گیا ہے ورنہ گاؤں کے سارے کاریگروں کی خوش حالی کا انحصار کاشتکاروں کی خوش حالی پر تھا، اور گاؤں کی ساری قسمت کا دارومدار ایک ہی اہم جزو یعنی

[1] پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ ص ۳۰۰ (۱۸۸۱)۔

زرعی موسم کی کیفیت پر ہوا کرتا تھا۔

جس طرح گاؤں کے تمام کاریگر خدمتگاروں کے طبقے میں شامل نہ تھے، اسی طرح گاؤں کے سارے خدمتگار صرف کاریگروں پر مشتمل نہ تھے، اکثر صورتوں میں پیشے ملے جلے تھے اور یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ کون خالص کاریگر تھا، مثلاً مرہٹواڑی میں مہار کی مثال لے لیجئے، اس کی حیثیت گاؤں کے چوکیدار کی تھی، اور اس طرح اس کے پاس چھوٹا سا قطعہ اراضی بھی ہوتا تھا لیکن اس کا بڑا انحصار گاؤں کے حقوق پر تھا، اور بلا اراضی والے مزدور طبقے میں شامل ہونے والوں میں وہ بہت آگے ہوتا تھا، اس میں بظاہر کاریگری کی کوئی خصوصیات نظر نہیں آتیں لیکن بڑے علاقے میں مہار موٹے قسم کا کپڑا بننے والا بھی تھا۔ کمہار دراصل کاریگر تھا، لیکن ملک کے اکثر حصوں میں اس کا پیشہ اس کو ایک گدھا رکھنے پر مجبور کرتا تھا، اس طرح وہ عام طور پر گاؤں کا باربردار بھی ہو جاتا تھا، یا پھر چمڑے کا کام کرنے والا اکثر نیم وقتی زرعی مزدور نظر آتا تھا ان مشکلات کے باوجود معمولی اور سادہ مزارعین کے علاوہ گاؤں کی آبادی تین حصوں میں منقسم کی جا سکتی ہے، ان میں معاشی اور سماجی حیثیت سے سب سے اعلیٰ طبقہ پجاری اور پٹواری پر مشتمل ہوتا تھا، پھر صناع کا درجہ تھا جس میں خاص طور پر لوہار، نجار، تیلی، جلاہا، کمہار، اور موچی شامل تھے، اس کے بعد گاؤں کے خدمتگاروں کا طبقہ مثلاً چوکیدار بھنگی وغیرہ، یہ لوگ بے مہارت مزدوروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اگر ان کے پاس کوئی چھوٹا سا قطعہ اراضی ہوتا بھی تھا تو وہ ان کی ضروریات کے واسطے ناکافی ہوتا تھا، یہ زیادہ تر مزدور تھے، اگرچہ کبھی کبھی وہ اس کام کے ساتھ چند دوسرے کاموں مثلاً موٹے قسم کی پارچہ بافی سبد سازی اور حصیر سازی کو ملا دیا کرتے تھے۔

۱۶۵

تقریباً نصف صدی سے زائد کے دور میں اس ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ کچھ زیادہ بڑی نہ تھیں، قدیم کاریگروں کی بڑی تعداد کو اب بھی حقوق ادا کئے جاتے ہیں کاموں کا معاوضہ آج بھی بشکل جنس ادا کیا جاتا ہے[1] گاؤں میں آج بھی وہی کاریگر ہیں جو پہلے تھے اس طرح جس نوعیت و حد تک تبدیلی ہوئی وہ کوئی انقلابی نہ تھی، لیکن تبدیلی کا رجحان قطعی تھا اور یہ تبدیلی ادائیوں اور خدمات کو متروک کرنے کے سلسلے میں نہ تھیں بلکہ رواجی حقوق کا حصہ اب کاریگروں کی آمدنیوں میں پہلے کی بہ نسبت غیر اہم ہوتا جا رہا تھا، اور یہی صورت ان کے موروثی قطعات اراضی کی تھی یعنی ان کی اہمیت بھی کم ہو گئی تھی، پھر اب کاریگر نقل وطن پر زیادہ آمادہ ہو گیا تھا اور یہ تمام علامتیں جماعت کے پرانے شیرازے کو منتشر کرنے کا باعث ہو رہی تھیں، پنچایت (گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس) کے بتدریج زوال نے اس تعلق کے بندوں کو ڈھیلا کرنے میں مزید معاونت کی، ذرایع آمد و رفت کی سہولتوں اور وہ چیزیں جو پہلے خود گاؤں کے اندر فراہم ہو جاتی تھیں، ان کے گاؤں سے باہر حاصل کرنے کے امکانات نے، اب صناعوں کی گاؤں میں رہنے کی ضرورت کو کم کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی خدمات بالکل متروک ہو گئیں بلکہ ان کی خدمات کی سالانہ ادائیاں کرنے کی بجائے، ان کو کام کا معاوضہ دینے کا رجحان پیدا ہونے لگا، پیداوار میں حصہ ملنا غیر اہم ہو گیا اور زیادہ تر کام کا معاوضہ اس کی جگہ لینے لگا۔ یہ عبوریت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی، ذرایع آمد و رفت کی سہولتوں نے بعض صناعوں

---

[1] نجار، لوہار، دھوبی، نائی، کمہار وغیرہ اب تک دیہات میں کمینوں کی حیثیت سے موجود ہیں، ان کے حقوق اور معاوضے معین ہیں، ٹی، مارٹن، صوبہ جات متوسط کی رپورٹ مردم شماری (۱۹۱۱ء)

میں یہ جزوی رجحان پیدا کر دیا کہ بڑے گاؤں یا قصبوں میں جمع ہو جائیں کیونکہ اب وہ چیزیں جن کی رسد کے لیے ہفتہ واری بازار کا انتظار کرنا پڑتا تھا، گاؤں میں باہر سے آجایا کرتی تھیں، اور کاریگروں کی مقام پر موجودگی کی بھی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اور جن دو اسباب نے اس وقت کاریگروں کی نیم اجتماعی تحریک میں مدد کی وہ یہ تھے کہ اول کاشتکار کی ضروریات کی ناگہانی صورت اور دوسرے بار برداری کی سہولت انھی دونوں اسباب کی وجہ سے لوہار اور نجار کی موجودگی گاؤں میں ضروری سمجھی گئی، کیونکہ زرعی آلات کی مرمت کے لیے ان دونوں کی کسی وقت بھی ضرورت ہو سکتی تھی بلکہ کمہاروں کا سامان بھی کہیں دور سے نہیں لایا جاسکتا تھا، کیونکہ وہ بہت ہی نازک ہوتا ہے، چمڑے کا کام کرنے والوں کی موجودگی خاص طور پر ان حصوں میں ضروری تھی جہاں کنوؤں سے آب پاشی کی جاتی اور چمڑے کے ڈولوں کی ضرورت ہوتی تھی، اس نقطۂ نظر سے ان تمام کاریگروں میں جولاہے کی خدمات سب سے کم ضروری تھیں کپڑے کی ضرورت کو کچھ دیر کے لیے ملتوی بھی کیا جاسکتا ہے، نیز پارچہ بافوں کی مصنوعات دور دراز سے بھی لائی جاسکتی ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جولاہے کاریگروں کے طبقے میں سب سے پہلے لوگ تھے جن میں بڑے مرکزوں پر جمع ہونے کی علامت نظر آتی ہے، رنگریز بھی اسی کشتی کا سوار تھا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جولاہے کے لیے خود ہی رنگریز ہونا کچھ زیادہ غیر معمولی بات نہ تھی، سنار کی بھی یہی صورت رہی، اور سوائے ان صورتوں کے جہاں سنار گاؤں کے مہاجن بھی تھے، ان میں اجتماعیت کا یہ رجحان بہت زیادہ واضح نظر آتا ہے[1]۔

۱۶۶

[1] سنہ ۱۹۰۱ء کی پنجاب کی رپورٹ مردم شماری میں تذکرہ ہے کہ قیمتی دھاتوں کی قیمت میں غیر یقینی

کاریگروں کے کسی ایک جگہ جمع ہونے کے رجحان کے علاوہ جو ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں کا نتیجہ تھا، دو اور اسباب تھے جو ان کے مندرجۂ بالا طبقے میں تبدیلی پیدا کر رہے تھے۔ یہ دونوں اسباب ان صورتوں میں بہت زیادہ واضح ہیں جہاں بیرونی مسابقت یا دوسرے اسباب کی بنا پر صنعت تباہ حالت میں تھی۔ یہ رجحانات ان کاریگروں میں ملتے ہیں جو اپنے پیشوں سے خارج کر دیے گئے تھے، کہ یا تو وہ دن کے دن کام کرنے والے مزدوروں میں شامل ہو جائیں یا قصبوں میں روزگار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں، لیکن قصبوں میں اس قسم کا توطن محدود تھا، دن کے دن کام کرنے والے مزدوروں کی بڑی تعداد گاؤں کے کمین طبقوں کے بڑے حصے پر مشتمل ہوتی تھی، لیکن بہت سے کاریگر طبقوں کے لوگ بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے آخر میں چند کاریگر ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی حالت درست کرتے ہی اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر زراعت اختیار کر لی، یہ ان مخصوص سماجی حالات کا نتیجہ تھا جو اس وقت جماعت میں کارفرما تھے، وہ کاریگر جو اپنے پیشوں سے نکال دیے گئے انھوں نے یہ چند صورتیں اختیار کیں، لیکن جو لوگ اپنے آبائی پیشوں میں مصروف تھے، ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ان کی تنظیم یا در اصل اس کا فقدان، اور ان کے کام کرنے کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر بعض مقامات پر ان کے حقوق گھٹ گئے تھے تو بھی انھیں کام کا معاوضہ بشکل جنس ملتا تھا اور ان کی آمدنی تقریباً یکساں تھی، صرف ان

۱۶۷

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ حالت دیہات میں رہنے والے سناروں کے لیے ناموافق تھی لہذا متمول سناروں میں یہ رجحان پیدا ہونے لگا کہ وہ ان قصبوں میں جا کر بس جائیں جو ریل کی لائنوں پر واقع تھے۔

لوگوں نے جو بڑے گاؤں میں جمع ہو گئے، اپنی صنعتی تنظیم کو اس دور میں کچھ منظم کر لیا تھا، ورنہ اس دور میں دیہی صنعت کی تنظیم اور معاشی حیثیت میں بہت کم فرق ہوا تھا۔ اس کے برخلاف، انفرادی طبقوں کی حالت میں بعض نمایاں قسم کی تبدیلیاں ہو گئی تھیں لہذا کاریگروں کے چند اہم طبقوں کے حالات پر الگ الگ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

لوہار اور نجار کو سب سے پہلے لیجیے، ان دونوں کاریگروں کے کاموں میں بڑی مماثلت ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں ان کے پیشے متبادل ہیں، زرعی کاموں کے لیے دونوں ضروری ہیں، کیونکہ ان کا خاص کام زرعی آلات کی تیاری یا مرمت ہے دیہی لوہار کا کام ہمیشہ بگڑ قسم کا رہا ہے، اور بہتر آلات کی ترویج میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ وہ ان کی مرمت نہیں کر سکتا، زرعی آلات کے علاوہ جو چند دوسری چیزیں وہ بناتا تھا وہ گھریلو ضروریات کی اشیا اور دوسرے کاریگروں کے اوزار ہوتے تھے، دیہی لوہار کی حیثیت بیرونی اثرات سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی، وہ طبعزاد چیزیں بہت ہی کم بناتا تھا اور زیادہ تر مرمت کے کاموں میں لگا رہتا تھا، جن کی طلب بھی برابر قایم تھی، اس کے برخلاف دیہی لوہاروں کی طلب میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہو رہا تھا، حالانکہ قصبوں میں ایسی صنعتیں بڑھ رہی تھیں جن میں لوہاروں کی ضرورت تھی مثلاً شمالی ہند میں کاردگری کی تجارت ترقی کر رہی تھی اور لوہا ڈھالنے والے اور انجینیری کے کارخانے تقریباً سارے ہندوستان میں پھیل رہے تھے[1]۔ یہ واضح نہیں کہ آیا قصبوں کی اس طلب کو پورا کرنے کے لیے دیہی لوہاروں میں کوئی خاص تحریک پیدا ہوئی لیکن

[1] بنگال، صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں لوہے و فولاد کی صنعتوں کے رسالے۔

کسی صورت میں بھی وہ کچھ زیادہ قابل لحاظ نہ تھی، البتہ جب وہ قصبوں میں چلا جاتا تو اس کی حالت یقیناً بہتر ہو جاتی تھی۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے شہری لوہار کے جس نے اپنی حالت کچھ درست کی، اس دور میں لوہاروں کی حالت کم و بیش یکساں رہی، لازمی طور پر دوسرے دیہی کاریگروں کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ اجرتی کام کرنے لگا تھا، لیکن ساتھ ہی اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اس کی خدمات کی طلب میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ اور اگر گاؤں میں لوہاروں کی تعداد تناسب سے کچھ زائد ہو جاتی، تو ان کو دوسرے پیشوں میں مصروف ہونا پڑتا تھا۔

نجار کو دیہی جماعت میں اسی کے مماثل حیثیت حاصل تھی، لیکن وہ لوہار کی بہ نسبت مرمتی کام کم اور اصل کام زیادہ کیا کرتا تھا اور یہیں اس کی حالت خراب ہو گئی، مثلاً نیشکر کی کاشت ہونے والے علاقوں میں نیشکر توڑنے کی آہنی چرخیوں نے اس کی اہمیت کو بہت کم کر دیا۔ یہی صورت آہنی ہل کی ترویج کے متعلق کہی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ یہ تحریک کچھ زیادہ عام نہ تھی اس لیے اس کے اثرات بھی بہت زیادہ محسوس نہ ہوئے، لیکن جہاں کہیں زرعی کاموں میں بہتر مشینوں کا استعمال شروع ہو گیا وہاں نجار کی حیثیت بہت زیادہ غیر محفوظ ہو گئی تھی، چنانچہ ۱۹۱۱ء کی بنگال کی رپورٹ مردم شماری میں نجار کو ان دیہی کاریگروں میں شامل کیا گیا ہے جو تیزی سے تنزل کر رہے تھے، اگر دیہی نجار قصبوں میں آ کر بس جاتا تو اس کے ذرایع بہتر ہو جاتے، قصبوں میں تعمیری تجارتوں کی عام جد و جہد، سواری اور بار برداری کی گاڑیوں کی صنعت، اور فرنیچر کی چھوٹی مصنوعات میں اس کی اچھی خاصی مانگ پیدا ہو گئی تھی[1]۔ براہ راست

[1] اے، سی، چٹرجی، صوبہ جات متحدہ کی صنعتوں پر نوٹ، باب سوم، (۱۹۰۸ء)۔

اثر پڑنے کے بجائے نجار پر بیرونی مسابقت کا اثر بالواسطہ تھا چنانچہ اگر بعض حصوں میں اس کی حیثیت میں تنزل ہو رہا تھا تو دوسرے حصوں میں اس کی حیثیت برقرار تھی، لیکن قصبوں میں لوہاروں اور نجاروں دونوں کے واسطے اپنی حالت درست کرنے کے اچھے خاصے مواقع تھے، لیکن ان دونوں صورتوں میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ شہری صنعت کی وسعت بہت ہی محدود تھی۔

غالباً دیہی صناعوں میں سب سے زیادہ غریب کمہار تھا، جو سامان وہ بناتا تھا وہ دیہی مصنوعات کی تمام چیزوں سے ارزاں ہوتا تھا، اس کا کاروباری سرمایہ بہت ہی مختصر ہوتا تھا دیہی کاریگروں میں کمہار تنزل پذیر طبقہ تھا، اور ہر جگہ اس کی تعداد میں تخفیف ہو رہی تھی۔ بیرونی اثرات جو اس صنعت کے زوال کا باعث ہو رہے تھے وہ ہندوستانی تانبے اور پیتل کے برتنوں اور درآمد ہونے والے ارزاں چینی سامان کی کمہارو برتنوں سے مسابقت تھی۔ ہندوستان میں ظروف سازی کا ایک کارخانہ بھی تھا مگر اس کا سامان اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا اور اس کی دیہی کمہار کے سامان سے مسابقت نہ ہوتی تھی، تانبے اور پیتل کے برتنوں کی مسابقت نے کمہار کو خریداروں کے اعلیٰ طبقے سے محروم کردیا۔ ذی حیثیت کاشتکار گھریلو ضروریات میں مٹی کے برتنوں کے استعمال کو ترک کر رہا تھا، اور ان کے بجائے تانبے اور پیتل کے برتن استعمال کرنے لگا تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ لوہے کا نقشین سامان کس حد تک دیہات میں پہنچا۔ بہرحال غریب طبقوں کی طلب علیٰ حالہٖ قائم رہی

۱۶۹

ا؎ بمبئی کے ظروف وشیشے کارسانہ، سی۔ ای۔ لو، صوبہ جات متوسط و برار کی صنعتی تحقیق کی رپورٹ باب چہارم (۱۹۰۸ء)، نیز چیٹرجی، حوالہ بالا، باب چہاردہم۔

کمہار کے لیے، نجار یا لوہار کی طرح قصبوں میں منتقل ہونے کی صورت نہ تھی، چنانچہ وہ کمہار جو اپنے آبائی پیشوں سے نکال دیے گیے انھوں نے معمولی زرعی مزدوری شروع کردی۔

دیہی صناعوں میں جو طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ دیہی دباغ تھا، اس کی حالت اسی وقت سے ابتر ہونا شروع ہوگئی جب سے خام کھالوں اور چمڑوں کی عالمی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہونا شروع ہوا اور اس بات سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا کہ اکثر حصوں میں مردہ مویشی کا چمڑا اس کا حق سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کہیں گاؤں میں اس کو اپنا خام مال خریدنا پڑتا وہاں اس کی حیثیت بڑی خراب تھی کیونکہ برآمد کرنے والے یا کانپور، بمبئی، احمد آباد کے دباغت کے کارخانوں کے گماشتے بہت آسانی سے زیادہ دام دینے کے لیے تیار رہتے تھے، کھٹنکوں کی صورت حال نے یہ بات اچھی طرح ثابت کردی کہ دستوری رواج، معاشی قوتوں سے مقابلہ کرنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے، جب تک چمڑوں کی قیمتیں کچھ زیادہ بڑھی ہوئی نہ تھیں، اس وقت تک لوگ یہ عطیے کے طور پر دے دیتے تھے، لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے، مثالاً صوبہ جات متوسط میں مردہ مویشی کے حقوق پر سخت جھگڑے ہونے لگے۔ اس کے متعلق مسٹر مارٹن لکھتے ہیں کہ "انفرادیت کی ترقی کے سامنے، اجتماعی طریق بتدریج کمزور ہوتا جارہا ہے اور اس کا پتا کاشتکار کے تخیل کی اس تبدیلی سے چلتا ہے کہ مردہ جانوروں کا چمڑا جو مہار یا چمار کا حق سمجھا جاتا تھا اب اس پر بھی غور ہونے لگا[1] اس قسم کی مثال صوبۂ مدراس میں ملتی ہے، یہاں مادیگا (کھٹنک) رعایا کے ایک یا دو خاندانوں سے متعلق ہوتے تھے، اور ان گھروں کے

[1] صوبہ جات متوسط کی رپورٹ مردم شماری (۱۹۱۱ء)۔

مردہ مویشی کے حق دار سمجھے جاتے تھے، لیکن چند سالوں سے مادیگاؤں میں یہ بین فرق نظر آتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق میں بیجا مداخلت کرتے ہیں، اور خود رعایا میں یہ خیال تقویت پا رہا ہے کہ وہ خاندانی مادیگاؤں کو الگ کر کے، اپنی ضروریات کے واسطے کھلے بازار پر بھروسا کریں۔ اور ان صورتوں میں رعایا نے مادیگاؤں سے اپنے مردہ مویشی کے چمڑے کی قیمت طلب کرنا شروع کر دی ہے[1]۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رواجی بندشن بہت ہی کمزور رہتا، اس وقت تک حقوق ادا کیے گئے۔ اور خدمات انجام دی گئیں جب تک کہ وہ تکلیف دہ یا مصارف کن نہ تھیں، خام کھالوں اور چمڑوں کی قیمتوں میں کافی اضافے نے دیہی کھٹیکوں کی حالت بڑی خراب کر دی، اور اس طبقے کے بہت سے لوگ یا تو زرعی مزدور بن گئے یا چند لوگوں کی شہری دباغت کی صنعت میں کھپت ہوگئی۔ غالباً تنزل میں دیہی کھٹیک ہی سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

تیلی گاؤں کا خدمتگار نہ تھا، وہ ہندوستان میں ہر جگہ ہوا کرتا تھا، جیسا کہ تمام دوسری دیہی صنعتوں کا دستور تھا کاشتکار تیلی کو خام مال یعنی اس صورت میں روغنی بیج دیتا تھا، اور وہ اس کا تیل نکال دیتا تھا۔ ہندوستان میں تیل کے دو بڑے استعمال تھے، پہلا جلانے کے لیے اور دوسرا پکوان کے واسطے۔ درآمد اور معدنی تیل کے بڑھتے ہوئے رواج نے تیلی کی حیثیت کو بہت زیادہ غیر مستقل بنا دیا، روشنی کے اغراض کے واسطے مٹی کے تیل کا استعمال بہت تیزی سے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اور اس طرح تیلی اپنے کاروبار کے ایک اہم حصے سے محروم ہوگیا۔ تنزل کا آغاز ۱۸۶۰ء کے قریب

[1] چیٹرٹن، مدراس کے چمڑے اور دباغت کا رسالہ۔

شروع ہوا، ہندوستان سے روغنی تخموں کی برآمد اور قصبوں میں تیل نکالنے کی صنعت کی ترقی نے، تیلی کی حیثیت کو بہت زیادہ متاثر نہیں کیا، کیونکہ یہاں تیلی کو کاشتکار انفرادی طور پر روغنی تخم فراہم کیا کرتے تھے شہری صنعت ابھی تک بہت مختصر پیمانے پر تھی، اور اس نے اب تک شہری بازاروں پر بھی پوری طرح قبضہ نہ کیا تھا، لیکن مٹی کے تیل کے رواج سے تیلیوں کی تعداد میں جو کمی ہوئی وہ یقیناً قابل لحاظ تھی۔

تقریباً ہر بڑے گاؤں میں دیہی رنگریز ہوا کرتا تھا، ہندوستان کے قدیم طریقوں پر رنگائی کے کام میں مختلف پیچیدہ طریقے رائج تھے، اس لیے رنگریز اچھی خاصی مہارت رکھنے والے لوگ ہوتے تھے اس سلسلے میں بیرونی سامان کی مسابقت ایک اہم جزو تھا، ہندوستان میں کیمیاوی رنگوں کا آغاز ۱۸۷۰ء میں شروع ہوا، لیکن ابتدا میں وہ ہندوستانی رنگوں کے مقابلے میں بڑے غیر پایدار اور ادنیٰ قسم کے ہوتے تھے، لیکن ان کو دو فوائد حاصل تھے یعنی وہ ارزاں تھے اور ان کو استعمال کرنا بہت آسان تھا، لہذا ان کا رواج ہندوستان میں تیزی سے بڑھا اور ۱۸۹۰ء تک ہندوستانی رنگ استعمال سے تقریباً بالکل خارج ہو گئے، جس سہولت سے یہ رنگ استعمال کیے جاتے تھے انھوں نے رنگریزوں کی طلب کم کردی، کیونکہ لوگوں نے رنگوں کو اب خود استعمال کرنا شروع کردیا، لیکن ان کی درآمد سے ہندوستان کے رنگریز طبقے کو جو نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ انھوں نے رنگریز کی نباتاتی رنگوں کو استعمال کرنے کی وسیع معلومات کو بے قدر کردیا۔ اور صنعت کی اہمیت کو گھٹا دیا۔ مسٹر فاکیٹ کہتے ہیں کہ "ہندوستان میں ارزاں کیمیادی اور بھدے رنگوں کی ترویج کا یہ اثر ہوا کہ اس صنعت کا دروازہ ان تمام لوگوں کے لیے کھل گیا جو اس کو اختیار کرنا چاہیں، کیونکہ رنگائی

۱۷۱

یں اب کسی خاص تحقیق یا معلومات کی ضرورت نہ تھی، جو کہ دیسی اجزا کی صورت میں لازمی تھی[1] اس کی وجہ سے صنعت میں مسابقت تیز ہو گئی اور منافع کا معیار گھٹ گیا، اور صنعت، بیرونی رنگوں کے آغاز ہی سے تنزل پذیر ہونے لگی۔ گرنیوں میں رنگین سوت کی پیدائش نے بھی اس صنعت پر ناموافق اثر ڈالا کیونکہ اب پارچہ باف کپڑا رنگوانے کے بجائے براہ راست رنگا ہوا سوت خرید لیتا تھا، صنعت کو مزید زوال اس بات سے پہنچا کہ اکثر رنگریز کیمیاوی رنگ استعمال کرنے لگے تھے لیکن انھیں یہ رنگ بھی اچھی قسم کے نہ ملتے تھے، مدورا اور دوسرے مقامات کے کارخانوں میں اس صنعت کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی، مگر سوائے مدورا کے اور کہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

رنگائی کی صنعت کی خوش حالی کا دستی سوتی پارچہ بافی کی صنعت سے بہت ہی قریبی تعلق ہے، دستی کرگھوں کی صنعت سب سے بڑی ہے اور سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے لہٰذا یہ معلوم ہو کر کچھ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ بعد کے سالوں میں اس طرف خاص توجہ کی گئی۔ اسی کے ساتھ ملک کی دوسری مصنوعات کے مقابلے میں سوتی بنائی کافی تحصیر یافتہ ہے، ہندوستان کے اکثر و بیشتر قصبوں اور بڑے دیہات میں پارچہ بافوں کے محلے آباد ہیں، بلکہ بعض صورتوں میں تو چلا ہے اکثر گاؤں میں بھی نظر آتے ہیں، موجودہ زمانے میں اس بات میں اختلاف رائے ہے کہ آیا صنعت تنزل پذیر ہے یا نہیں، اس بات پر غور کرنے کے لیے معقول دلائل ہیں کہ ۱۸۵۰ء کے بعد کئی سال تک اس صنعت میں بڑی تیزی سے زوال آیا۔ اور یہ زوال صنعت کے اس شعبے

[1] بمبئی کے رنگ و رنگائی کا رسالہ۔

میں بہت نمایاں تھا جو اچھی قسم کے سامان کی پیدائش کے لیے مخصوص تھا، ڈاکٹر واٹسن کے نتائج ہندوستانی کرگھوں کی مختلف مصنوعات کی تجارتی اہمیت کے متعلق دلچسپ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ایسے چند ہی کپڑے ہیں جو غالباً ہاتھ سے بہت بہتر اور ارزاں طریقے پر بنائے جا سکتے ہیں، دیسی کرگھے برابر زردوزی، شالیں، قالین بناتے رہیں گے جن کے لیے وہ ہمیشہ سے مشہور رہیں" لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اشارہ موٹے کپڑے کی جانب ہے، "دبیز سامان زیادہ پائدار اور گرم ہوتا ہے، اس کی تجارتی اہمیت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے حالیہ روئی کے قحط اور اس کے نتیجے میں خام مال کی قیمت میں اضافے کے باوجود دیسی سامان نے انگریزی سامان کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو زیادہ مستحکم رکھا، حالانکہ اول الذکر کی قیمت یورپی مال کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی"[1] اس طرح دو قسم کے کپڑے ہیں اول زردوزی اور دوسری اعلیٰ قسمیں، جن میں دستی کرگھے کو مخصوص فائدہ حاصل ہے اور دوسرے وہ ادنیٰ قسم کا سامان جو متوسط کاشتکار کی عام ضروریات پوری کرتا ہے اور ہندوستان کی سوتی دستی پارچہ بافی میں اپنی ممتاز جگہ رکھتا ہے، ان دونوں حدوں کے درمیان نسبتہً کم بہتر اور متوسط قسم کے کپڑوں کا شمار ہے، جس میں گرنیوں کی صنعت نے خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا بیرونی، دستی کرگھوں کو قطعی طور پر شکست دے دی ہے۔ مسابقت کی ساری سرگزشت یہ ہے، لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس دور میں صنعت نے تنزل کیا اور کب یہ طریقہ بند ہو گیا پھر ملک کے مختلف حصوں میں یہ دور مختلف ہیں، اگرچہ بنگال

[1] واٹسن، ہندوستان کی سوتی مصنوعات وغیرہ (۱۸۶۶ء)۔

بیرونی مسابقت سے انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں متاثر ہوا، لیکن صوبہ جات متوسط میں یہ اثر چھٹے عشرے سے پہلے نہیں پہنچا۔ بہرحال خواہ ادوار میں اختلاف ہو، لیکن دیر یا سویر ہندوستان کے تمام حصوں میں، دستی کرگھے کی صنعت اس درجہ پر آگئی تھی، جبکہ دونوں حدوں کے درمیانی بازار پر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا گرنیوں کی صنعت نے قبضہ کر لیا۔ اور اس نقطے پر آکر توازن قایم ہو گیا اور اگر اس کے بعد بھی دستی کرگھوں میں کوئی تنزل ہوا تو وہ بہت ہی معمولی تھا، ہم اس مفروضے کی وضاحت کریں گے، صوبۂ مدراس میں اعداد و شمار کے ذریعے، دستی کرگھے کی صنعت کے فرق کا اندازہ لگانے کی دو کوششیں کی گئیں[1]۔ ۱۸۹۱ء میں ناظم مردم شماری اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ باور کرنے کی قطعی گنجایش نہیں ہے کہ اس صنعت میں لوگوں کی تعداد گھٹ رہی ہے، ۱۹۱۱ء میں مسٹر چیٹرٹن نے قطعی طور پر فیصلہ کیا کہ صوبے میں گزشتہ چالیس سال یعنی ۱۸۷۱ء تا ۱۹۱۱ء سے پارچہ بافوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، جہاں تک بمبئی کا تعلق ہے اس کے متعلق ۱۸۹۵ء میں مسٹر ان تھوان لکھتے ہیں کہ ”وہ غالباً وہ لوگ جن کی گزر بسر کا سارا ذریعہ بُنائی پر ہے، ان کی تعداد میں چند سال سے کافی تخفیف ہو گئی ہے“ اور بعد میں اضافہ کرتے ہیں کہ ”لیکن دستی کرگھوں کی صورت میں بیرونی مسابقت کے اثرات پورے طور پر

۱۸۴

[1] صوبۂ مدراس کی رپورٹ ہائے مردم شماری (۱۸۹۱ء اور ۱۹۱۱ء) اس سارے مسئلے کی شماریاتی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمۂ اول، صنعتی کمیشن کی رپورٹ، نتیجہ یہ ہے کہ اس صدی کے آغاز سے یہاں موٹی قسم کی اشیا تیار کرنے والوں کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور اس کے برخلاف اچھی قسم کا سامان تیار کرنے والے جولاہوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

ظاہر ہو چکے ہیں'' اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''یہ باور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اس صنعت میں اب کچھ اور قابل لحاظ تخفیف ہوگی''[1] اس نتیجے کی پر زور حمایت مسٹر مہتا نے یوں کی ہے کہ ''یہ فرض کر لینا بہت ہی مناسب ہے کہ اگر دستی کرگھوں کی صنعت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، تو چند حالیہ سالوں میں اس میں کسی قسم کی تخفیف بھی نہیں ہوئی''[2] مسٹر سل ہیرڈ ۱۸۹۸ء میں صوبہ جات متحدہ کی صنعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یقیناً اس صنعت میں تنزل ہوا لیکن گزشتہ دس بارہ سال سے رفتار تنزل بہت کم ہو گئی ہے[3]۔ بنگال میں زوال کی علامتیں زیادہ واضح تھیں اگرچہ یہاں بھی چند اعلیٰ قسم کی مصنوعات اور کپڑے کی ادنیٰ قسم نے اپنی حیثیت کو برقرار کر لیا تھا[4]۔ ایک دوسرے اندازے کے مطابق ۱۹۰۷ء تک زوال کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مگر اس وقت اس میں ایک نیا جوش داخل ہو گیا[5]۔ اس خیال کو مشرقی بنگال کے اندازے سے تقویت پہنچتی ہے[6]۔ پنجاب میں مسٹر لطیفی نے جو حالیہ تحقیق کی اس میں شرح ترقی یا تنزل کا اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی[7]۔ لیکن ۱۸۸۰ء میں مسٹر فرانسس کی رائے تھی کہ ''مانچسٹر کی مسابقت کے باوجود پنجابی پارچہ باف کی تجارت گھٹنے کے بجائے

---

[1] اِن تھوِن، رسالہ، سوتی کپڑے، بمبئی (۱۸۹۵ء)۔

[2] پی، این، مہتا، دستی بنائی کی صنعت کی رپورٹ (۱۹۰۹ء)۔

[3] سل ہیرڈ، رسالہ، سوتی کپڑے، شمال مغربی صوبے۔

[4] بنرجی، رسالہ، سوتی کپڑے، بنگال (۱۸۹۸ء)۔

[5] جے، جی، کمنگ، بنگال کی صنعتوں کی ترقی اور مستقبل کی رپورٹ (۱۹۰۸ء)۔

[6] جی، ین، گپتا، مشرقی بنگال اور آسام کی صنعتیں اور ذرائع (۱۹۰۸ء)۔

[7] اے، لطیفی، صنعتی پنجاب، ۱۹۱۱ء۔

بڑھ رہی تھی[1]۔ اسی صوبے میں صنعت کے متعلق ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں لکھا ہے کہ "عام رائے یہ ہے کہ دیہات میں ملکی کپڑے کی مصنوعات کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئیں" صرف صوبہ جات متوسط سے مسلسل اور ہر طرفہ زوال کی اطلاعات ملی ہیں[2] جیسی کہ توقع تھی، شہادتیں یکساں نہیں ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اس نظریے کی تائید کرتی ہیں کہ ایک خاص حد پر دونوں صنعتوں کی مسابقت میں نقطۂ توازن قایم ہوگیا اور شہادت سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ ملک کا بڑا حصہ گزشتہ صدی کے اواخر تک اس حد پر پہنچ گیا[3]۔

۱۷۴

اگرچہ آخری دور میں پارچہ بافوں کی تعداد میں کوئی قابل لحاظ تنزل نہیں ہوا لیکن مسابقت کی ابتدا میں صورت حال بہت شدید رہی۔ پارچہ بافوں کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی اگرچہ یہ زیادہ خراب اس لیے نہیں ہوئی کیونکہ انیسویں صدی کے آغاز ہی پر ان کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، اس صنعت میں جو واقعی کمی ہوئی وہ دیہات میں تھی کیونکہ شہری پارچہ باف، یا ان مقامات پر جہاں اس کی اچھی خاصی تعداد تھی وہاں کم از کم تجارتی حیثیت سے اس کی حالت اچھی طرح منظم تھی، پھر اس کے سامنے کوئی دوسرا پیشہ نہ تھا، نیز وہ اپنے کام میں مضبوطی سے جما ہوا تھا، حالانکہ

۱؎ فرانسس، رسالہ، سوتی کپڑے، پنجاب۔

۲؎ سی، ای، لو، حوالۂ گزشتہ۔

۳؎ صنعت کی وسعت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرڈی، تھیکرے کی رائے ہیں اس صنعت میں ہندوستانی گرنیوں کے مقابلے میں دوگنا سوت صرف ہوتا ہے۔ مقابلہ کیجیے جو مقالہ صنعتی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پڑھا گیا۔ نیز ملاحظہ ہو گراہم کلارک حوالۂ گزشتہ۔

یہ اس کے لیے نفع بخش نہ رہا تھا۔ دیہی پارچہ باف جزوی طور پر مزدور
یا کاشتکار بھی تھا، اس لیے دراصل پارچہ بافوں کا ہی طبقہ تھا
جس میں زوال ہو رہا تھا، دستی پارچہ بافوں کے اجتماع کے ساتھ
ہی ساتھ ان میں یہ رجحان بھی نظر آنے لگا کہ دیہی جلاہے نے یا تو
پارچہ بافی بالکل ترک کر دی یا پھر کلیتہً اسی کو شروع کر دیا۔[1]

گویا اس وقت دیہی صنعت سرسبز حالت میں نہ تھی کاریگروں
کے صرف دو طبقے ایسے تھے جو اوسط درجے کے خوش حال اور
بیرونی مسابقت سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے، یہ لوہار
و نجار تھے[2]، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کاشت کے مروجہ طریقوں کی
بدولت ہر گاؤں میں ان کی موجودگی ناگزیر تھی، باقی دوسرے تمام
کاریگروں کی حالت خراب تھی، اور ان کی تعداد میں کمی ہو رہی
تھی، متبادل پیشوں کی صورت میں صرف لوہار اور نجار ہی ایسے
طبقے تھے جن کو اپنے مخصوص پیشوں میں رہ کر قصبوں میں روزی کمانے
کے کچھ اچھے قرائن موجود تھے۔ ان کے علاوہ جو اور دوسرے کاریگر
اپنے پیشوں سے نکالے گئے ان کے لیے سوائے عام بے مہارت
مزدوری کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

دیہات میں کاریگروں کی حیثیت کیا تھی اس کا قطعی تعین کرنا
بہت مشکل ہے، مگر یہ طریقہ عام طور پر اب بہت بے ترتیب سا

---

[1] روئی کی دیہی کتائی کی صنعت انیسویں صدی کے اواخر تک تقریباً بالکل ختم ہوگئی۔ شاذ صورتوں
میں جلاہے کے گھر کی بوڑھی عورتیں اس کام میں مصروف ہیں، اور یہ جہاں کہیں بھی موجود ہے وہ قصبوں میں ہے
لیکن یہاں اس کی موجودگی اور اس سے زیادہ بیگاری خصوصیت دونوں خاص معاشرتی حالات کا نتیجہ ہیں
کیونکہ یہ ان چند صنعتوں میں سے ہے جن میں پردہ نشین یا گھر میں رہنے والی عورتیں عزت سے مصروف
رہ سکتی ہیں۔ ملاحظہ ہو، ہوئے، حوالۂ گزشتہ، نیز اے، سی، چٹرجی، حوالۂ گزشتہ۔

[2] جی، این، گپتا، حوالۂ گزشتہ۔

ہوگیا تھا' لگان بشکل جنس ادا کرنے کے تدریجی خاتمے کے ساتھ ہی فصل کے موقع پر مطالبات کی ادائیوں کا رجحان کم یا بالکل مفقود ہوگیا تھا' یہ بتانا کچھ آسان نہیں ہے کہ کن حصوں میں اور کب یہ دستور بالکل ختم ہوگیا' اس تدریجی خاتمے کی تفصیلات موجود نہیں ہیں' اور اس واقعے کا احساس اس وقت ہوا جبکہ یہ رواج بالکل ختم ہوگیا۔ چنانچہ صوبۂ بمبئی کے ڈھیروں کے متعلق ہم پڑھتے ہیں کہ وہ گاؤں میں یہ لوگ چرس یا موٹ کو درست حالت میں رکھتے ہیں" پہلے اس خدمت کا معاوضہ انھیں فصل کے موقع پر ادا کیا جاتا تھا لیکن یہ رواج اب تقریباً بالکل ختم ہوگیا ہے[1]۔ سنہ ۱۸۸۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں ہر جگہ دیہی جماعتوں کو تقریباً بجنسہ حالت میں دکھایا گیا ہے' لیکن یہاں بھی اس باہمی تعلق کو علیحدہ کرنے والے اثرات کام کرتے نظر آتے رہیں[2]۔ اکثر حصوں میں یہ طریقہ سنہ ۱۹۱۱ء تک بجنسہ موجود تھا لیکن کیٹنگ کا جو حال ہوا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ رشتہ کسی لمحے پر ٹوٹ جانے والا ہے' اس کے ساتھ کوئی انقلاب عظیم نہیں ہو رہا تھا بلکہ تغیر کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی مثلاً جہاں فصل کے موقعوں پر حقوق دینے کا طریقہ اڑ گیا تھا وہاں بھی سالانہ تہواروں یا تقاریب شادی وغیرہ پر انعام و اکرام دینے کا رواج باقی تھا جس امر پر زور دینا ہے وہ یہ ہے کہ کم و بیش ہر جگہ کاریگروں کو مطالبوں یا دستور سے جو باقاعدہ آمدنی ہوتی تھی وہ اب غیر اہم ہوتی جارہی تھی۔ اور اس وجہ سے وہ دوسرے پیشے اختیار کرنے کے لیے زیادہ آمادہ ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں جو دوسرے رجحانات

---

[1] مارٹن' رسالۂ چمڑے وغیرہ بمبئی۔

[2] بمبئی کی رپورٹ مردم شماری (سنہ ۱۸۸۱ء) میں خاص طور پر مسٹر مینی کا نوٹ دیہی جماعتوں پر ملاحظہ ہو۔

کارفرما تھے ان کا حال اوپر بیان کیا جا چکا ہے، صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی وضاحت ضروری ہے اور وہ ان صناعوں کا رجحان ہے جن میں پورے طور پر کاشت کرنے کی صلاحیت موجود تھی، اس کے اسباب ظاہر ہیں، اکثر دیہی صنعتوں کے منافع بہت تھوڑے تھے اور صناع کو اپنی حالت درست کرنے کی بہترین صورت زراعت ہی میں مضمر نظر آتی تھی، اور دیہی صنعتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ ان کی حالت درست کر سکیں، پھر معاشرتی نقطۂ نظر سے حرفتی صنعتوں کے مقابلے میں زراعت کو کافی باعزت پیشہ سمجھا جاتا تھا۔

ان لوگوں کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی جن کے لیے اب اپنی آبائی صنعت میں کوئی گنجایش باقی نہ رہی تھی اور اس کا اظہار ذات اور پیشے کے اعداد وشمار کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلاف سے بخوبی ہو جاتا ہے[1] ان اعداد سے پتا چلتا ہے کہ کاریگر اپنے اپنے پیشے چھوڑ کر زراعت یا عام مزدوری میں داخل ہو رہے تھے، لیکن بعض اسباب نے ان اعداد کو مختلف دیہی صنعتوں کے تقابل کے واسطے ناقابل اعتبار بنا دیا، مثلاً اکثر لوگوں نے ذات کو اپنا حقیقی پیشہ درج کرایا، حالانکہ وہ عرصہ ہوا اس کو ترک کر چکے تھے یا بعض صورتوں میں کسی حرفتی صنعت میں اس ذات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔

سب سے آخر میں اس پر غور کرنا ہے کہ کاریگروں پر قحطوں کے اثرات کیا ہوتے تھے، مادی نقطۂ نظر سے کاریگر اسی سطح پر تھے جس پر کہ عام مزدور تھے، بلکہ ان میں سے بعض مثلاً پارچہ باف تو اس سطح سے بھی کمتر تھے، چنانچہ دیہی کاریگر دیہات کے ادنیٰ کمینوں اور دن کے دن کام کرنے والے زرعی مزدوروں کے ساتھ، قحط کے زمانوں میں امداد حاصل کرنے والے لوگوں میں سب سے آگے ہوتے تھے، اور

ان سب طبقوں میں بھی سب سے پہلے آنے والے جلاہے ہوتے تھے۔[1]
وہ اپنے پیشے کی کس مپرسی کی وجہ سے اور زیادہ مصیبت اٹھاتے تھے، امدادی کاموں میں سب لوگوں کو بلا کسی قسم کی دستی محنت کرنا پڑتی تھی، بڑھئی، لوہار اور معماروں کو تو کبھی کبھی اپنے پیشے کا کام مل جاتا تھا، لیکن دوسرے لوگوں کے لیے اس قسم کی کوئی توقع نہ تھی پارچہ باف جو دستی محنت کا بالکل عادی نہ ہوتا تھا بہت زیادہ تکالیف اٹھاتا تھا، اکثر لوگ اس زمانے میں اپنی مہارت کھو بیٹھتے اور ان کے لیے اپنے پیشے کو دوبارہ اختیار کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔
چنانچہ ان اثرات کو قحط کمشنروں (سنہ ۱۸۹۶ء) نے یوں بیان کیا ہے "خارجی الاصل امداد کے فقدان کی وجہ سے اکثر پارچہ باف قحطوں کی مصیبتوں سے تنگ آکر اپنے ذاتی پیشے کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان میں سے کثیر تعداد پھر اپنے پیشوں میں واپس نہیں لوٹتی بلکہ وہ عام مزدوروں کے زمرے ہی میں گھل مل جاتے ہیں[2]" اس قسم کا اثر دوسرے کاریگروں پر بھی پڑتا تھا مگر وہ اتنا شدید نہیں ہوتا تھا جیسا کہ پارچہ بافوں کی صورت میں ہوتا تھا۔
دیہی صنعت ایک تنزل پذیر صنعت تھی، بڑا حصہ جو اس میں سے خارج کر دیا جاتا تھا وہ عام مزدوری شروع کر دیتا تھا،

---

[1] قحط کمیشن شہادت کی روئداد، (سنہ ۱۸۸۰ء) سب سے پہلے متاثر ہونے والے شہری اور دیہی طبقوں کے متعلق شہادت۔
[2] قحط کمیشن کی رپورٹ، باب ششم، فصل چہارم، (سنہ ۱۸۰۶ء) بعض حصوں میں بالخصوص سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان، جلاہوں کو ان کے پیشوں سے نجات دلاتے کے چند کامیاب تجربے کئے گئے، بلدیہ ناگپور کے کامیاب تجربات کی تفصیلات اور نتائج کے لیے ملاحظہ ہو قحط کمیشن (سنہ ۱۹۰۱ء) روئداد شہادت، راؤ بہادر بھارگو راؤ اور باپو راؤ دادا کی شہادت۔

اور وہ چند خوش قسمت ہوتے جو قصبوں میں اس صنعت میں ضم ہو جاتے تھے، بعض زراعت شروع کر دیتے تھے، اور بقیہ یعنی وہ لوگ جو ابھی تک اپنے آبائی پیشوں میں معروف تھے ان کی حالت وہی رہتی جو ہمیشہ سے تھی یعنی ایک افلاس زدہ طبقہ، جو موسمی تغیرات سے خلاف معمول بہت جلد متاثر ہوتا تھا۔

۱۷۸

باب سیزدہم

شہری صنعت کی تنظیم

ہندوستانی صنعتوں کی مختلف شکلوں میں جس نے نئی بیرونی طاقتوں سے متصادم ہو کر ایک نئی صورت اختیار کی وہ دیسی شہری دستکاریاں تھیں، ہندوستان میں باہر سے آنے والی چیزیں، نخل بندیاں اور کارخانے تھے، مگر یہ بہت منظم شکل میں تھے، دیسی صنعتوں میں دیہی صنعت نئی قوتوں کے دباؤ کی متحمل نہ ہو سکی، اور وہ تنزل کرنے لگی، اس کی تنظیم اب تک فرسودہ شکل میں تھی، وہاں صورت یہ تھی کہ دستکاروں کو ان کے خریدار جو خام سامان مہیا کر دیتے وہ اس پر کام کرتے تھے اور اپنی خدمات کا معاوضہ نقد یا جنس کی صورت میں پاتے تھے۔ اس صورت کو بوچیر نے اجرتی کام سے تعبیر کیا ہے[1]۔ دیہی صنعتوں میں جو اہم تبدیلی ہوئی وہ یہ تھی کہ صناعوں کی خدمات کے معاوضے میں تبدیلی ہو گئی، دوسری صورتوں مثلاً صناعوں کے پاس اصل کی کمی یا اس کی جزوی کاشتکارانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہوا۔

---

[1] سی، بوچیر، صنعتی ارتقا مترجمہ یس، یم ویکٹ، باب چہارم۔

اس کے برخلاف، شہری مصنوعات کے ان تمام شعبوں کی تنظیم میں جو اب تک پھل پھول رہے تھے ایک نمایاں تبدیلی ہوگئی، لہذا صنعتوں کی یہی ایک ایسی شکل تھی جس میں نئی قوتوں کے اثرات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ تمام مصنوعات کی صنعت کارانہ اہمیت اس دور میں ختم ہوچکی تھی، لیکن وہ صنعتیں جن کی کچھ پرانی طلب باقی تھی مثلاً سونے اور چاندی کا کام، سوتی اور ریشمی کپڑے، تانبے اور پیتل کے برتن وغیرہ، یا جن کی نئی طلب پیدا ہوگئی جیسے قالین کی صنعت، ان کی تجارتی اہمیت ابھی بدستور باقی تھی۔ دوسرا بین رجحان یہ پیدا ہوگیا کہ اعلیٰ قسم کی چیزوں کی تیاری ترک ہوکر ارزاں چیزوں کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔ لکڑی و ہاتھی دانت کی نقاشی اور دھاتوں کے صنعت کارانہ کاموں میں یہ چیز خاص طور پر نمایاں تھی۔ اور طلب کی نوعیت میں تبدیلی کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ وہ صنعت کارانہ مصنوعات جو کسی زمانے میں درباروں پر منحصر تھیں اب ان کا دارومدار عامیانہ طلب پر تھا۔

۷۹ دیہی اور شہری صنعت میں ما بہ الامتیاز چیز سرمایہ دار کی موجودگی تھی[۱]۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب صنعت خود مختار صناعوں پر مشتمل تھی انھیں کسی نہ کسی شکل میں قرضے کی ضرورت ہوتی تھی، اور ابتداءً یہ قرضہ صنعت کو خام مال فراہم کرنے والے کی جانب سے مہیا کیا جاتا تھا، گویا صنعتی تنظیم کے ابتدائی دور میں مرصع لکڑی یا

---

[۱] خالص اجرتی کام قصبوں میں بھی نظر آتا ہے مثلاً جب کوئی شخص اپنے گھر میں نقاشی یا لکڑی کا کوئی اور کام کرانا چاہتا تو وہ ایک چوب کار ملازم رکھ لیتا اور اس کو نفی عدد اجرت ادا کرتا تھا، زیورسازی میں یہی طریقہ زیادہ عام تھا، یہاں خام مال ہمیشہ خریدار مہیا کرتا تھا، اور سنار کو عدد کے حساب سے اجرت ادا کی جاتی تھی، حالیہ سالوں میں بنے بنائے زیورات خریدنے کا رواج بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

ہاتھی دانت کی تجارت کرنے والا، کام کرنے والے کو خام مال مہیا کرتا تھا، مگر اس کو تیار اشیا کی فروخت سے کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرا درجہ وہ تھا جبکہ خام مال کی تجارت کرنے والے نے دستکاروں سے تیار شدہ چیزیں خرید کر ان کو بازار میں فروخت کرنا شروع کردیا اس کے بعد کا درجہ یہ تھا کہ تاجر خام مال مہیا کرتا اور ہر علدہ پر صناع کو کام کا معاوضہ دیتا آخری درجہ یہ تھا کہ جب سرمایہ دار نے چند کام کرنے والوں کو ایک جگہ جمع کردیا، خواہ اس کو کام گھر کہا جائے یا چھوٹا کارخانہ۔ آج ہندوستان کی شہری مصنوعات میں یہ تمام صورتیں نظر آتی ہیں بلکہ بعض وقت تو سب صورتیں ایک ہی صنعت میں مل جاتی ہیں۔

دستی پارچہ بانی کی صنعت جو ہندوستان کی تمام دوسری مصنوعات کے مقابلے میں اہم اور عام ہے وہ ان مختلف کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے کیلئے غالباً بہت ہی مناسب ہے، پہلا درجہ یہ ہے کہ خود مختار جلاہا عام طور پر معمولی موٹا کپڑا تیار کرتا ہے اور اپنے سامان کو مقامی طور پر فروخت کردیتا ہے، اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں، اور وہ صرف مقامی تاجر سے تھوڑا سا سوت خرید لیتا ہے، اور وہ سوت کی دوسری قسط اسی وقت خرید سکتا ہے جبکہ وہ اس قابل ہو جائے کہ اپنی پہلی تیار شدہ شئے فروخت کردے، اکثر مقامات پر وہ سارا سوت خرید لیتا ہے[1]، لیکن دوسرے مقامات پر وہ سوت قرضے پر حاصل کرتا ہے، یہاں سے درمیانی آدمی کی ابتدا ہوتی ہے جو عموماً سوتی تاجر ہوا کرتا ہے۔ سوتی تاجر قرضے پر سود طلب کرتا ہے لیکن اس کو تیار شئے کی فروخت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ تنظیمی مدارج صرف ۱۸۰

[1] پی، بن، بھتا۔ دستی بنائی کی صنعت وغیرہ کی رپورٹ، نیز جہڑجی حوالہ گزشتہ باب اول نگینے کا جلاہا تاجر سے سوت پیشگی نہیں لیتا تھا بلکہ خرید تا تھا اور اس کے یہاں کھاتا چالو رہتا تھا۔

موٹے کپڑے کی تجارت اور عموماً صنعت کے چھوٹے مرکزوں میں نظر آتے ہیں، خود مختار جلاہے کا موٹے کپڑے کی پیدائش کے واسطے پابند ہو جانے کا سبب ظاہر ہو جاتا ہے، اگر جلاہا اپنی مصنوعات خود ہی بازار میں لاکر فروخت کرنا چاہے تو بازار اچھا خاصا مستقل اور اس سے نزدیک ہونا چاہیے، دیہی مرکزوں میں اس کے واسطے دیہی بازار یا میلے ہی ایک ایسا ذریعہ ہوتے ہیں جہاں وہ آسانی سے اپنا مال فروخت کر سکتا ہے، لیکن اکثر اوقات یہاں بھی خریدار اور فروشندے کے درمیان ایک کڑی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور بنرجی بیان کرتے ہیں کہ بعض دیہاتی میلوں میں دلال ہوتے ہیں جو خریدار اور فروشندے کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں[1]، اور عموماً یہ ہفتہ واری ہاٹ اور میلے ہی ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں پارچہ باف اور خریدار ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں خود مختار پارچہ باف کے پاس ہر مرتبہ فروخت کرنے کے لیے تھوڑی سی مقدار ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کو فوراً فروخت کر دے ہندوستان میں اچھے کپڑوں کی مانگ موسمی ہوتی ہے لہٰذا آزاد جلاہے کے لیے صنعت کے اس شعبے میں کوئی پائدار جگہ نہیں ہے، بڑے مرکزوں میں بھی جہاں کپڑے کی تجارت کچھ منظم ہے وہاں بھی پارچہ باف کی خریدار سے براہ راست ملاقات کے امکانات بہت کم ہیں، اس لیے یہاں خود مختار پارچہ بافوں کی تعداد زیادہ نظر نہیں آتی۔

خود مختار جلاہوں کی حیثیت بہت ہی زیادہ غیر مستقل ہے، مسٹر مہتا کا اندازہ ہے کہ کل جلاہوں کا ۲۵ فی صدی حصہ اسی طبقے پر مشتمل ہے کیونکہ تھوڑے عرصے تک اپنے سامان کو فروخت

[1] رسالہ سوتی کپڑے، بنگال۔

کرنے میں ناکامی اس کو قرضے کی مصیبت میں پھانس دیتی تھی، اور جب وہ ایک مرتبہ قرضدار ہو جاتا تو پھر وہ اپنا کپڑا براہ راست خریدار کو فروخت کرنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ وہ درمیانی آدمی کو فروخت کر دیتا جو اس کو فوراً دام دے دیتا تھا۔ کبھی کبھی سوت فروش اور پارچہ فروش دو علیحدہ آدمی ہوتے تھے[1]۔ لیکن بیشتر صورتوں میں وہ ایک ہی شخص ہوتا تھا، دراصل سوتی تاجر اکثر صورتوں میں مجبور ہوا کہ وہ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دے[2]۔ کیونکہ پارچہ باف اس کا مقروض ہوتا تھا اور اپنے سامان کو فروخت کرنے میں ناکام رہنے کے بعد، اگر قرض کے معاوضے میں اس کو اطمینان دلانے کے لیے کوئی چیز پیش کر سکتا تھا تو وہ خود کپڑا ہی ہو سکتا تھا، کپڑا سوتی تاجر کی تنہا ضمانت تھی چنانچہ اس نے سوت کی تجارت کے ساتھ ہی عام طور پر کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی۔ یہ طریقہ جس میں جلاہا سوت قرض خریدتا اور پھر سوتی تاجر کو اپنا کپڑا فروخت کر دیتا تھا اس طریقے سے بالکل مختلف تھا، جس میں جلاہا تاجر کے لیے عددی اجرت پر کام کرتا تھا۔ ان صورتوں میں جہاں تاجر اور پارچہ فروش ایک ہی شخص ہوتا تھا، وہاں تاجر سوت کے قرض پر سود طلب کرنے کے بجائے جلاہے سے قبل از وقت اس بات کا وعدہ لے لیتا تھا کہ وہ تیار شدہ مال اسی کو ایک معینہ قیمت پر فروخت کرے گا۔ دستی کرگھے کی معمولی صنعت میں جلاہوں کی بڑی تعداد اسی طریقے سے کام کیا کرتی تھی، اس طرح وہ بڑی مصیبت میں تھے کیونکہ دونوں صورتوں میں تاجر جو منافع خود لیتا وہ بہت زیادہ ہوا کرتا تھا اور ان کے واسطے بمشکل قابل گزارہ اجرت بچتی تھی، لیکن کم از کم

۱۸۱

---

[1] لو، حوالۂ گزشتہ باب سوم۔

[2] اے، آر، براؤن، بنکورا کے جلاہوں کی معاشی حالت۔ بنگال اکنامک جرنل (جنوری ۱۹۱۷ء)

عملی طور پر وہ دست نگر نہ تھے، مگر جب جلاہا قرضے میں بہت بری طرح پھنس گیا تو اس کی یہ رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی، اس کو اپنا کھر گھا قرضہ دہندہ کے پاس مکفول کرنا پڑا اور وہ اس کے لیے ٹھیکے پر کام کرنے لگا۔ اس طرح تقریباً تمام مرکزوں پر ایسے چند صاحب حیثیت تاجر ہوتے تھے جن کے واسطے جلاہوں کی تقریباً نصف آبادی ٹھیکے پر کام کیا کرتی تھی۔ اور جب جلاہے نے اس طرح اپنی آزادی کھو دی تو اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ اس طرح صنعت کے اکثر مرکزوں میں دو قسم کے جلاہے یعنی خود مختار صناع اور سرمایہ داروں کے لیے ٹھیکے پر کام کرنے والے کاریگر، پہلو بہ پہلو کام کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اس صنعت کے بعض شعبوں میں خود مختار صناع بالکل مفقود ہو چکے تھے، یہ ان صورتوں میں ہوا جہاں پیداوار کا بازار صنعت کے مرکزوں سے بہت دور تھا اور جہاں خام مال کی قیمت نسبتہً زائد تھی۔ اور ان صورتوں میں گھریلو مصنوعات " یا "کمیشنی صنعتیں" پیدا ہو گئیں، اس قسم کی ایک اچھی مثال کوئمبتور کے اعلیٰ کپڑوں کی صنعت تھی، اس صنعت کی مصنوعات کا بازار مرہٹواری میں تھا جو بذات خود کوئمبتور سے بہت فاصلے پر ہے، اور اس کی تجارت چند چھوٹے چھوٹے تاجروں کے ہاتھ میں مجتمع ہو گئی۔ جلاہوں کو عام طور پر سوت یا ریشم اور طلائی تار (کیونکہ صنعت حاشیہ دار کپڑوں کی تھی) کی ایک معینہ مقدار تاجروں سے مل جاتی تھی، اور چیز بنا لینے کے بعد وہ اپنی اجرت لے لیتے تھے، اس صنعت میں جلاہوں کا تعلق کسی ایک تاجر سے ضرور ہوتا تھا، حالانکہ یہ اپنے گھروں اور خود اپنے کرگھوں پر کام کرتے تھے[1] اس طرح ایک اس صنعت میں جس کی مانگ مخصوص تھی، جلاہے تمام تر درمیانی

[1] مسٹر ین، جی، چٹیار کی شہادت، روئداد شہادت، صنعتی کمیشن جلد سوم (۱۸-۱۹۱۶ء)

آدمیوں کی فرمائش پر کام کیا کرتے تھے، بعض جلاہوں کو حالات نے اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا کرگھا بھی کھو بیٹھتے تھے، ان کو "مزدور جلاہا" کہا جاتا تھا، یہ ان خود مختار مالدار جلاہوں کے گھروں میں کام کیا کرتے تھے جن کے پاس اتفاق سے ان کے خاندان کے ارکان کو مصروف رکھنے کے علاوہ چند زائد کرگھے ہوتے تھے، اوسطاً ہر جلاہے کے گھر میں ایک کرگھا ہوتا تھا، لیکن چھوٹی حیثیت کے مالدار جلاہوں کے پاس کبھی کبھی پانچ یا چھ کرگھے بھی ہوتے تھے اور یہ ان زائد کرگھوں پر مزدور جلاہوں سے کام لیتے تھے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ کوئمبتور کی صنعت میں وہ جلاہے بھی جن کے پاس پانچ یا چھ کرگھے ہوتے تاجروں کی فرمائش پر کام کیا کرتے تھے اکثر مقامات پر جن جلاہوں کے پاس زائد کرگھے تھے اور جن کے ہاں مزدور جلاہے کام کرتے تھے وہ کسی حد تک دوسرے جلاہوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔

بالکل خود مختار جلاہے یا تو دیہات میں ملتے تھے یا قصبے کی چھوٹی صنعت میں نظر آتے تھے، مسٹر مہتا بیان کرتے ہیں "تمام جلاہے جو کاریگر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں کم و بیش زمین سے تعلق رکھتے ہیں"، نیم مختار صناع بڑے قصبوں کی موٹے کپڑوں کی صنعت میں نظر آتے تھے، لیکن جیسے ہی اچھی قسم کے سامان کی بنائی کا آغاز ہوا گھریلو طریقہ رائج ہونے لگا۔ خود مختار جلاہا بہت غریب تھا اور اس میں ریشم، طلائی تار یا دوسرے قسم کا قیمتی مال خریدنے کی استطاعت نہ تھی، حتیٰ کہ چھوٹے مرکزوں اور دیہات میں بھی جہاں اچھی قسم کی چیزیں تیار ہوتی تھیں وہاں جلاہا مقامی مہاجن کی فرمائش پر کام کیا کرتا تھا، اس کے برخلاف مزدور جلاہا ہر جگہ پایا جاتا تھا۔

[1] مہتا، حوالہ گزشتہ۔

اور بڑے مرکزوں میں اس کی تعداد کافی ہوتی تھی۔

دستی کرگھے کی سوتی صنعت کے اکثر شعبوں میں کارخانہ داری طریق کے رواج کی قطعی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ جب کبھی طلب غیر مستقل ہوجاتی تو گھریلو صنعت کے اصل داروں کو کارخانہ داری طریق کے مقابلے میں یہ بڑا فائدہ حاصل تھا کہ وہ طلب کم ہوجانے کے زمانے میں اپنی فرمائیشات روک دیتا تھا، اور اس طرح اس کو کوئی زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا، ان صورتوں میں جہاں کہ طلب اچھی خاصی مستقل تھی وہاں کارخانہ داری طریق کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ عموماً اس ناکامی کے جو اسباب بتائے گئے وہ یہ ہیں کہ جلاہے کو باضابطہ طور پر کارخانے میں حاضری کی ترغیب دینا بڑا دشوار تھا اور جب وہ گھر چھوڑ کر کارخانے میں کام کرنا شروع کرتا تو اس کے خاندان کی محنت کا نقصان ہوتا تھا[1]۔ دوسرا سبب واقعی اہم ہے۔ لیکن خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دستی کرگھے کی صنعت کو کارخانے داری طریق پر منظم کرنے سے اس قدر کفایات حاصل نہ ہوئیں کہ اصل دار جلاہوں کو گھر پر کام کرنے کی صورت میں جو اجرت دیتا تھا اس کے مقابلے میں زائد اجرت دے کر خود بھی کافی نفع کما سکے، کیونکہ دستی کرگھے کی صنعت میں جو کفایات اصلاحوں مثلاً خود بخود چلنے والی نلی کی ترویج کی بدولت حاصل ہوئیں وہ جلاہے کے گھر پر کام کرنے کی صورت میں بھی ہوسکتی تھیں اس لیے کفایات کچھ زائد نہ تھیں اور جلاہے کو زائد اجرت کے ذریعے گھر چھوڑ کر کارخانے میں کام کرنے کی ترغیب دینا، اصل داروں کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے میشن یا گھریلو طریقہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا تھا اور صنعتی تنظیم کی خاص شکل بنتا جا رہا تھا۔

۱۸۳

[1] راؤ بہادر بی، تھیگا ریا چیٹی، کی شہادت، حوالۂ گزشتہ جلد سوم۔

حسبِ توقع ریشم کی بنائی کی صنعتی تنظیم کی بھی وہی کیفیت تھی جو اعلیٰ درجے کے سوتی سامان کا حال تھا۔ چونکہ خام مال بہت قیمتی ہوتا تھا، اس لیے جلاہے کو پورے طور پر تاجروں کے لیے کام کرنا پڑتا تھا، مدراس کے رسالے میں، بہرام پور کی تنظیم کا حال یوں بیان کیا گیا ہے کہ "جلاہوں کی بڑی تعداد اور بالخصوص قیمتی کپڑوں کی صورت میں تاجروں کے لیے کام کرتی ہے اور انھیں ٹھیکے کے طریقے پر اجرت ملتی ہے[۱]"۔ بمبئی کے رسالے میں اس طریقے کی ترقی کا جو حال درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلاہے کا انحصار تاجروں پر بڑھتا جا رہا تھا، یہاں بھی نمایاں صورت اسی قسم کی تھی، "تاجر چھوٹی چھوٹی رقمیں پیشگی دے دیتے ہیں ریشم مہیا کراتے ہیں اور جلاہوں سے کپڑا خرید لیتے ہیں اس طرح ذاتی طور پر ان کو خوب نفع ہوتا ہے[۲]"۔

تانبے اور پیتل کے برتنوں کی صنعت ان صنعتوں میں تھی جو ہندوستان میں کبھی دیہات میں نہیں پھیلی، یہ ہمیشہ سے خاص طور پر شہری صنعت ہی رہی، لیکن پہلے کے مقابلے میں اس دور کے آغاز سے یہ بڑے قصبوں میں زیادہ مجتمع ہونے لگی، اس صنعت میں جو مختلف تنظیمی مدارج پائے جاتے تھے وہ خود مختار صناع، استاد اور اس کے ایک یا دو نائب اور کام گھر تھا۔ پہلی دو صورتیں چھوٹے قصبوں میں زیادہ رائج تھیں، صنعت خوش حال تھی اور اس کی مصنوعات کی طلب بہت زیادہ تھی، طریق عمل میں تفریق اور تخصیص بڑی سرعت سے پھیل رہی تھی اور بتدریج مشینوں کا رواج بھی ہو رہا تھا ان سب اسباب نے اس صنعت کو چند بڑے قصبوں میں ۱۸۴

---

[۱] تھرسٹن، (۱۸۹۹ء)۔

[۲] ایڈورڈس، رسالہ، ریشمی کپڑے، بمبئی (۱۹۰۰ء)۔

مجتمع ہو جانے دیا۔ کام گھر، اس کی تنظیم کی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر بڑے قصبوں میں ایسے کام گھر تھے جہاں بیس یا اس سے زائد مزدور بھی کام کرتے نظر آتے تھے[1]۔ سوتی دستی پارچہ بافی کے مقابلے میں اس میں بڑا تضاد تھا، دستی کرگھے کو ایک ہی آدمی چلاتا تھا اور یہاں کام کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹا نہیں جا سکتا تھا لیکن اس کے برخلاف تانبے اور پیتل کی صنعت میں طریقہ مختلف تھا اور یہاں کام کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا تھا، اور ہر کام کے لیے ایک تخصیص یافتہ کاریگر نفع بخش طریقے پر رکھا جا سکتا تھا چند سادہ کاموں کے واسطے مختصر قسم کی مشینوں کی ترویج بھی ممکن تھی لہٰذا ایک ایسی صنعت جو تخصیص یافتہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دے اور جس میں اپنی وسیع گنجایش کی وجہ سے سادہ کاموں کے واسطے مشینوں کے استعمال کا امکان ہو، اس میں پس اندازی کی گنجایش زیادہ تھی اور اس کو ترقی کرنا چاہیے تھا۔

تار اور گوٹے کی صنعت (یا سونے اور چاندی کے تاروں کی صنعت) میں مختلف کاموں کے لیے اس سے بھی زیادہ تخصیص کی گنجایش تھی۔ یہاں خام مال کو تیار ہونے تک، کام کرنے والوں کی مختلف ٹولیوں کے ہاتھوں سے گزرنا ضروری تھا خود مختار صناع کی اس صنعت میں قطعی گنجایش نہ تھی، "کیونکہ یہ تاجر تھا جو ہر درجے میں مال مہیا کرتا اور تیار شدہ اشیا واپس لیا کرتا تھا[2]"، تاجروں کے طبقوں میں اختلاف تھا، صوبہ جات متحدہ میں یہ لوگ عموماً زردوزی کے تاجر تھے جن کی طلب خاصی ہوتی تھی، کہا جاتا ہے کہ مشینوں سے جو سامان بنایا گیا وہ دستی سامان کے مقابلے میں بہت ہی گھٹیا تھا،

[1] ڈیم پیر، رسالہ، تانبے اور پیتل کے برتن، شمال مغربی صوبے (۱۸۹۹ء)۔
[2] نستم، رسالہ، تار و گوٹا کناری، بمبئی، (۱۹۰۹ء)۔

لیکن اس صدی کے آغاز سے جرمنی کے بنے ہوئے ارزاں سامان کی مسابقت اس صنعت کی حیثیت کو بڑا نقصان پہنچا رہی تھی اور اس کو اپنی حفاظت کے لیے مشینوں کو اختیار کرنا پڑا اور ارزاں چیزیں تیار کرنا پڑیں، لیکن ہر جگہ صورت حال یہ نہ تھی صرف بمبئی اور گجرات کے قصبوں میں کسی بڑے پیمانے پر مشینوں کا استعمال ہوا، اور یہی وہ مقامات تھے جو بیرونی مسابقت کے باوجود اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکے، جب مشینوں کی ترویج شروع ہو گئی تو تنظیم بالکل کارخانہ داری طریق کی ہو گئی۔

قالین کی صنعت تنہا ایسی شہری دستکاری تھی جس کا بیرونی بازار قابل لحاظ تھا، حقیقت میں ہندوستان میں جتنے اونی روئیں دار قالین بنتے تھے وہ سب برآمد کیے جاتے تھے یہ تمام تر ارزاں قالین کی صنعت تھی، اس کے دو خاص مرکز مرزا پور اور امرتسر تھے لیکن ان دونوں مقاموں کی تنظیم میں کچھ اختلاف تھا، مرزا پور میں یہ صنعت قصبے کے آس پاس کے دیہات میں پھیلی ہوئی تھی اور خود قصبے میں بہت کم قالین باف تھے اس کی تمام تر نگرانی برآمد کرنے والی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھی، لیکن وہ براہ راست بافندوں سے معاملہ نہیں کرتی تھیں ان کا معاملہ کرگھے کے مالکوں سے ہوتا تھا جو اپنے بافندے یا دوسرے لوگ رکھ کر کام کرتے تھے، کمپنیاں کرگھوں کے مالکوں کو پیشگی دے دیا کرتی تھیں اور یہ لوگ بافندوں کو پیشگی رقم دے دیتے تھے، اکثر صورتوں میں بافندے کرگھوں کے مالکوں کے بری طرح مقروض ہوتے تھے اور یہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یعنی بافندوں کو برابر کام نہیں دیتے تھے، کیونکہ مالک کے لیے یہی چیز مفید تھی کہ بافندوں کی بڑی تعداد اس سے متعلق رہے تاکہ طلب بڑھنے کی صورت میں ان سے کام لیا جا سکے، یہاں تنظیم پھر کمیشن یا گھریلو طریق پہ

نظر آتی تھی[1]۔ اس کے برخلاف امرتسر میں صنعت کی تحصیر خود قصبے کے اندر ہو گئی تھی، برآمدی کمپنیاں جو خود ہی پیدا کنندگان بھی تھیں، ان کی نگرانی کرتی تھیں، مسٹر لتی مر کہتے ہیں کہ یہ بالکل کارخانے والی صنعت تھی، لیکن تنظیم کارخانے داری نہیں تھی کیونکہ کارخانے میں کام استاد کو دیا جاتا ہے جو اپنے کاریگر خود رکھتا ہے استاد کو عام طور پر اچھا خاصا منافع ہوتا ہے، لیکن اکثر اوقات کمپنی سے اس کا معاہدہ نقصان دہ ہو جاتا ہے، اس طرح وہ کارخانے کے فورمین کی طرح اجرت پر کام کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ بذات خود بڑی حد تک پیدائش کے خطرات برداشت کرتا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ ہندوستان میں شہری دستکاریوں سے نمو پانے والی صنعتی تنظیم کے تمام مدارج پہلو بہ پہلو اس صنعت میں موجود تھے اس دور میں جو خاص تبدیلیاں ہوئیں وہ تمام صنعتوں میں بازارات کی وسعت اور بیرونی مسابقت کا آغاز تھا۔ بازاروں کی وسعت کا اثر ہر جگہ صنعتوں کی تحصیر میں ظاہر ہوا نیز ان میں تخصیص کا رواج بھی بڑھ گیا، ہم کو گزشتہ باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ دیہاتی ابھی تک بیرونی صنعتوں کی پیداواروں کا استعمال بہت کم کرتا تھا، اس لیے یہ جو کچھ بھی رجحانات تھے وہ صنعتوں کی بعض اعلیٰ قسموں میں تھے، اچھے قسم کے سوتی کپڑوں کی پیدائش میں اضافہ اور مختلف قصبوں میں زائد تخصیص، بالخصوص صوبۂ مدراس میں انھی قوتوں کا نتیجہ تھی جنھوں نے سارے ہندوستان کو اعلیٰ قسم کے کپڑوں کے بازار میں تبدیل کر دیا صنعت کی پیداواروں کی وسیع طلب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی پیدا کنندے اور صارف کے درمیان براہ راست تعلق کا خاتمہ ہو گیا، اور اس افتراق نے درمیانی آدمی کی موجودگی کو ناگزیر کر دیا۔ یہ سبب

[1] کنور جگدیش پرشاد، رسالہ، قالین بافی، صوبۂ جات متحدہ (سنہ ۱۹۰۷ء)۔

اور صناعوں کے پاس اصل کی کمی ان دونوں نے مل کر صناعوں کی خود مختاری
ختم کردی جہاں بیرونی مسابقت بہت شدید نہ تھی وہاں عام طور پر
یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے اصل دار کو مجبور کیا کہ وہ بیر لینے طریقوں کو ترک
کرکے نئے طریقوں کی ترویج کرے، تقریباً ہر جگہ اس نے صناعوں
کو اور پست کردیا اور درمیانی آدمیوں کی گرفت کو مضبوط بنا دیا۔
جہاں اصل کم مقدار میں ضروری تھا اور صارف قریب تھا
وہاں ابھی تک صناعی طریق زندہ تھا، جہاں خام مال قیمتی تھا یا
صارف بہت دور تھا، یا طلب وقتی اور غیر مستقل تھی وہاں کاریگر
کا درمیانی آدمی کے تابع ہوجانا ناگزیر تھا۔ کمہار جب تک ارزاں
قسم کے مٹی کے برتن بناتا رہا، وہ خود مختار رہا اور مقروض بھی نہ تھا
لیکن جب اس نے اینٹیں بنانا شروع کیں تو وہ قرضدار ہوگیا اس کے
بعد تغیر مکمل ہوگیا اور وہ درمیانی کاروباری آدمیوں کے لیے اینٹیں
بناتا رہا[1]۔
کام گھر یا چھوٹا کارخانہ سب کے بعد میں آتا ہے، ترقی بہت
سست تھی، لیکن بیرونی مسابقت کے دباؤ اور مشینوں کی ترویج
کی وجہ سے تنظیم کی یہ صورت اکثر اوقات لازمی ہوگئی تار اور گوٹا کناری
کی صورت یہی ہے، لیکن کارخانہ داری تنظیم اس وقت تک ناممکن
تھی جب تک طلب اچھی خاصی پائدار نہ ہو یا جب تک اس کی
بدولت محنت پس انداز کرنے کے طریقوں کا رواج ممکن نہ ہو یا
دوسری صورتوں میں مصارف پیدائش میں زائد کفایات کا امکان
نہ ہو۔
کام کے حالات اور اجرتوں کی ادائی کا طریقہ گھریلو صنعتوں میں
بہت ہی ناقابل اطمینان تھا[2]۔ ان تمام اصناف میں مزدور کو اجرت　۱۸۷

[1] ئو، حوالۂ گزشتہ باب چہارم۔
[2] پھول کاری، کشیدہ اور کار چوب کی دوسری صنعتیں جن میں غریب شرفا کے خاندانوں کی عورتیں

بہت کم دی جاتی تھی اور اس کو اپنی حالت درست کرنے کے مواقع بہت ہی کم حاصل تھے، کارخانہ داری تنظیم کے ظہور کی بدولت وہ گھر سے الگ کردیا گیا تھا اور جو کچھ بھی آزادی اس کو اپنے طریق عمل میں باقی رہ گئی تھی، وہ بھی کھو بیٹھا، لیکن دوسری طرف اس کی اجرت بڑھ گئی اور مادی حالت یقیناً بہتر ہو گئی۔ یہاں آزاد صناع اور کارخانے کے مزدوریں کوئی تقابل نہیں کیا گیا، بدقسمتی سے جس میدان میں آزاد صناع ابھی تک موجود تھا وہ بہت محدود تھا اور وہ ہندوستان کی شہری صنعت میں تیزی سے غائب ہو رہا تھا۔

یہ بہت ہی آسانی سے نظر آجاتا ہے کہ صنعتی تنظیم کے اس ارتقا میں کوئی نئی خصوصیات نہیں ہیں اور اس قسم کے عبوری دور میں دوسرے ملکوں میں بھی اسی قسم کی خصوصیات دیکھی گئی ہیں، اور اس طرح محض اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس دلیل کے جواز کی کوئی گنجایش نہیں جو اکثر پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستانی معاشی نظام اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے اور معمولی معاشی قوانین کے دائرے سے خارج ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کام کرتی تھیں وہ بہت زیادہ بیگاری ہو گئی تھیں، خصوصاً کارچوبی کاموں میں منافع اچھے خاصے تھے لیکن عجیب وغریب مروجہ حالات نے تاجر کے لیے یہ ممکن کردیا کہ وہ اقل ترین حد کی ادنیٰ اجرت ادا کرے۔

۱۸۸

باب چہاردہم

دورِ قبل از جنگ — اختتام

اب تک ہم نے ہندوستان کی قبل از جنگ معاشی تاریخ پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ زمانہ قدرتی طور پر تین ادوار پر مشتمل ہے، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے یہ ادوار ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اور وہ قوتیں جو سنہ ۱۸۶۰ء کے عشرے میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئیں ان کی فوقیت ان تمام سالوں میں برقرار رہی، ان کے نتائج بتدریج مرتب ہوئے، اور حتیٰ کہ آج تک یہ قوتیں یعنی مغرب کے معاشی نظام سے اتصال کے نتائج، ہندوستان میں واقعات کی ترتیب کا باعث ہو رہے ہیں، تین دوروں میں یہ تقسیم معاشی خصوصیات کے اختلافات کی بنا پر نہیں کی گئی بلکہ اس وجہ سے کی گئی ہے کہ وہ خوش حالی اور بدحالی کے ادوار کی بڑی اچھی طرح وضاحت کرتے ہیں۔

ان ادوار میں ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ہمیں ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۵ء تک خوشحالی کا دور ملتا ہے پھر ایک شدید قحط اس کو متاثر کر دیتا ہے، پانچ سال کی بدحالی کے بعد ترقی پھر نظر آتی ہے

اور ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۵ء تک خوش حالی کا دوسرا دور نظر آتا ہے اس کے بعد پہلے سے زیادہ قسم کے دو شدید قحط مداخلت کرتے ہیں، لیکن ۱۹۰۰ء تک ملک نے کچھ بحالی حاصل کرلی تھی اور آیندہ چودہ سال یعنی جنگ عظیم کے آغاز تک معتدل خوشحالی کا زمانہ رہا ہے، یہ ایک ہم آہنگی ہے جس کا تجارتی ادوار کی متوازی گردش سے تقابل کیا جاسکتا ہے، ہندوستان زیادہ تر ایک زرعی ملک رہا ہے اس سے یہ تسلسل تجارتی گرم و سرد بازاریوں کے بجائے اچھے موسموں اور قحط کے سالوں کے متبادل ادوار کی صورت میں نظر آتا ہے، یہ کوئی مناسب موقع نہیں کہ ہم بارش کی نوعیت اور آفتابی داغوں کے تعلق کے اعلیٰ نظری مباحث میں پڑیں، اور نہ یہاں ہم کو اس مسئلے سے بحث کرنا ہے کہ تجارتی ادوار اور فصلوں کی نوعیت میں کیا تعلق ہے بلکہ یہاں ہم صرف اتنا اشارہ کافی سمجھیں گے کہ آج بھی زراعت ہندوستان میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور مجموعی حیثیت سے ملک کی خوشحالی کے ادوار کا انحصار زرعی موسموں کی خصوصیات پر ہے۔

اس تیسری تقسیم سے ایک اور فائدہ بھی ہے، اس سے ہندوستانی صنعتی ترقی کے تین مدارج کے تعین میں امداد ملتی ہے، ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۵ء کا دور وہ زمانہ تھا جبکہ کارخانوں اور نخل بندیوں کا آغاز ہوا، لیکن ۱۸۷۵ء تک جو ترقی ہوئی وہ ناقابل لحاظ تھی، اس زمانے میں ہندوستانی دستکاریوں میں تیزی سے زوال شروع ہوا، اور یہ سلسلہ دوسرے دور میں بھی نویں عشرے کے آخر تک جاری رہا۔ کارخانے کی صنعتوں میں حقیقی ترقی کا آغاز ۱۸۸۰ء کے بعد ہوا اور آیندہ بیس سال میں پارچہ بافی کی دو صنعتوں نے ترقی کی، اور نویں عشرے کے اختتام پر سارے ملک میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا، اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اکثر معدنی صنعتیں اور بعض چھوٹی متفرق

۱۸۹

صنعتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، اور ان ہی آخری سالوں میں ہندوستان میں چھوٹی مشینوں اور معمولی کلوں کا رواج ہوا، اور میکانی آلات کو ہر جگہ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کا ایک عام رجحان نظر آنے لگا لیکن ان تمام سالوں میں ایک خصوصیت نظر آتی ہے کہ ہندوستان کی قدیم جمی ہوئی صنعتیں عام طور پر ترقی نہیں کر رہی تھیں، اور مغرب میں پیدائشی طریقوں میں سائنس کے آلات کا بڑھتا ہوا مزید استعمال ہمیشہ تیزی سے ان صنعتوں کے زوال کا باعث ہوا۔ دستکارانہ صنعتوں میں یہ عمل خصوصیت سے بہت زیادہ نمایاں ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ صورت شکر اور دباغت کی صنعتوں کے تنزل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے صرف کارخانے کی صنعتیں جو بالکل حال کی پیدا وار تھیں، ایسی صنعتیں تھیں جو کچھ ترقی کر رہی تھیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کی صنعتی حالت کیا تھی؟ یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے اور اس کے بڑے بحث طلب جوابات دیے جاتے ہیں، جب ہم اس کا جواب دینے کی کوشش کریں تو ایک چیز کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمیں صرف نئی ترقی ہی کو پیش نظر رکھنا نہیں ہے بلکہ قدیم صنعتی صورتوں کے زوال کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، کوئی قطعی جواب ناممکن ہے، ایک سرسری خاکا یہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے دیہی صنعتیں انحطاط میں تھیں، اور قصبوں میں قدیم دستکارانہ صنعتوں کی اکثریت تنزل کر چکی تھی، اور اگر بعض اہم پیشوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا تو کوئی خاص تنزل بھی نہ تھا جدید صنعتوں میں نخل بندیوں، پارچہ بافی کے کارخانوں، کوئلے کی کانوں میں لوگوں کی کافی تعداد مشغول تھی، اور بعد کے سالوں میں چھوٹی متفرق صنعتوں میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوگیا۔ لیکن اس قسم کا بیان ہماری کوئی خاص رہبری نہیں کرتا۔

کسی ملک کی صنعتی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے دو قسم کے

نمایندہ اعداد استعمال کیے جاتے ہیں۔

(الف) تجارت درآمد و برآمد میں پیدائشی سامان کا تناسب۔

(ب) اور قصبوں کی ترقی، ہندوستان کی صورت میں پہلی چیز بالکل قابل اطمینان نہیں ہے کیونکہ خارجی تجارت کا داخلی تجارت سے تناسب بہت زیادہ نہیں ہے، پھر ہندوستان کی اہم ترین صنعتیں (تعداد کے لحاظ سے) مثلاً دستی کرگھوں کی بنائی کے اعداد ان گوشواروں میں درج نہیں، مسٹر جسٹس راناڈے سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کلیے کو ہندوستانی حالات پر منطبق کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ساتویں عشرے کے وسط تک ہندوستانی مصنوعات کی حیثیت بہت زیادہ گر گئی، اور اس کے بعد سے نویں عشرے کی ابتدا تک حالت میں کچھ اصلاح ہوتی رہی۔ اور اس کی معقول حد تک تائید ان دوسرے اسباب سے ہوتی ہے جن پر ہم غور کر چکے ہیں۔ پروفیسر کالے جنھوں نے راناڈے کے طریقوں کو بعد کے زمانے میں منطبق کیا محض اس نتیجے پر پہنچے کہ نویں عشرے کے بعد سے ترقی تقریباً مسلسل ہو رہی ہے، گویا اس طریقے کو منطبق کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وسط صدی سے ساتویں عشرے تک ہندوستان کی صنعتی حالت بڑی ابتر ہو گئی (یہ ایسا واقعہ ہے جو پورے طور پر ثابت ہو چکا ہے) اور ساتویں عشرے کے بعد بحیثیت مجموعی ترقی کے آثار پیدا ہو چلے تھے، قصبوں کی ترقی کی نوعیت کا مطالعہ کرنے سے بھی اس سے زیادہ اور کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کے زوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے صرف اسی بات کی پر زور تائید ہوتی ہے کہ اس دور میں ہندوستان نے جو کچھ صنعتی ترقی کی وہ بہت ہی مختصر تھی، صنعتی مردم شماری کے اندراجات بھی اسی نتیجے پر پہنچاتے ہیں

نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی مجموعی صنعتی ترقی بہت مختصر تھی بلکہ

زراعت ہندوستان کی اولین صنعت کے اعتبار سے پہلے کی طرح اہم تھی اور ہندوستان میں آبادی کے اضافے کے ساتھ مزارعین کی تعداد علیٰ حالہ قائم تھی۔ اضافۂ آبادی خود ایک ادواری واقعہ ہے اور اس کا انحصار موسموں کی خصوصیات پر ہے، اضافے کے اعداد یہ ہیں۔

۱۸۷۲ء تا ۱۸۸۱ء	۳۰	لاکھ
۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۱ء	۲۴۳	"
۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۱ء	۴۱	"
۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء	۱۸۷	"
۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۱ء	۳۷	"

اضافۂ آبادی پر قحطوں کے اثرات بالکل واضح ہیں، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر یہ مصیبت مسلسل نہ آتی تو آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا، لیکن اس صورت میں بھی اضافۂ آبادی کا مطلب یہ تھا کہ زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے[1]۔ انحطاط پذیر دیہی صنعتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زمین پر پھینک رہی تھیں اور اس اضافے کا ایک مفید فی صد قصبوں میں ضم ہو رہا تھا، نتیجہ ظاہر ہے، حد مختتم کی تمام زمین زیر کاشت آ رہی تھی اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں تقسیم اراضی کی صورت بڑی خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی اور اس وقت ہندوستان کا سب سے اہم ترین مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کوئی راہ تلاش کرنا تھا۔ زمین پر لوگوں کی زیادتی خود زرعی ترقی کو روک دیتی ہے اور غیر معاشی کھیتوں کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ صنعتوں کی ترقی، ۱۹۱

[1] ہندوستان کی مردم شماری کی رپورٹ، ص۲ (۱۹۲۱ء)۔
[2] اس مسئلے کے مکمل مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو، پی، کے واٹل ہندوستان کا مسئلۂ آبادی۔

زرعی آبادی کے بڑے حصے کو قصبوں میں منتقل نہ کر دے۔

اب تک ہمارے دلائل مضبوط ہیں، تمام تبصرہ ان باتوں کی حمایت کرتا ہے، نئی صنعتوں کی رفتار ترقی بہت سست تھی اور پرانی دستکاریوں میں اکثر تنزل پذیر تھیں، زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ زرعی ترقی اور بالخصوص محنت پس انداز کرنے والے طریقوں میں بہت ہی خفیف اضافہ ہوا تھا۔ قابل لحاظ ترقی نہ زراعت میں ہوئی اور نہ صنعت میں بلکہ تجارت میں ہوئی۔ تجارتی طریقوں میں انقلاب ہو گیا تھا اور اندرونی اور بیرونی دونوں تجارتوں کی مقداریں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ بازار اب زیادہ وسیع اور کافی منظم ہو چکے تھے، لیکن صنعتی ترقی تجارتی انقلاب کے پہلو بہ پہلو نہ چل رہی تھی۔ جن طریقوں میں تھوڑی بہت ترقی ہوئی وہ درحقیقت کچھ عجیب نہ تھے، ان میں تقریباً وہی اصول کارفرما تھے جو بیشتر ممالک کے صنعتی ارتقا میں نظر آتے ہیں، ہندوستانی صنعتی ارتقا کی اگر کوئی خاص خصوصیت تھی تو وہ صرف اس کی سست رفتاری تھی۔

اس طرح اب تک دلائل دقیع تھے، لیکن اس کے بعد ترقی کی سست رفتاری ہندوستان کے صنعتی ساز و سامان کے چند نقائص کی طرف اشارہ کرتی ہے اور جب ان نقائص کی نوعیت کی تحقیقات کی جاتی ہے تو معاشی تاریخ کا مطالعہ ہماری بالکل مدد نہیں کرتا، بہرحال چند امور پر مختصراً روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلے سرمایے کو لے لیجئے، ہندوستان ایک بہت ہی غریب ملک مشہور ہے اور اس کے پس انداز شدہ سرمایے کی مقدار بہت ہی قلیل ہے اور اس کا ایک خاص سبب ہے، زراعت جو ہندوستان کی خاص صنعت ہے وہ سارے ملک میں چھوٹے خود کاشت زمینداروں یا پٹہ دار آسامیوں کے ذریعے سے ہوتی ہے، اس طرح گویا ہندوستان میں جائداد کی تقسیم اکثر دوسرے

۱۹۲

ملکوں کے مقابلے میں زائد یکساں ہے اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ملکی ذرائع کی مساوی یا نہ تقسیم کسی ملک میں اصل کی کثیر مقدار پیدا نہیں ہونے دیتی۔ سلی مان نے ۱۸۴۸ء میں ہندوستان کی تقسیم اراضی کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اصل کی پس اندازی اور اجتماع کو روکتی ہے جو ملک کی صنعتی ترقی کے لیے بیحد ضروری ہے[1]۔ اور اس وقت کے مقابلے میں اب تقسیم اراضی میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہو گیا تھا، یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ ملک کے بعض حصوں خصوصاً بنگال میں بہت سے مالکان زمین ایسے تھے جن کے پاس اصل کے کافی ذرائع موجود تھے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں صرف وہ مقام گجرات ہی ہے جہاں صنعت نے ہندوستانی سرمایے سے کچھ ترقی کی اور یہاں قدیم زمانے سے حوصلہ مند تاجروں کا ایک طبقہ موجود تھا جو بیرونی ملکوں سے تجارت کیا کرتا تھا، پھر ملک کے بیشتر حصوں میں، ذی حیثیت مزارعین کے پاس اصل کے کچھ ذرایع تھے اور عام طور پر انھیں اپنے روپے کا نفع بخش مصرف یہی نظر آتا تھا کہ وہ اس کو اپنی زمین پر لگا دیں یا جو زیادہ قرین قیاس تھا وہ یہ کہ اس کو ضرورت مند کاشتکاروں کو قرض دے دیا کریں۔

اس زرعی اصل کے علاوہ جو صنعتی ترقی کے لیے مہیا نہ ہو سکتا تھا ملک میں تاجروں کا ایک طبقہ تھا جنھوں نے پرانے زمانے میں تجارت کی دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے تجارتی مالیات کو حد درجہ منظم کر دیا تھا۔ ملک کے اس تجارتی اصل کے لیے صنعت کو تجارت سے مسابقت کرنا تھی، لیکن تاجر جو چیز چاہتے تھے وہ اصل کی تیزی سے واپسی تھی۔ ذرایع نقل و حمل میں ترقی کی وجہ سے

---

[1] سلی مان، حوالۂ گزشتہ جلد دوم باب ہفدہم۔

فصلوں کی منتقلی اور خصوصاً سوتی کپڑوں کی درآمدی تجارت بہت زیادہ نفع بخش ہوگئی تھی اور یہاں اصل بہت جلد واپس آجاتا تھا اس کے برخلاف پیدائشی صنعت میں منافع کا انتظار طویل عرصے تک کرنا پڑتا تھا اور واپسی ایسی یقینی نہیں تھی جیسی کہ تجارت میں تھی، اور جب کہیں سرمایہ کسی صنعتی کاروبار میں لگایا گیا تو کام ایسا ہوتا تھا جس میں رقم بہت تیزی سے واپس ہوجائے، جب ایک مرتبہ روئی اور چاول صاف کرنے والی گرنیوں کے نفع بخش ہونے کا یقین ہوگیا تو اصل تیزی سے ان صنعتوں میں مشغول ہونے لگا اور اکثر علاقوں میں بہت جلد چھوٹے کارخانے قائم ہوگئے جو مناسب طور پر پیدا شدہ خام مال سے کام لینے کے واسطے ضرورت سے زائد تھے، ذرائع اصل مختصر تھے اور ان کا بڑا حصہ بھی زراعت کے لیے مطلوب تھا، باقی ذرائع جن سے صنعتی کاموں میں استفادہ کیا جاسکتا تھا وہ صنعتی مالیے کی غیر منظم حالت کی وجہ سے فراہم نہ ہوسکتے تھے۔ ۱۹۴

چند اہم تجارتی مرکزوں کو چھوڑ کر ہندوستان میں منظم بینکاری تقریباً مفقود تھی اور جو چند بنک موجود تھے وہ بھی صنعت کی مالی امداد کی طرف توجہ کرنا اپنے لیے منافع بخش نہ سمجھتے تھے یہ بدقسمتی بھی اسی قسم کے اسباب کا نتیجہ تھی جنھوں نے ہندوستانی ریلوں کو اندرونی تجارت کے بجائے تجارت خارجہ کی طرف زیادہ متوجہ کردیا تھا، پریسیڈنسی بنک ابتدا ہی سے پیداواروں کو دیہی علاقوں سے بندرگاہوں تک منتقل کرنے میں مالی امداد کیا کرتے تھے، مبادلہ قرضے کی فصلوں کے زمانے میں ضرورت ہوتی تھی، لیکن اس خاص موسم میں روپے کی طلب کثیر ہوتی تھی اور اس کی شرح میں بہت کافی اضافہ ہوجاتا تھا۔ لہذا بنکوں نے اس طریقے کو اپنا شعار بنالیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکتا وہ اپنے ذرائع کے بڑے حصے کو

فصل کے واسطے محفوظ کرلیا کرتے تھے، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی صنعتی کاروبار کو طویل عرصے کے لیے قرض نہیں دے سکتے تھے۔ ان اسباب نے ہمیشہ بنکوں کو صنعتوں کی مالی امداد سے قاصر رکھا۔ ہندوستانی ذرایع اصل کا قلیل ہونا اور پھران کے لیے زراعت اور صنعت دونوں میں مسابقت کا ہونا، پھر روپے کے لین دین اور تجارت میں زائد منافع کا حاصل ہونا اور خصوصیت سے رقمی قرضوں کی فصل کے زمانے میں اعلیٰ شرح کا ہوجانا، ان سب اسباب نے ہندوستانی اصل کو صنعت میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہونے سے باز رکھا۔

جہاں تک اجرتوں کا تعلق ہے ہندوستان میں محنت یقیناً ارزاں ہے، ادنیٰ طبقوں کا معیار زندگی بہت ہی ادنیٰ ہے، اور ان کی ضروریات معمولی ہیں۔ بامہارت دستکاریوں اور خصوصاً ان میں جہاں پیشہ آبائی ہے محنت غیر معمولی کارگزار ہے، یہ دراصل اس کی مہارت اور اس کے معیار زندگی کا ادنیٰ پن تھا جس نے پارچہ باف کو مشین کے بنے ہوئے سامان سے مسابقت کرنے میں مدد دی، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوچکی ہے کہ اگر ہندوستانی مزدور کو موزوں تعلیم دی جائے اور اس کی مناسب نگہداشت کی جائے تو وہ بھی اتنا ہی کارگزار ہوسکتا ہے جتنا کہ کوئی دوسرا مزدور۔ اس کے برخلاف اس میں کوئی کلام نہیں کہ اگر موجودہ حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو ہندوستانی مزدور باوجود اس ادنیٰ اجرت کے جو وہ کماتا ہے یقینی طور پر غیر کارگزار ہے۔

بظاہر اس کے اسباب دو معلوم ہوتے ہیں پہلے مزدوروں کی ناخواندگی دوسرے ہندوستانی صنعت کے مروجہ حالات، ناگپور ایکسپرس ملس کے سربی، ڈی، مہتا، ہندوستانی مزدوروں کے مسائل پر جن کے ہم پایہ چند ہی مستند لوگ ہیں، نے ہندوستانی مزدور کی

۱۹۴

ناخواندگی کو سب سے بڑی دشواری قرار دیا ہے، تعلیم کے فقدان کی وجہ سے مزدور سادہ ترین میکانی طریقوں کو بھی ذہن نشین کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور جیسے ہی اس کو کسی پیچیدہ مشین پر لگا دیا جاتا ہے اس کی محنت بہت ہی زیادہ غیر کارگزار ہو جاتی ہے، تعلیم کی اس کمی کی بدولت مزدوروں میں اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا کوئی جذبہ نہیں پایا جاتا اور جب تک یہ جذبہ پیدا نہ ہو اس وقت تک محض اضافۂ اجرت کارکردگی میں اضافے کا باعث نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ مزدور کو معمول سے زیادہ تعطیلات منانے کی ترغیب دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ طویل اوقات کار خود تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہیں، لیکن اس کی خاص وجہ حکومت کی غفلت تھی جو اس کا ایک اہم ترین فرض تھا۔ بڑے شہروں میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً صفائی کے طریقوں کی کمی اور اکثر صنعتی کاروبار میں حفظانِ صحت کے قوانین سے قطعاً لاپروائی بھی ہندوستانی مزدور کی ادنیٰ کارگزاری کا ایک سبب تھیں[1]۔ طویل اوقات کے اثرات بیان کیے جا چکے ہیں۔ ادنیٰ اور ٹھٹھرا ہوا جسم، تعلیم سے قطعاً بے بہرہ دماغ ادنیٰ ترین معیارِ زندگی بسر کرنے والا ہندوستانی کارخانے کا مزدور اگر غیر کارگزار ہوتا تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی۔ اس طرح ادنیٰ اجرت ہندوستانی صنعت کے لیے فائدہ بخش چیز نہ تھی۔

گراں اصل اور غیر کارگزار محنت، ہندوستانی صنعت میں دو اہم موانعات تھے، جہاں تک ان ملکی ذرایع کا تعلق تھا جن پر صنعتی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے تو ان کی مختلف طریقوں سے کوئی کمی نہ تھی

---

[1] ہندوستانی صنعتی کمیشن کی رپورٹ، ضمیمہ، ل، صنعتی ترقی اور محنت۔ مانہ از بیجرالیف، ایبن، وائٹ۔

مثلاً خام زرعی پیداوار کے سلسلے میں ہندوستان میں اقسام اور کثیر رسد دونوں باتیں موجود تھیں بلکہ بعض چیزوں کی پیداواروں میں ہندوستان کو اجارہ حاصل تھا، لیکن بہت سے نقائص بھی تھے، مثلاً یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستانی ذرائع سے عام ناواقفیت حالیہ زمانے تک بھی قابلِ لحاظ تھی، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اب تک لوہے کے بہت سے مخزن معلوم ہو چکے ہوتے، لیکن ان کی وسعت اور تجارتی امکانات سے کوئی واقفیت نہ تھی بلکہ بعض اوقات تو ان کا صحیح مقام تک معلوم نہ تھا۔[1] ۱۹۵

کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لیے تخلیقی قوت کی ابتدائی ضروریات میں سے ایک چیز ایندھن کی رسد کی فراوانی ہے، اس کا اہم ترین ذریعہ کوئلہ ہے۔ اگرچہ کوئلے کی ہندوستان میں بہتات نہیں ہے مگر پھر بھی یہ بڑی مقدار میں موجود ہے، لیکن اس کی تمام اہم کانیں ایک چھوٹے سے رقبے میں جمع ہو گئی ہیں اور ملک کا بڑا حصہ بالخصوص صوبۂ مدراس، ان کی رسد پر کسی بڑی حد تک بھروسا نہیں کر سکتا۔ بیسویں صدی سے قبل اسی کو صنعتوں کی ترقی کی سست رفتاری کی ایک وجہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ نویں عشرے کے بعد جب ہندوستان میں ریلوں کا سلسلہ کافی پھیل گیا تب کوئلے کی صنعت ترقی کر سکی۔ کوئلے کی بار برداری کے لیے کرائے کی اعلیٰ شرح بھی قابلِ غور ہے۔ پھر صرف بنگال کا کوئلہ ہی خام مال کی دھاتوں کو صاف کرنے کے لیے نرگول کے واسطے موزوں تھا۔ پیدائشی قوت میں تیل بطور ایندھن صرف چھوٹے انجنوں میں نفع بخش

[1] یہ محض بعض گزشتہ ارضی تحقیقات کے ایک اتفاقی حوالے کا نتیجہ تھا جس کی بدولت آخر کار ٹاٹا کے لوہے اور فولاد کے کارخانے کا موقع تجویز ہوا، ملاحظہ ہو لووٹ فریزر، ہندوستان میں لوہا و فولاد۔

طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بڑی بڑی امیدیں ہندوستان میں جل بجلی کی طاقت کے آیندہ استعمال سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس کی ترقی میں سب سے بڑی دشواری موسمی بارش کی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بہت بڑے آبی ذخیروں کی تعمیر ضروری ہے۔ اراکین صنعتی کمیشن کی سفارشات پر جل بجلی کے سلسلے میں جو تحقیقات کی گئیں ان سے یہ معلوم ہوا کہ صرف مشرقی اور مغربی گھاٹوں میں برقی قوت پیدا کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ لیکن یہاں بھی کثیر سرمایے کی ضرورت ہوگی[1]۔ چنانچہ اس طرح ارزاں قوت حاصل کرنے کی دشواری بھی صنعتوں کی ترقی کی سست رفتاری کا ایک بڑا سبب قرار دی جا سکتی ہے۔

دھاتوں اور بالخصوص لوہے اور فولاد کے کاموں کی کمی بھی اتنی ہی اہم تھی، غالباً لوہے اور فولاد کی پیدائش موجودہ زمانے کی اہم ترین انفرادی صنعت ہے۔ صنعتی ترقی کا سارا دارومدار اس پر ہے اور اس کے بغیر دشواری شدید ہے، ہندوستان میں ریلیں درآمدی سامان سے تیار ہوئیں، پارچہ بافی کی صنعتوں کے لیے بھی مشینیں درآمد کرنا پڑیں، یہی صورت چھوٹے انجنوں اور رگرینوں کی تھی۔ تقریباً تمام میکانی آلات جو ملک میں مستعمل تھے حتیٰ کہ وہ سادہ زرعی آلات بھی جو نخل بندیوں میں استعمال ہوتے تھے، درآمد کیے جاتے تھے۔ اور اس نے قدرتی طور پر ملک میں کسی بڑے پیمانے پر ان چیزوں کے استعمال کو روک دیا تھا، صرف یہی نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ سے ہندوستانی صنعتوں کو دوسرے ملکوں سے مسابقت میں نقصان ہوتا تھا، فشمالر کہتے ہیں کہ صنعتی ارتقا

۱۹۷

[1] صنعتی کتابچہ، شایع کردہ، ہندوستانی مجالس ذخائر حرب — ہندوستان میں جل بجلی کی طاقت، از جے ڈبلیو میرز (۱۹۱۹ء)۔

کے ابتدائی دور میں صنعتی ترقی کا مرکز اور منتہا بہترین پارچہ بافی کی مصنوعات تھیں[1]۔ ہندوستان بلاشبہ اس معاملے میں فوقیت رکھتا تھا اور وہ اس سلسلے میں دوسرے ملکوں سے بہت قبل ترقی کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن موجودہ دور کی ترقی کا انحصار کوئلے اور لوہے پر ہے۔ کوئلے کی ترقی میں تاخیر اور اس کی بے ڈھب جائے وقوع، نیز بالکل حالیہ زمانے تک لوہے کی صنعت کے قطعی فقدان کو بڑی حد تک ہندوستان کی موجودہ صنعتوں کی کمی کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ریلوں کی جلد ترقی اور توسیع نے صنعتوں کی ترقی میں موانعات پیدا کیے، مختصراً یہ کہ انھوں نے ملک کو بیرونی مسابقت کے لیے کھول دیا اور اس طرح دیسی صنعتوں کی ترقی کو روک دیا۔ یہ محض ایک قیاسی چیز ہے اور اس کو ثابت کرنا ذرا مشکل ہے اور در اصل اس کی مثال ایسی ہوتی کہ ریلوں کی تعمیر میں تاخیر کی وجہ سے ہندوستان کی قدیم صنعتیں کچھ زیادہ عرصے زندہ رہتیں اور جدید صنعت کی ترقی اور بھی سست ہوجاتی در اصل ریلوں کی توسیع کے بجائے ریلوں کی حکمت عملی کو موردِ الزام قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ گزشتہ باب میں بتایا جاچکا ہے انھوں نے صنعتی ترقی کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی کہ ان سے توقع تھی۔

چند اور اسباب بھی ہیں، ان میں سے ایک سبب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سہولتوں کا فقدان ہے، اس وجہ سے ہندوستان کو بیرونی ماہرین پر منحصر ہونا پڑتا ہے، اکثر و بیشتر ممالک میں صنعتیں بدیسی ماہرین کی نگرانی ہی میں شروع ہوئیں،

[1] گستاوو، شمالر، طریق تجاریت، ترجمہ ڈبلیو جے، اشلے (۱۸۹۶ء)۔

لیکن ہندوستان کے معاملے میں یہ خصوصیت تھی اور اس کی بڑی وجہ اس کی مخصوص سیاسی حیثیت تھی کہ کچھ عرصے کے بعد یہ بدیسی ماہرین ملکی ماہروں میں تبدیل نہیں کیے گئے اور ہوشیاری سے ان کی درآمد کا سلسلہ برابر جاری رہا دوسرا سبب حکومت کا صنعتی ترقی سے لاپروائی اختیار کرنا تھا۔ حکومت بیسویں صدی کے آغاز تک عدم مداخلت کے اصول پر کاربند رہی آغاز صدی سے بعض صوبجاتی حکومتوں نے اس معاملے میں دلچسپی لینا شروع کی لیکن مدراس کے محکمۂ صنعت و حرفت کی کوششوں پر لارڈ مارلے کی نامنظوری سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ عدم مداخلت بڑی سخت جان ہے۔

۱۹۷

جب ان تمام موانعات کو پیش نظر رکھا جائے تو اُس طریقے کی سست رفتاری بخوبی واضح ہو جاتی ہے، ہندوستان صرف ان ہی صنعتوں میں ترقی کر سکتا تھا جن میں اصل، محنت اور قدرتی ذرائع کے نقصانات کو متوازن کرنے کی کافی صلاحیت ہو۔ محض اس علاقے کی قربت نے جہاں دنیا میں سب سے زیادہ جوٹ کی کاشت ہوتی تھی، جوٹ کی صنعت کو موافق ترین صورت حال عطا کر دی۔ پھر یہ ایک یوروپی صنعت تھی اور یوروپی صنعتیں ہندوستانی صنعتوں کی طرح اصل کی محتاج نہ تھیں، ہندوستان کو ادنیٰ قسم کے سوتی کپڑوں کی پیدائش میں بڑا فائدہ تھا، ہندوستان کی چھوٹے ریشے والی روئی موٹی قسم کا سوت پیدا کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں تھی، پھر ملکی بازار وسیع تھا اور اس میں وسعت کی کافی گنجائش تھی۔

بازاروں کا مسئلہ بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا، ہندوستانی صنعت کا انحصار زیادہ تر بیرونی بازاروں پر تھا۔ لیکن اس سلسلے میں وسعت کا میدان محدود تھا، دوسرے ملکوں میں، کارخانے کی

صنعت کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا، جوٹ کی طرح صرف چند ہی
ایسی ہندوستانی صنعتیں تھیں جن کی بیرونی طلب پائدار رہی لیکن
جیسا کہ چین کی سوتی تجارت کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، ہندوستان
کو آیندہ زیادہ سے زیادہ ملکی طلب پر بھروسا کرنا تھا۔ ملکی طلب
کے مسئلے کی ترقی کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ صنعتی ترقی میں
دو چیزیں بہت ضروری ہیں وہ یہ ہیں کہ اول تو ملک میں درآمد
ہونے والی مصنوعات کو میدان سے ہٹایا جائے اور دوسرے
دیہی صناعوں کی سربراہی کرنے والے بازار پر قبضہ کیا جائے۔ محض
یہ واقعہ کہ ایک ملک کچھ مصنوعات درآمد کرتا ہے اس سے
کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس ملک میں ان صنعتوں کی ترقی کا
کوئی امکان ہے، لیکن چند صنعتوں میں ہندوستان بیرونی مصنوعات
کو نکال کر اچھی خاصی ترقی کر سکتا تھا۔ دیہی بازاروں پر قبضہ کرنے
کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی، پہلے تو دیہی آبادی کے معیار زندگی
میں اضافہ ہونا ضروری تھا دوسرے کارخانہ دار ارزاں قسم کا مال
پیدا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور صنعتی ترقی کا ایک تیسرا امکان
یہ تھا کہ زرعی پیداواروں کو برآمد کرنے سے پہلے ان پر کچھ مزید
کام کیا جائے۔

۱۹۸

سب سے آخر میں ہم یہ بتائیں گے کہ صنعتی ترقی حقیقی اور ہر جہتی
ہو، اور وہ زراعت کی ترقی کے دوش بدوش چلنے والی ہو۔ سر تھامس
ہالینڈ نے ایک دوسرے سلسلے میں موجودہ صنعت کی ضمنی پیداواروں
کی قدر و قیمت کو ظاہر کیا ہے، ہندوستان میں تیل اور آٹا پیسنے
کی صنعتوں میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ملک میں کھلی
اور بھوسی کا موزوں بازار نہ تھا۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی میں جو مختلف موانعات حائل تھے
وہ بتدریج کم ہوتے جا رہے تھے حال ہی میں ایک صنعتی بنک قایم کیا گیا

لازمی ابتدائی تعلیم کی ترویج اور مزدوروں کی بہتر تربیت کی تجاویز بھی زیرِ غور ہیں۔ صفائی اور رہائش کے مسائل پر بھی سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے، اب ہندوستانی ذرایع کی واقفیت عام ہو چکی ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں میں صنعتی مشاغل میں حصہ لینے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے، ریلوں کی حکمت عملی میں ایک نمایاں تبدیلی ہونے والی ہے اور حکومت کا طرزِ عمل بھی اب قطعی طور پر ہمدردانہ ہے۔ یہ تمام چیزیں صنعتی ترقی کے پائدار مستقبل کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں بہت زیادہ رجائی نہ ہونا چاہیئے، اگرچہ ہندوستان نے گزشتہ دو عشروں میں اپنے ذرایع اصل کو کافی ترقی دے لی ہے مگر وہ اب بھی ایک غریب ہی ملک ہے۔ عوام ابھی تک جاہل ہیں۔ اور ایک وسیع ملک کے مزدوروں کے بڑے طبقے کی تربیت کے لیے کافی وقت درکار ہوگا۔ قوت کا مسئلہ ابھی تک قابلِ اطمینان طریقے پر حل نہیں ہوا ہے۔ لوہے کی صنعت ابھی بہت مختصر ہے اور وہ ابھی تک صرف سادہ اور معمولی قسم کی چیزیں تیار کر رہی ہے۔

ہر بات اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ ہندوستان صنعتی ارتقا کے ایک مستحکم دور میں داخل ہو گیا ہے، لیکن مستقبل قریب میں اس کی رفتار لازمی طور پر سست رہے گی، اسی کے ساتھ اپنے صنعتی ارتقا کی تاخیر سے کوئی خاص استفادہ نہیں کر رہا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں کہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہمارے یہاں صنعتی ارتقا کے ابتدائی دور میں قانون کارخانہ کا نفاذ ہو گیا، لیکن یہ ان تمام خرابیوں کو نہ روک سکا اور نہ روک سکتا تھا جو کارخانے کا ایک لازمی نتیجہ سمجھی جاتی ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی رپورٹ مردم شماری بتلاتی ہے کہ بمبئی لندن سے بھی زیادہ گنجان ہے اور کراچی بمبئی سے بھی آگے ہے۔ عام طور پر اس صدی کے ابتدائی عشرے

میں کارخانوں کے مزدوروں کی حالت اتنی ہی ابتر تھی جتنی کہ ہو سکتی تھی اور تنظیم کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کا استحصال بہت آسان ہو گیا تھا۔ اور جب ہم دستی پارچہ بافوں کی زبوں حالی دیکھتے ہیں تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم ہندوستانی جلاہوں کا حال انیسویں صدی کے اخیر میں پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی کے آغاز پر انگلستان کے جلاہوں کا حال ہے مختصر یہ کہ ان ابتدائی مدارج میں جن سے ہندوستان گزرا، ہندوستانی باشندوں کو بھی وہی تکالیف برداشت کرنا پڑیں جو دوسرے ملکوں کے لوگوں کو اس کے مماثل دور میں برداشت کرنا پڑی تھیں، مگر دوسرے ملکوں کی مثال ہماری کچھ زیادہ مدد، محض اس وجہ سے نہیں کرتی کہ وہاں بھی صنعتی ترقی کے اس جدید پہلو کی گوناگوں خرابیوں کا کوئی بنیادی علاج نظر نہیں آتا۔

۱۹۹

جنگ اور مابعد

موجودہ باب کا موضوع بحث دور ہندوستان کے لیے قابل لحاظ معاشی حیثیت رکھتا ہے، جنگ شروع ہوجانے کی وجہ سے بعض صنعتوں کے لیے بہت ہی موافق صورت حال پیدا ہوگئی اور اس زمانے میں اور خصوصاً التوائے جنگ کے دوسرے ہی سال جبکہ غیر معمولی امید افزا حالات کی لہر دوڑ رہی تھی بہت سے نئے کاروبار قایم ہوئے، اس کے بعد ایک شدید سرد بازاری ہوئی جس میں معاشی جدوجہد کی کمی ہوگئی اور اس کے بعد ایک دوسری بڑی کساد بازاری پیدا ہوگئی جس کی مثال کئی گزشتہ عشروں میں نہیں ملتی، اس دور میں نظام حکومت اور حکومت کی معاشی حکمت عملی میں بھی بڑے تغیرات ہوئے، اس دور میں زر میں تغیر، بحالی اور پھر دوسرا تغیر واقع ہوا۔ اور مجموعی تغیرات مبادلہ نے کارخانہ دار اور مزارعین دونوں کو کافی متاثر کیا۔

فصل اول

مزارعین

ملک کی زرعی معاشیات یا مزارعین کی معاشی حالت میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوا، اگرچہ آخر الذکر کو کافی تغیرات سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد کے دوسرے سال اچھے خاصے سازگار تھے، بارش کا اوسط جنگ کے تمام سالوں میں متوسط رہا۔ اس کے بعد ۱۹-۱۹۱۸ء کے سال میں سارے ہندوستان میں فصلیں تباہ ہو گئیں۔ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جو بارش کی قلت سے پورے یا جزوی طور پر متاثر نہ ہوا ہو، خصوصیت سے بارش صوبۂ بمبئی صوبجات متحدہ اور پنجاب میں بہت کم تھی، صوبجات متوسط، بہار اور اڑیسہ کے اکثر حصوں کو قحط زدہ قرار دیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ میسور اور حیدرآباد میں بھی زرعی بدحالی پھیل گئی۔ پچھلے سال چاول اور گیہوں کے لیے موافق تھے لیکن ۱۹-۱۹۱۸ء میں باجرے کے سلسلے میں بڑی دشواری ہو گئی کیونکہ اس کی پچھلی فصل خراب ہو گئی تھی ۱۹-۱۹۱۸ء کا قحط ہندوستان کے بڑے قحطوں میں تھا اور اس کا تقابل ۷۸-۱۸۷۷ء یا ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء سے کیا جا سکتا ہے۔ بدحالی اس قدر مکمل تھی کہ وسط سال (۱۹۱۹ء) میں اس بات کے خطرات پیدا ہو گئے تھے کہ غلے کے ذخیرے آیندہ کے واسطے کافی نہ ہوں گے۔[1] اس سال

۲۰۱

---

[1] ہندوستان ۱۹۱۹ء میں۔

ایک مرتبہ تو امداد کنندگان کی بیشترین تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی جو سنہ ۱۹۰۰ء کے بیشترین اعداد کے مقابلے میں دسواں حصہ تھی، یہ بڑی حد تک ابتدائی سالوں کے سازگار حالات کا نتیجہ تھی۔

برطانوی ہند کا زرعی رقبہ (ہزار ایکروں میں)

	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء	سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء
افتادہ زمین	۴۵،۴۹۳	۵۲،۱۳۸	۴۹،۶۲۰	۴۹،۶۹۸	۴۹،۴۱۷
کل رقبۂ مزروعہ	۲،۲۹،۶۲۰	۲،۲۲،۸۲۵	۲،۲۲،۴۰۵	۲،۲۶،۰۱۲	۲،۲۸،۱۶۱
سیراب ہونے والا رقبہ	۴۸،۰۰۴	۴۸،۹۶۳	۴۴،۹۲۵	۴۷،۷۸۵	۵۱،۰۱۰
چاول	۸۰،۹۸۸	۷۸،۷۰۹	۷۷،۲۰۱	۷۸،۵۰۲	۷۹،۴۲۴
گیہوں	۲۵،۰۴۴	۲۳،۵۳۰	۲۴،۲۹۴	۲۴،۱۸۱	۲۴،۷۳۱
جوار	۲۱،۸۹۲	۲۲،۴۸۸	۲۱،۱۳۸	۲۱،۱۲۱	۲۳،۲۴۱
باجرہ	۱۵،۲۲۸	۱۴،۵۸۲	۱۳،۶۷۵	۱۳،۸۰۱	۱۳،۲۹۱
کل اشیائے خوردنی کا رقبہ	۲،۰۰،۷۷۳	۱،۹۹،۶۶۷	۱،۹۷،۰۰۰	۱،۹۷،۲۱۹	۲،۰۰،۰۱۸
شکر	۲،۶۱۴	۲،۸۱۳	۳،۰۴۵	۳،۰۴۱	۲،۵۸۳
روغنی تخم	۱۴،۶۳۵	۱۲،۵۷۱	۱۴،۲۵۵	۱۴،۹۹۹	۱۶،۳۳۰
کپاس	۱۳،۸۳۷	۱۵،۳۱۸	۱۵،۳۸۲	۱۵،۶۸۷	۱۶،۱۴۱
جوٹ	۲،۶۷۱	۲،۸۰۰	۲،۳۲۹	۳،۶۱۰	۲،۲۶۸
چائے	۶۰۳	۷۰۲	۷۱۳	۷۳۸	۷۶۶
تمباکو	۱،۰۴۱	۱،۱۰۱	۱،۰۲۶	۱،۰۵۵	۱،۱۷۲
چارے کی فصلیں	۸،۱۷۳	۸،۲۰۶	۸،۷۶۴	۸،۹۴۰	۹،۳۸۱

سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء اور سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء کے سال خاص طور پر چاول اور گیہوں کے لیے اچھے تھے اور ان سالوں میں اشیائے خوردنی کی برآمد بہت ہی کم رہی۔ پھر اشیائے خوردنی کی رسد پر نگرانی کے واسطے سرکاری ادارہ

قائم تھا، اور بارش کی قلت سے جو صورت پیدا ہوئی اس نے فوراً ہی اس کا تدارک شروع کر دیا۔ حکومت نے جنگ کے آخری سالوں میں اتحادی ملکوں کو جانے والے غلوں اور دوسری چیزوں کی برآمد کو منظم کر دیا تھا اور یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ ۱۹۱۸ء کی بارش کے بعد التوائے جنگ کی قربت کی وجہ سے اتحادی ملکوں کو جانے والی اشیائے خوردنی کی کثیر مقداروں میں کمی شروع ہو گئی۔ نومبر ۱۹۱۸ء کے بعد حکومت نے صرف ان ملکوں کو غلہ بھیجنے کی اجازت دی جہاں ہندوستانیوں کی کثیر آبادی تھی اور جو اپنی اشیائے خوردنی کے سلسلے میں ہندوستان ہی پر بھروسا کرنے کے عادی تھے مثلاً لنکا اور آبنائی نو آبادیات، اندرونی نگرانی میں کافی سختی برتی گئی اور صوبہ واری زاید پیداواروں کی متناسب تقسیم کا انتظام کیا گیا، نظام برآمد اور قیمتوں کی نگرانی کے سلسلے کو برما تک پھیلا دیا گیا اور برما کے چاول کی بڑی مقدار ہندوستان میں درآمد کرنے کے لیے فراہم ہو گئی۔ گیہوں مہیا کرنے والے شاہی کمیشن کے ذریعے آسٹریلیا سے دو لاکھ ٹن مزید گیہوں منگوا کر ہندوستانی غلے کی رسد کو اور زیادہ تقویت پہنچائی گئی۔ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں غلے والوں اور آٹے کی جتنی درآمد ہوئی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ قحط کی امداد کرنے والی حکومتی مشین متعدد سابقہ تجربوں سے بہت زیادہ منظم اور ترقی یافتہ صورت اختیار کر چکی تھی اور اشیائے خوردنی کی نگرانی اور ذرائع نقل و حمل کی سہولتوں کی بنا پر ۱۹-۱۹۱۸ء میں اس کام میں اور زیادہ آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سے ہندوستانی ریلوں کا نظام بھی کافی ترقی کر چکا تھا، اس لیے غلے کی رسد بہت زیادہ نقل پذیر ہو گئی تھی[1]۔ اکثر اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ۱۹-۱۹۱۸ء کے قحط کے

[1] ہندوستانی ریلوے کمیٹی کے روبرو خان بہادر دلال نے اپنی شہادت میں بتایا کہ

مقابلے نے ثابت کر دیا کہ سنہ ۱۹۰۰ء کے مقابلے میں اب لوگوں کی معاشی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن یہ نتیجہ لازمی طور پر صحیح نہیں تھا۔ نقل و حمل کی بہتر سہولتیں، اشیائے خوردنی کی خانگی تجارت پر سختی سے نگرانی اور مالگزاری میں التوا اور معافیوں کا نسبتہً بہتر طریقہ، اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے مزید براں یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ سنہ ۱۹۰۰-۹۹ء سے تقابل مناسب نہیں سنہ ۱۹۰۰ء میں امداد کنندگان کی تعداد اس وجہ سے بہت زائد تھی کہ امدادی کاموں میں فیاضی سے کام لیا جا رہا تھا[1] اور سنہ ۱۹۰۰ء میں لوگوں کی معاشی حالت گزشتہ خراب فصلوں کے تسلسل کی وجہ سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ آخر الذکر سبب کسی قدر اہم ہے اس کا سبق سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء کے قحط سے ملتا ہے سنہ ۱۹۱۹ء میں امداد پانے والوں کی تعداد میں وسط سال کے بعد اضافہ نہیں ہوا کیونکہ اس سال سارے ہندوستان میں اچھی بارش ہوئی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں بارش پھر ملک کے اکثر حصوں میں قلیل رہی صوبۂ بمبئی اور صوبجات متوسط کے اکثر اضلاع قحط زدہ علاقے قرار دیے گئے۔ ریاست حیدرآباد اور مدراس کے دکنی اضلاع میں مصیبت زیادہ شدید تھی۔ پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں بارش کے جلد ختم ہو جانے سے خزاں کی فصلیں نہ بوئی جا سکیں، اور سنہ ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں خصوصیت سے پنجاب میں گیہوں کی فصلیں بہت خراب رہیں، چنانچہ گیہوں کی اوسط پیداوار میں ۲۵ فی صدی کے قریب کمی کا اندازہ کیا گیا، گیہوں کی قیمت بہت بڑھ گئی اور حکومت نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ بروچ جمبوسر ریلوے، جس کا اجرا سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں ہوا، کی عدم موجودگی کی وجہ سے سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء کے قحط میں مویشیوں اور انسانوں کی ہلاکت ضلع میں بہت ہی خوفناک ہو جانے والی تھی۔

[1] سابقہ ضمیمہ ۹۱۔

مناسب سمجھا کہ وہ گیہوں کی برآمد پر پابندی عائد کر دے اور ہندوستان میں بدیسی گیہوں کی درآمد کی ہمت افزائی کرے، چنانچہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں غلے اور دالوں کی جو مقدار درآمد ہوئی وہ ۱۹۱۹ء کے اعداد سے بھی بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ ۲۱-۱۹۲۰ء کا قحط ۱۹۱۹ء کے مقابلے میں زائد وسیع رقبے پر پھیلا ہوا نہ تھا، لیکن اس کے اثرات زیادہ محسوس کیے گئے، اس سال امدادی ذرائع تلاش کرنے والوں کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں تقریباً ایک لاکھ آدمی امدادی کاموں میں مشغول تھے اور جولائی ۱۹۲۱ء میں ان کی تعداد ۵ء۴ لاکھ ہو گئی۔ اور اکثر مقامات پر ۱۹۲۱ء کے اختتام تک امدادی کاموں کو جاری رکھنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے بحیثیت مجموعی موسم سازگار رہے اگرچہ ملک کے اکثر حصوں میں بارش کی مقامی قلت رہی اور ملک کے بعض حصوں یعنی بنگال، مالابار، سندھ اور گجرات نے سیلابوں کی وجہ سے بعض سالوں میں کافی نقصان اٹھایا۔

جنگ کے سالوں میں ساری دنیا کے ساتھ ہندوستان بھی قیمتوں کے اضافے کے رجحان میں شریک رہا۔ قیمتوں میں اضافے کا یہ رجحان جنگ چھڑنے کے فوراً ہی بعد شروع ہو گیا۔ لیکن اضافے کا تناسب مختلف اشیا میں بہت مختلف تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک کے سال جو عام طور پر سازگار رہے تھے نیز حکومت کی نگرانی نے قیمتوں میں اضافہ نہ ہونے دیا حالانکہ اکثر درآمد ہونے والی اشیا جو عام ضروریات میں استعمال ہوتی تھیں مثلاً مٹی کا تیل، کپڑا، اور نمک، ان کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مصیبت بھی بڑھ گئی۔ اور ۱۹۱۷ء اور اس کے بعد کے سالوں میں اکثر مقامات پر بازار لوٹ لیے گئے (یہ صورت کپڑے کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جانے کی

وجہ سے پیدا ہوئی اور ایک وقت تو صورت حال ایسی نازک ہو گئی کہ حکومت ارزاں معیاری کپڑے کی پیدائش اور تقسیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئی، لیکن عملی حیثیت سے یہ تجویز ناکام رہی) بہرحال عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب اشیائے برآمد و درآمد کی قیمتوں میں عدم توازن پیدا ہو گیا تھا۔ قیمتوں کی تفصیلات میں جانا کچھ ضروری نہیں، لیکن بمبئی اور کلکتے کے نمایندہ اعداد کو بنیاد قرار دیتے ہوئے عمومیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے روئی کے تمام زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں، دوسری اشیا اور خصوصاً اشیائے برآمد کی قیمتوں کے مقابلے میں اضافہ کم ہوا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء اور ۲۱-۱۹۲۰ء کی خراب فصلوں کی وجہ سے زرعی پیداواروں کی قیمتیں کچھ بڑھیں، لیکن زیادہ تر اشیائے برآمد اور خصوصاً روئی کی مصنوعات، شکر اور دھاتوں میں اضافہ ۲۱-۱۹۲۰ء تک قایم رہا۔ بعد کے چند سالوں میں اس زمرے میں کمی ہوتی رہی۔ زرعی پیداوار بالخصوص اناج اور دالوں میں ۱۹۲۳ء کے بعد کچھ تھوڑا سا اضافہ ہوا، حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں مختلف اقسام میں یکسانیت ہو گئی، لیکن اب ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں قیمتیں زیادہ تھیں، لیکن تناسب ان میں پچھلا ہی سا برقرار تھا۔ ۱۹۲۶ء کے چند سال بعد ہندوستان میں قیمتوں میں تخفیف کا عام رجحان رہا اس کی وجہ اول تو حکومت کی مبادلات کی حکمت عملی تھی اور بعد میں عالمی رجحانات کا اثر پڑا۔ ۱۹۲۹ء کے آخر میں کساد بازاری بہت نمایاں ہو گئی اور قیمتیں تیزی سے گرنے لگیں۔ اور یہ رجحان ستمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہا جب ہندوستان کے معیار طلا کو ترک کر دینے کی وجہ سے یہ چیز کچھ قایم ہو گئی[1] اس کے بعد اگرچہ قیمتوں میں پہلے کی طرح تیزی

[1] دراصل ۱۹۳۱ء میں انگلستان نے معیار طلا کو خیرباد کہا، اور اس کی وجہ سے ہندوستان

سے تخفیف نہیں ہوئی لیکن سلسلہ جاری رہا۔ اور اس میں قطعی طور پر رکاوٹ کی کوئی علامت بھی نظر نہ آتی تھی۔ مزید براں اس کساد بازاری کی وجہ سے درآمد و برآمد کی چیزوں میں پھر ویسا ہی اختلاف پیدا ہو گیا جیسا کہ جنگ کے بعد والی سرد بازاری میں ہوا تھا جبکہ زرعی پیداواروں کی قیمتیں ایک دم گرنے لگیں، لیکن اس کے اثرات پیدائشی سامان میں کم محسوس کیے گئے، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزارعین پر زائد دباؤ پڑنے لگا، ہندوستان کی درآمد و برآمد کی خاص اشیا کے مندرجۂ ذیل اشاری اعداد سے اس اختلاف کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء[له]
درآمد	۱۰۰	۲۰۶	۲۳۷	۱۴۸	۱۳۳	۱۲۸
برآمد	۱۰۰	۱۵۸	۱۴۰	۱۳۲	۱۲۷	۱۱۸

۲۰۵

یہ دلیل بلا کسی شک وشبہے کے پیش کی جا سکتی ہے کہ سوائے روئی کے علاقوں کے مزارعین کی اکثریت کی معاشی حالت جنگ کے سالوں میں نسبتاً بہت خراب ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے قحطوں سے اس کو مزید تقویت ہوئی اور پھر انفلوئنزا نے حالات اور بدتر کر دیے سنہ ۱۹۲۱-۲۳ء کے زمانے میں مزارعین نے اپنی حالت کچھ سنبھالنا شروع کی تھی کہ حالیہ کساد بازاری نے ان کو اور زیادہ

بقیہ حاشیہ گزشتہ۔ کے معیار مبادلہ طلا کا خاتمہ ہوگیا، اور ہندوستانی روپے کا طلا سے جو بالواسطہ تعلق تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔ معیشت ہند، جتھیار دبیری جلد دوم صفحہ ۳۸۵ (مترجم)۔

له مجلس بین الاقوام۔ زرعی بحران۔ (سنہ ۱۹۳۱ء) جلد اول صفحہ ۱۹۴، کلکتے کے اشاری اعداد کے لحاظ سے ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں جون سنہ ۱۹۳۲ء میں اشیائے برآمد میں ۵۰ فی صد اور اشیائے درآمد

مصیبت میں مبتلا کر دیا، اس کی وجہ سے مجموعی حیثیت سے زراعت غیر منافع بخش ہوگئی اور مادی نقطۂ نظر سے مزارعین کی مالی ذمہ داریوں کا حقیقی بار بڑھ گیا۔ اور اس نے عام کاشتکاروں کو قطعی طور پر بے یار و مددگار کر دیا۔

اس کے بعد ہم رقبۂ کاشت کے اعداد پر غور کریں گے۔[1] ان کی عام خصوصیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کل رقبۂ کاشت میں تھوڑے سے اضافے کا رجحان نظر آتا ہے اور اشیائے خوردنی کی فوقیت اب بھی پہلے کی طرح برقرار ہے۔ اگرچہ آخرالذکر میں سال بسال کچھ تغیرات ہوتے رہے لیکن ان کی حدود بہت ہی محدود تھیں بیسویں صدی کے ابتدائی چودہ سالوں میں یہ رقبہ کل رقبۂ کاشت کے ۸۸ اور ۹۲ فی صدی کے درمیان متغیر ہوتا رہا۔ آیندہ پندرہ سالوں میں بھی تغیرات تقریباً اسی حد میں ہوتے رہے لیکن اشیائے خوردنی کی برآمدی تجارت میں جو تغیرات حال میں ہوئے اس کا ذکر گزشتہ باب میں ہندوستان سے غلوں کی برآمد کی نوعیت کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔[2] جیسا کہ بتایا جا چکا ہے برآمد ہونے والے غلوں میں گیہوں اور چاول ہی اہم تھے، چاول کی برآمد میں، خاص ہندوستان کی برآمد کئی سال سے بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ جنگ سے قبل بھی اس کا بڑا حصہ برماہی برآمد کیا کرتا تھا، جنگ سے پہلے کے پانچ سالوں میں ہندوستان سے برآمد ہونے والے چاول کا اوسط ۲،۳۹۸ ہزار ٹن تھا جس میں سے ۱،۸۱۴ ہزار ٹن برما سے برآمد ہوتا تھا، جنگ کے زمانے میں

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ میں ۲۲ فی صدی تخفیف ہوگئی۔

[1] فصل کے آغاز پر جدول ملاحظہ ہو۔

[2] دیکھئے ص۹۵ (انگریزی متن)۔

برآمد کا سالانہ مجموعی اوسط ۶۸۵،۱ ہزار ٹن تھا جس میں سے ۲۷۱،۱ ہزار ٹن برما کا حصہ تھا۔ اگرچہ حالیہ سالوں میں چاول کی مجموعی برآمد میں کوئی زیادہ تخفیف نہیں ہوئی لیکن ہندوستان کی برآمد کا تناسب گھٹ گیا، اور برما کا تناسب بڑھ گیا۔ اور اس زمانے میں ہندوستان کو اپنے چاول کی فصل کی ذرا سی خرابی کی صورت میں بھی برما کے چاول ہی بھروسا کرنا پڑتا تھا۔

زیرِ تبصرہ دور میں ہندوستان کی تجارتِ خارجہ میں سب سے زیادہ اہم تبدیلیوں میں سے ایک گیہوں کی برآمد میں تخفیف تھی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں گیہوں کا صرف بڑھ گیا اور برآمدی ماحصل میں کافی کمی ہو گئی تھی۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان ہندوستان گیہوں برآمد کرنے والے ملک کی حیثیت سے اہمیت رکھتا تھا اور ہندوستان کی مجموعی پیداوار[1] کا بڑا تناسب برآمد کیا جاتا تھا لیکن آخری دس سالوں میں برآمد بہت ہی کم رہی، یہ اندازہ لگایا گیا کہ اوسط فصلوں کے زمانے میں ہندوستان صرف اتنا ہی گیہوں پیدا کرتا تھا جو اس کی ملکی ضروریات کے واسطے کافی ہو[2]: مخالف سالوں میں حقیقی طور پر خالص درآمد کرنا پڑتی تھی اور صرف اچھی فصلوں کے زمانے میں برآمد کے لیے کچھ ماحصل بچ رہتا تھا، لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں گیہوں کی طلب بڑی تغیر پذیر ہے اور زیادہ تر مال جہازوں پر اسی وقت چڑھایا جاتا تھا جبکہ فصلیں اچھی ہوں اور ساتھ ہی گیہوں کی عالمی قیمت میں بھی اضافہ

۲۰۶

---

[1] ۳۱-۱۹۳۰ء اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں یہ تناسب کل پیداوار کا علی الترتیب ۰۸ اور ۰۹ فی صدی تھا۔

[2] ہندوستان گیہوں پیدا کرنے اور برآمد کرنے والے ملک کی حیثیت سے جانسٹن

ہوجائے، ۲۵-۱۹۲۴ء میں برآمد غیر معمولی طور پر زائد رہی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں فصل اچھی ہوئی اور بڑے ذخیرے موجود تھے اور عالمی فصل کی پیداوار میں کمی کی توقع تھی جس کے معنی قیمتوں میں اضافہ تھا، مگر اس کے بعد سے برآمد کی مقدار بہت کم رہی بلکہ ۲۹-۱۹۲۸ء، ۳۰-۱۹۲۹ء اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں تو ہندوستان کو گیہوں کی خالص درآمد کرنا پڑی باوجودیکہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں گیہوں کی فصل اچھی تھی لیکن پھر بھی بہت کم گیہوں برآمد ہوا اور اس کی وجہ بین الاقوامی طلب کی کمی اور بیرونی گیہوں کی مسابقت تھی[۱]۔ کساد بازاری کی شدت کی وجہ سے خود ہندوستانی بازار کو آسٹریلیا کے برآمدی گیہوں سے اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اور حکومت ہندوستانی گیہوں کا تحفظ کرنے پر مجبور ہوئی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۱ء میں درآمد پر ۴۰ روپے فی ٹن کے حساب سے محصول عائد کیا گیا۔ اس وقت اشیائے خوردنی کے معاملے میں ہندوستان کی حالت ۱۴-۱۹۱۳ء کے مقابلے میں کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے، ہمارے کل رقبۂ کاشت کا تقریباً $\frac{9}{10}$ حصہ اشیائے خوردنی کے تحت ہے اور یہ سارا رقبہ ملک کی آبادی کے واسطے غلہ پیدا کرنے کے لیے وقف ہے، ہم کو غیر موافق سالوں میں چاول کی رسد کے لیے برما پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کرنا پڑتا ہے اور ہمارے پاس گیہوں کی برآمد کے لیے کوئی حقیقی ماحصل موجود نہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کیلیفورنیا، باب نہم (۱۹۲۶ء)۔

[۱] گیہوں کی برآمد (ہزار ٹن میں)۔

بعد از جنگ کا اوسط	۱ د ۳۰۸	۳۱-۱۹۳۰ء	۱۹۷
۲۵-۱۹۲۴ء	۱ د ۱۱۲	۳۲-۱۹۳۱ء	۲۰
۳۰-۱۹۲۹ء	۲۱		

۲۰۷

اشیائے خوردنی کی انفرادی فصلوں میں بھی مشکل سے کوئی فرق ہوا تھا البتہ صنعتی فصلوں میں تغیرات بہت زیادہ نمایاں تھے اشیائے خوردنی کے بعد روغنی تخم اور روئی کے رقبے زیادہ اہم ہیں اور ان دونوں میں سال بسال بڑے تغیرات ہوتے رہے' روغنی بیجوں کی خاص قسمیں السی' تل' سرسوں' رائی اور مونگ پھلی ہیں۔ روغنی بیج زیادہ تر برآمد کیے جاتے ہیں' سنہ ۱۹۰۹ء-۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء کے پانچ سالوں میں ملک کی کل پیداوار کے لحاظ سے برآمد کا تخمینہ السی میں ۷۷' تل میں ۲۵' سرسوں ورائی میں ۲۳ اور مونگ پھلی میں ۳۸ فی صدی لگایا گیا تھا[1]۔ لہذا یہ بات لازمی تھی کہ روغنی تخم کے رقبوں میں جو تغیرات ہوتے تھے وہ بڑی حد تک برآمدی طلب سے متاثر ہوا کرتے تھے' جنگ کی وجہ سے جو بعض قوتیں کار فرما تھیں ان کی وجہ سے روغنی بیجوں کی خارجی تجارت میں قابل لحاظ تغیر ہوا' جنگ نے روغنی بیجوں کی تجارت کو بڑی جلدی متاثر کیا' پہلے تو کرایوں میں اضافے کی وجہ سے برآمد میں تخفیف ہوگئی اور دوسرے طلب کی تخفیف کا بھی یہی نتیجہ ہوا' قبل از جنگ روغنی تخم خاص طور پر یورپ کے ملکوں کو برآمد کیے جاتے تھے۔ جن میں اہم جرمنی' بلجیم' فرانس اور اطالیہ تھے' ان ملکوں نے اب اپنی صنعتی جد و جہد کو مختصر کر دیا تھا اور ان کی خریداری میں

---

[1] سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء' سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء' سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء' اور سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں مماثل فی صدی اعداد حسب ذیل تھے۔

السی	۷۷	۶۳	۶۸	۲۹
سرسوں ورائی	۱۳	۸	۴	۶
تل	۱۰	۲	۰.۲	۳
مونگ پھلی	۲۴	۲۴	۱۹	۲۵

بھی کمی آگئی تھی۔ جرمنی اور آسٹریا ہنگری کو تو کوئی برآمد ممکن ہی نہ تھی روغنی بیجوں میں السی کو سب سے کم نقصان اٹھانا پڑا، یہ رنگ اور روارنش کی تیاری کے لیے بہت کارآمد تھی اور جنگ سے قبل بھی سلطنت متحدہ اس کی اہم خریدار تھی[1] لیکن دوسری تمام اقسام کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگ کے چند سال بعد بھی یورپ کے وسطی ممالک کسی بڑی مقدار میں خریداری کرنے سے قاصر رہے اس کی وجہ سے تجارت میں ۲۳-۱۹۲۲ء تک بحالی کے آثار پیدا نہ ہوسکے لیکن اب پھر برآمد قبل از جنگ والی سطح پر آگئی لیکن اسی دوران میں جنگ نے روغنی تخموں کی تجارت میں قابل لحاظ تبدیلی پیدا کردی، صنعتی نقطۂ نظر سے جنگ نے صاف کرنے کے طریقوں کو ترقی دی اور اس تبدیلی کا عام نتیجہ یہ ہوا کہ تیلوں میں تبادل پذیری کی صنعت بڑھ گئی[2] مزید برآں جنگ نے روغنی بیجوں کی رسد کے دوسرے ذرائع کو بھی ترقی دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ سے قبل ہندوستان کو روغنی بیجوں کے سلسلے میں جو مخصوص و موافق صورت حاصل تھی وہ زائل ہوگئی اس کے علاوہ مختلف بیجوں کی برآمد کی اہمیت میں نسبتی تبدیلی ہوگئی، برآمد کے لحاظ سے کاشت کے رقبوں میں اتنے زیادہ تغیرات نہیں ہوئے کیونکہ تمام روغنی بیجوں کے لیے ملک میں اندرونی بازار بھی موجود تھا جو نسبتہً برابر مستقل رہا۔ السی کو ارجنٹائن اور یورپی ملکوں کی مقامی رسد سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا، سرسوں اور رائی کو مونگ پھلی سے مسابقت کرنا پڑ رہی تھی، اس وجہ سے ان دونوں کے رقبہ

[1] غالباً اس کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ السی کچھ دھاتوں کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کو موافق شرح کرایہ حاصل تھی۔

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (تیرھواں ایڈیشن) تیلوں اور چربی پر مضمون۔

کاشت میں تھوڑی سی تخفیف ہو گئی ۔ تل جس کی برآمد حال ہی میں بہت کم ہو گئی اس کے رقبے میں بھی زیادہ تخفیف نظر آتی ہے۔ مونگ پھلی کی برآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اس کے رقبۂ کاشت میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ یہ تمام رجحانات جنگ سے پہلے بھی کسی حد تک اثر انداز ہو رہے تھے لیکن اب ان کے اثرات بہت زیادہ بڑھ گئے بین الاقوامی بازار میں ہندوستانی روغنی بیجوں کی صورت حال ایسی محفوظ نہ تھی جیسی کہ وہ قبل از جنگ والے دور میں تھی، السی میں ارجنٹائن نے اپنی پیداوار تیزی سے بڑھالی تھی تل کے بازار پر بڑی حد تک چین کا قبضہ ہو چکا تھا اور مونگ پھلی میں مغربی افریقہ نے حال ہی میں ایک اہم حیثیت حاصل کر لی، اس کے علاوہ چین، جنوبی امریکہ اور مغربی افریقہ وغیرہ کی دوسری نباتاتی پیداواروں سے تیل نکالنا شروع ہو چکا تھا اس نے روغنی بیجوں کی مسابقت میں مزید دشواریاں پیدا کر دیں ۔

غالباً روئی کی فصل ہندوستان کی سب سے اہم رقمی فصل ہے ۔ زیر تبصرہ دور میں اس کے رقبے میں بڑے تغیرات ہوئے لیکن ان میں اضافے کا عام رجحان نظر آتا ہے، قیمت کے اعتبار سے روئی کا رقبہ بڑا تغیر پذیر ہے اور جنگ کے زمانے سے خصوصیت سے زیادہ سریع التاثیر ہو گیا ہے، جنگ اور بعد از جنگ کے چند سالوں میں اعلیٰ قسموں کی وجہ سے روئی کے رقبے میں اضافہ ہوا، جوٹ کا رقبہ واضح طریقے پر غیر مستقل ہے ۔ جنگ کے سالوں میں کمی کا سبب جوٹ کی ادنیٰ قیمتیں تھیں، ۲۰۹ خام جوٹ کی برآمد گرنے لگی اور ہندوستانی جوٹ کی گرنیوں نے پیداوار کا زیادہ حصہ خریدنا شروع کر دیا اور اس وجہ سے قیمتوں کا معیار ادنیٰ رہا۔ مشرقی اور شمالی بنگال جو جوٹ کی پیداوار کے خاص رقبے تھے ان میں ایک کثیر رقبہ دو مسابقتی

فصلوں یعنی چاول اور جوٹ کے درمیان متغیر ہوتا رہا۔ دوران جنگ اور جنگ کے بعد چاول کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے جوٹ کی حالت خراب ہوگئی اور جوٹ کی گرنیوں کی انجمن کے صدر نے ۱۹۲۵ء میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ خام مال کی رسد صنعت کی ترقی کا ساتھ نہیں دے رہی۔ ۱۹۲۵ء کے بعد چند سالوں تک جوٹ کے رقبہ کاشت میں اضافہ ہوتا رہا لیکن زرعی سرد بازاری نے جوٹ کو کافی نقصان پہنچایا، جوٹ کی طلب میں کلیۃً کمی اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۰ء میں اچھی فصل نے صورت حال اس قدر خراب کردی کہ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طریقوں پر کاشتکاروں میں جوٹ کی کاشت کم کرنے کی تبلیغ شروع کی گئی۔ ۱۹۳۱ء میں جوٹ کے تحت صرف ۲۶۱۸ ہزار ایکڑ رقبہ تھا۔ جنگ کے زمانے میں شکر کی قیمت میں اضافہ جو ۱۹۲۰ء میں ایک بیشترین سطح پر پہنچ گیا، ہندوستان میں نیشکر کی کاشت کو بڑھانے کی ترغیب دینے کا باعث ہوا۔ اگرچہ دوسرے عشرے میں یہ قیمتیں برابر گرتی رہیں لیکن نیشکر کے رقبۂ کاشت میں کوئی خاص تخفیف نہیں ہوئی۔ حالیہ چند سالوں میں تو قیمتوں میں یہ تخفیف اتنی ہوگئی کہ گزشتہ تین عشروں میں نہیں ہوئی تھی۔ اور اس عارضی اضافے کو عام طور پر گڑ کی اعلیٰ قیمتوں کی وجہ بتایا جاتا تھا۔[1] لیکن گڑ اور شکر کی قیمتوں اور نیشکر کے رقبۂ کاشت میں کیا تعلق ہے یہ ابھی تک واضح نہیں ہے۔ حکومت نے حال ہی میں شکر کی درآمد پر تائینی محصول عائد کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی، یہ ہندوستان میں پہلی مثال تھی کہ قطعی طریقے سے جزوی طور پر زرعی مفادات کو تامین عطا کی گئی۔ اور یہ طریقہ مستقل ہوتا نظر آنے لگا اور اس وجہ سے موزوں ترین

[1] صنعت شکر سازی پر ہندوستانی مجلس کرور گیری کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) باب دوم۔

اضلاع میں نیشکر کی کاشت میں اضافہ ہوگیا۔ اشیائے خوردنی کے رقبے میں جو تیز رفتاری گزشتہ دور میں ہوئی تھی وہ بحال رہی۔ جنگ کے زمانے میں نیل کی کاشت میں وسیع اضافہ ہوا اور بعد میں ویسی ہی تخفیف ہوئی مختصراً اس دور میں بعض اہم تغیرات ضرور ہوئے لیکن یہ بات ضرور نظر آئے گی کہ فصل کے رقبوں کی علی الترتیب حیثیت میں قبل از جنگ دور کے مقابلے میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔

مختلف فصلوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہندوستان کی جو حالت تھی وہ مسٹر ہاورڈ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں اختصار کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش کی گئی ہے[1] ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی پر کاشت ہوتی ہے۔ فصلیں دو قسم کی ہیں، پہلی رقبے اور اہمیت کے لحاظ سے اشیائے خوردنی یعنی اناج اور دالیں ہیں جو آبادی کے لیے غذا مہیا کرتی ہیں، دوسرے درجے میں رقمی فصلیں ہیں جن سے کاشتکار اپنی مالگزاری ادا کرتا ہے اور ضروریات زندگی خریدتا ہے، پیداواروں کا وہ ماحصل جو ملکی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچ رہتا ہے برآمد کیا جاتا ہے۔ سوائے السی، مونگ پھلی، روئی اور جوٹ کے تمام اہم فصلوں کا ایک بڑا حصہ ملک کے صرف کے واسطے رکھ لیا جاتا ہے، زرعی پیداواروں کی ملکی طلب پائدار رہے اور اضافۂ آبادی کے ساتھ اس میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اور ان میں کمی صرف بیرونی زرعی پیداواروں کی سخت مسابقت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے کہ چقندر اور گنّے کی شکر کی درآمد کی بدولت ہندوستانی شکر کی طلب میں تخفیف ہوگئی۔ فصلوں کی پیداوار وغیرہ کے متعلق معلومات نہ تو کچھ جامع

۲۱۰

[1] ہاورڈ ہندوستان کی فصلی پیداواریں۔ صہ ۵۲ (۱۹۲۴ء)۔

تھیں اور نہ ایسی قابلِ اطمینان کہ ان کی مدد سے ہندوستان کی زرعی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے رفتارِ ترقی بہت ہی سست رہی، اور ترقی کی راہ میں بہت سے مخالف اسباب مانع تھے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ نئی فصلوں کی ترویج یا ہندوستانی فصلوں کی بیرونی اقسام، جن پر ابتدا میں بہت زیادہ توجہ کی گئی تھی اب ان کو نظر انداز کر دیا گیا اور یہ محسوس کر لیا گیا کہ ان کی کامیابی کے امکانات بہت ہی کم ہیں[1]۔ زرعی ترقی کا باقاعدہ کام لارڈ کرزن کے قائم کردہ محکمۂ زراعت کی بدولت شروع ہوا اور اس وقت سے اب تک بعض چیزوں کے سلسلے میں قابلِ لحاظ کام ہو چکا تھا، مزید براں یہ کہ اصلی مسائل کو کم از کم سمجھ لیا گیا تھا[2] اور یہ محسوس کر لیا گیا کہ متوسط کاشتکار کے فائدے کی کسی تجویز کو عملی صورت دینے سے قبل، کاشتکار کی نوعیتِ کار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ جس خاص مسئلے کو منتخب کیا گیا وہ زرعی پیداواروں کی مروجہ اقسام کی تحقیق اور ان کو بہتر بنانے کی کوشش تھی اور غالباً ہندوستان میں اس سلسلے کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش مسٹر ہاورڈ کی گیہوؤں کی تحقیق تھی، جیسا کہ ڈاکٹر ولکر نے بہت عرصہ ہوا بتایا تھا کہ کاشت کے طریقے اور کاشت کی جانے والی اقسام میں سارے ہندوستان میں بڑا اختلاف ہے، اور کاشتکاروں کے فائدے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ زیادہ موزوں اقسام کا انتخاب اور ان کی درجہ بندی کی جائے، خاص کامیابیاں گیہوں، روئی، جوٹ، مونگ پھلی اور نیشکر میں حاصل ہوئیں[3]۔ اور کاشتکار جیسے ہی ان کے مالی فائدوں کے

---

[1] ہندوستانی زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحات ۹۸-۹۹

[2] ان کی بہترین تفصیلات مسٹر ہاورڈ کے یہاں ملتی ہیں حوالۂ گزشتہ۔

[3] زرعی کمیشن نے اپنی رپورٹ کے صفحہ ۹۵ پر بہترین اقسام کی وسعت کے اعداد دئے

قائل ہوجاتے وہ فوراً ان کی کاشت شروع کرنے پر تیار ہوجاتے تھے۔ کاشتکاروں کی اس آمادگی کی مثال زرعی کمیشن نے خاندیس اور شمالی گجرات میں مونگ پھلی کے رقبۂ کاشت میں اضافے کی صورت میں پیش کی ہے جو ۱۳-۱۹۱۲ء میں ۴½ ہزار ایکڑ سے بڑھ کر ۲۷-۱۹۲۶ء میں تین لاکھ دس ہزار ایکڑ ہو گیا۔ تحقیقاتی کام موزوں اقسام پر تجربات کرنا، ان اقسام کی واقفیت کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا اور بہتر اقسام کو خالص رکھنے کی کوششوں پر مشتمل تھا۔ آخر الذکر مقصد کے لیے بیج بھنڈار اور ان کے ماتحت تشہیر اور تخموں کی تقسیم کرنے والے ادارے قائم کیے گئے اور روئی جیسی پیداواروں کی صورت میں جہاں تخم میں ابتری اور آمیزش[1] کا اندیشہ زیادہ تھا وہاں قوانین مثلاً ۱۹۲۳ء کا قانون نقل و حمل کپاس کے ذریعے اس کو روکنے کی کوشش کی گئی۔[2] تشہیر کے کاموں کے لیے زرعی سبھاؤں نے جن سے بڑی توقع وابستہ کی گئی تھی، سوائے صوبجات متوسط کے اور کہیں اچھے نتائج پیدا نہیں کیے۔ چنانچہ زرعی کمیشن نے صوبہ بمبئی کے تعلقہ واری انجمن ہائے ترقی کے مماثل جماعتیں قائم کرنے کی تائید کی۔[3]

فصلوں کی بہتر اقسام کی ترویج، زرعی محکموں کے لیے بہت ہی آسان کام ثابت ہوا، اور اس سلسلے میں ان کو بڑی اچھی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، زرعی آلات کی اصلاح کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہیں، ۲۷-۱۹۲۶ء میں کل رقبہ کاشت کے لحاظ سے بہترین اقسام کے تحت یہ رقبہ تھا۔ روئی ۲۲٫۷ فیصدی، جوٹ ۱۴٫۱ فیصدی، گیہوں ۱۱٫۹ فیصدی، مونگ پھلی ۱۰٫۴ فیصدی، نیشکر ۲٫۱ فیصدی

[1] حوالۂ گزشتہ ص ۱۲۰۔

[2] حوالۂ گزشتہ ص ۱۵۸ و کتاب مذکور ص ۱۰۔

[3] حوالۂ گزشتہ صفحات ۱۶۲-۱۵۹-

سلسلے میں زرعی کمیشن کی متفقہ رائے کے مطابق زرعی محکموں نے بہت ہی مایوس کن کام کیا۔[1] پھر نائٹروجن کا مسئلہ بھی تھا۔ مسٹر ہاورڈ کہتے ہیں کہ "ہندوستان کی زراعت میں پانی کی رسد کو منظم کرنے کے بعد دوسرا مسئلہ نائٹروجن کے حل کا ہے"[2] ہندوستانی شکر کمیٹی اور ساتھ ہی ساتھ زرعی کمیشن دونوں نے اس مسئلے پر تفصیل سے غور کیا، آخر الذکر نے ہندوستان میں جتنے قسم کے نائٹروجن کھادوں پر تجربے ہوئے تھے ان کو مختصراً بیان کیا۔ یعنی مویشی خانوں کا کھاد فضلہ یا چینی طریقے کا مرکب کھاد، پھلی دار فصلوں یا ان فصلوں کی گردش کی ترویج جن سے سبز کھاد حاصل کیا جاتا ہے، یا زمین میں کھلی دینے کا طریقہ یا ایمونیا سلفیٹ[3] اور دوسری مصنوعی کھاد۔ ہر سلسلے میں کچھ نہ کچھ کیا گیا تھا۔ لیکن تحقیق اور کاشتکار کی ان سے واقفیت دونوں طریقوں سے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ اس روکھے پھیکے خلاصے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ جن بنیادوں پر اصلاح ہو رہی تھی وہ تقریباً وہی تھیں جو گزشتہ باب میں بیان کی جاچکی ہیں[4] نتائج سے بہت جلد بہرہ اندوز ہونے کے سلسلے میں کوئی نیا انکشاف نہیں ہوا اور یہ چیز قابل لحاظ ہے کہ زرعی کمیشن کی رپورٹ پر جو تنقید ہوئی اس میں اسی امر پر زور دیا گیا تھا کہ انھوں نے نہ تو کوئی نئی چیز معلوم کی اور نہ کوئی متاثر کن تجویز پیش کی، زرعی محکموں کی کوششوں کی بدولت کاشتکار کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافے کا

---

[1] حوالۂ گزشتہ صفحہ ۱۰۱۔

[2] حوالۂ متذکرہ بالا ص ۳۵۔

[3] یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں جتنا ایمونیا سلفیٹ پیدا ہوتا تھا، اس کا بڑا حصہ ملکی طلب نہ ہونے کی وجہ سے برآمد کر دیا جاتا تھا۔

[4] (انگریزی متن) صفحات ۹۷ و ۱۰۰۔

کوئی فوری امکان نظر نہ آتا تھا۔ بہتر اقسام کا رواج ہی اب تک سب سے زیادہ کامیاب اور مفید کام ہوا تھا اور بعض صورتوں میں اس کے معاشی نتائج بھی اچھے خاصے معقول تھے۔ مسٹر ہاورڈ ادعا کرتے ہیں کہ گیہوں کی بہتر اقسام کی تقسیم کی وجہ سے کاشتکار کا تقریباً پندرہ روپے فی ایکڑ منافع بڑھ گیا۔[1] لیکن ان صورتوں میں بھی توسیع کی ترقی نسبتۃً سست تھی اور ایسی کوئی تیز ترقی نہیں ہوئی جیسی کہ کینیڈا میں مارکوئس گیہوں کی ہوئی۔ مختصر قطعات اراضی اور ہندوستانی کاشتکار کے افلاس اور ناواقفیت کی وجہ سے اچھے نتائج کا جلد حاصل کرنا ممکن بھی نہ تھا، بہرحال ترقی کی جو بنیادیں قائم کردی گئیں تھیں، ان پر جمے رہنے سے اس بات کا یقین تھا کہ ان سے کاشتکار کو اچھی خاصی امداد مل جائے گی۔

۲۱۴ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے ۱۹۱۴ء تک مویشیوں کے اعداد بہت ہی ناقص تھے، ۱۵-۱۹۱۴ء کے بعد مسلسل مویشی شماریوں کے اعداد میں جو تیزی سے اضافہ ہوا، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اعداد و شمار فراہم کرنے کا کام نسبتۃً بہتر اور وسیع ہوگیا تھا۔[2] ۱۵-۱۹۱۴ء تک تغیرات ویسے ہی تھے جیسے کہ اس ملک میں ہونا چاہئیں جہاں کہ مویشیوں کا بڑا انحصار بے حد تغیر پذیر موسموں کی پیداواروں پر ہو۔[3] برطانوی ہند میں مویشیوں کی جس تعداد کا اندراج ہوا وہ ۱۵-۱۹۱۴ء میں تقریباً ۱۴۸٫۷۰ لاکھ، ۲۰-۱۹۱۹ء میں ۱۴۶٫۰ لاکھ اور ۲۵-۱۹۲۴ء میں ۱۵۱٫۰ لاکھ تھی۔ مویشیوں کا تناسب مختلف صوبوں میں بہت زیادہ مختلف ہے مثلاً عام طور پر روئی کے علاقوں میں اوسط بہت

[1] حوالہ منقولہ صفحہ ۱۰۵۔

[2] ہندوستانی زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۷۶۔

[3] حوالہ گزشتہ۔

کم ہے اور چاول کے رقبوں میں نسبتاً زیادہ ہے، زرعی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور محسوس کیا کہ ہندوستان کے موجودہ مویشیوں کی حالت بڑی خطرناک ہے، بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عہد قدیم کی بہترین چراگاہوں کو زرعی رقبوں میں تبدیل کردینے کی وجہ سے مویشیوں کی خوبی کو برقرار رکھنا دشوار ہو گیا ہے، اس وجہ سے ان کی عمدگی میں بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اس کی بدولت نقائص کا ایک تسلسل وجود میں آگیا ہے۔ یہ کمیشن کے الفاظ ہی میں بہتر طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے "ہر ضلع میں مویشیوں کی تعداد کا انحصار بیلوں کی طلب پر ہوتا ہے اور کارگزار مویشی پالنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ مویشی ضرورت سے زائد رکھے جاتے ہیں۔ گائیں کم بار آور ہو گئیں ہیں، ان کے بچھڑوں کی جسامت کم ہو گئی ہے اور وہ کاشتکار کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے، وہ زیادہ کار آمد بیلوں کے واسطے زیادہ سے زیادہ مویشی پیدا کرتا ہے اور جب تعداد بڑھتی ہے یا کاشت بہترین چراگاہی رقبوں پر پھیلتی ہے تو چارے کی موجودہ رسد پر دباؤ پڑتا ہے اور گایوں کی حالت اور زیادہ سقیم ہو جاتی ہے اور ایک درجہ وہ آجاتا ہے جب کاشت میں امداد کے واسطے دوسرے صوبوں سے بیل یا بھینسے لائے جاتے ہیں چنانچہ بنگال اس منزل پر پہنچ چکا ہے[1] کاشت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف چراگاہوں میں کمی ہو رہی ہے بلکہ کھیتی باڑی کے لیے بیلوں کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ مسئلہ در اصل عظیم الشان ہے اس کا حل

---

[1] حوالۂ گزشتہ ص۱۹۱۔

چارے کی رسد میں اضافہ اور مقامی نسلوں کے انتخاب اور ترقی میں مضمر ہے۔ چارے کا مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ خشک چارے کو بہتر افادے کے تحت محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور چارے کی نئی فصلوں کی ترویج کی جائے، ہندوستان کے قدیم خانہ بدوش گڈریوں کے غائب ہونے کے بعد سے نسل کشی پر کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی اور مقامی نسلوں کی بہتری اور ان کی خوبی کو برقرار رکھنے کا کام خانگی پرورش کنندوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے لازمی طور پر حکومت کے مویشی خانوں ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے بہر حال ابتری اس قدر عام ہے اور اس کی برائیاں اتنی زائد ہیں اور عام معاشی حالت ان پر اس قدر دباؤ ڈال رہی ہے کہ ابھی اس میں بھی کافی عرصہ لگے گا کہ ان کی ابتری کو بھی روکا جا سکے۔

۲۱۴ یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں ذرایع آمد و رفت کی توسیع کی بنا پر مختلف علاقوں میں پیدا ہونے والی فصلوں میں نئی تقسیم ہو گئی اور جہاں ممکن تھا وہاں اشیائے خوردنی کے بجائے اعلیٰ اناج کی کاشت شروع ہو گئی۔ بنگال سے روئی تقریباً بالکل غائب ہو گئی۔ برار، خاندیس اور گجرات جیسے علاقوں میں اس کی تحصیل بڑھنے لگی یا نیشکر کی کاشت بعض صوبوں میں گھٹ گئی اور دوسرے صوبوں میں بڑھ گئی، یہ اس رجحان کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اسی طرح اہم اناج مثلاً گیہوں کے رقبوں میں ادنیٰ غلوں مثلاً باجرے کے بجائے اضافہ ہوا۔ لیکن یہ دونوں رجحانات ۱۹۱۳ء تک تقریباً اپنا عمل پورا کر چکے تھے اور اس کے بعد سے مختلف صوبوں میں مختلف فصلوں کا تناسب کم و بیش یکساں ہے، اگرچہ ہندوستان میں مجموعی حیثیت سے رقبوں میں کوئی بڑے تغیرات نظر نہیں آتے لیکن مختلف رقمی فصلوں کے ان مخصوص حصوں میں جو ان کے لیے

زیادہ موزوں ہیں یہ تغیرات جاری رہے، چنانچہ اس طرح دکن کے اضلاع میں پہلے گیہوں اور روغنی تخموں کے بجائے روئی کی کاشت بڑھی لیکن موجودہ سالوں میں خصوصاً خاندیس میں، مونگ پھلی، روئی کے رقبے میں کمی کا باعث ہو رہی ہے۔ اس قسم کے تغیرات خاص طور پر رقمی فصلوں میں نظر آتے ہیں، اس نوعیت کی تبدیلیوں کے علاوہ فصلوں کی تقسیم کو جو چیز اور متاثر کر رہی ہے وہ محض ذرائع آبپاشی کی سہولتیں ہیں۔

ہندوستان کی اندرونی تجارت کے اعداد ہمیشہ بڑے ناقص رہے ہیں اور ان سے مختلف پیداواروں کی اندرونی تجارت کا کوئی حال معلوم نہیں ہوتا ورنہ ان سے زرعی تجارتیت کا بڑی حد تک اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے تجارتیت کا عمل، ذرائع آمد و رفت میں اضافے اور گاؤں کے خود کفالتی نظام کے ٹوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ اب بازار کے واسطے فصلیں پیدا کرنے کا رجحان نمایاں ہو گیا تھا زیادہ تر تو کاشتکار اپنے لیے غلے اگاتا اور ساتھ ہی اپنی دوسری ضروریات زندگی خریدنے کے واسطے کچھ رقمی فصلوں کی کاشت کرتا تھا۔ اگر اس کے پاس کوئی رقمی فصل نہیں ہوتی تو اس کے پاس خوردنی غلوں کا ماحصل ہوتا تھا جس کو وہ فصل کے زمانے میں بازار میں لے آتا تھا لیکن یہ صورت ہر صوبے اور ہر کاشتکار میں مختلف تھی[1]۔ زیادہ خوش حال کاشتکار آیندہ سال کی اپنی ساری ضرورت کے واسطے ذخیرہ رکھ لیتے تھے اور صرف حقیقی ماحصل فروخت کرتے تھے، اس کے برخلاف مقروض اپنی

[1] یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ضلعے میں ذرائع آمد و رفت کی حالت بھی اس مقدار کے تعیین پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی تھی کہ کتنی مقدار بازار میں لائی جائے اور کتنی دیہات کے مہاجن کو فروخت کر دی جائے۔ ملاحظہ ہو رپورٹ زرعی کمیشن صفحہ ۳۸۵، اور کیٹنگ دیہی معیشت صفحہ ۱۵۱۔

پیداوار کا بڑا حصہ فروخت کرنے پر مجبور تھے اور آیندہ سال میں پھر اس کا کچھ حصہ واپس خرید لیا کرتے تھے۔ خصوصاً اناجی قرضوں کی صورت میں کاشتکار خود اپنی پیداوار کا بڑا حصہ فروخت نہیں کرتا تھا بلکہ وہ ساہوکار کو دے دیا کرتا تھا[1]۔

اناجی قرض کی صورت اگر عارضی قرضداری کی ہوتی تب بھی اس کی بدولت پیداوار کا بڑا حصہ بازار میں آجایا کرتا تھا چنانچہ مسٹر ڈارلنگ کہتے ہیں کہ "ضلع گڑگاؤں کے حصوں میں غلہ تین ڈھیروں میں بانٹا جاتا ہے، ایک چھ ماہ کی غذا کے واسطے رکھا جاتا ہے، دوسرا بیج کے واسطے ہوتا ہے اور باقی پیداوار تیسرے ڈھیر میں رکھی جاتی ہے۔ یہ آخری ڈھیر مہاجن کا حصہ ہوتا ہے، اور بعض وقت وہ دوسرا ڈھیر بھی لے لیتا ہے، مظفرگڑھ میں گیہوں کی ساری فصل لے لی جاتی ہے اور کبھی کبھی خریف کا کچھ حصہ بھی لے لیا جاتا ہے[2]۔" یہ تو بدترین علاقوں کا حال تھا لیکن کسی زمانے میں اس قسم کے حالات عام تھے اور یہ صرف جنگ کے بعد ہوا کہ پنجاب میں ہر جگہ غلے کے قرضوں کے کاروبار میں روپیہ استعمال ہونے لگا۔ دکن کے حالات بیان کرتے ہوئے مسٹر کیٹنگ لکھتے ہیں کہ "جوار اور باجرے کی صورت میں زائد پیداوار کا بڑا حصہ فصل ہی کے زمانے میں فوراً بازار میں آجاتا ہے، روئی، گیہوں اور روغنی بیجوں کی صورت میں تو ساری فصل ایک دم بازار میں آجاتی ہے[3]۔" فروخت کا طریقہ مختلف فصلوں میں بہت مختلف تھا۔ بیشتر صورتوں میں گاؤں کا ساہوکار ہی فصلوں کا خریدار تھا اور وہی گاؤں کا

---

[1] ملاحظہ ہو ڈارلنگ، منقول مندرجہ بالا صفحات ۲۲۰-۲۲۱-

[2] حوالہ مندرجہ بالا ص ۲۲۱، نیز ملاحظہ ہو جیک ص ۱۰۱، اور کیٹنگ صفحات ۲۵۸-۱۶۱-

[3] " " " ص ۱۵۵

پنساری بھی تھا وہ معمولی غلے جن کی تجارت مقامی تھی، ان کا کاروبار صرف ساہوکار ہی کرتا تھا لیکن جہاں بین الصوبجاتی یا بین الاقوامی تجارت تھی وہاں منڈیوں کی حالت منظم تھی اور کاشتکار کو اچھی قیمت ملنے کا امکان تھا، خاندیس میں روئی کے دلال استادہ فصلوں پر ادنیٰ شرح سے کاشتکاروں کو پیشگی رقم دے دیا کرتے تھے تاکہ ان کا سودا پکا ہو جائے، دکن کے نیشکر کے علاقوں میں گڑ کے دلال موجود تھے[1] کھلے ہوئے منظم بازار جہاں کاشتکار اپنی پیداوار لاتا تھا اس کے لیے بڑے فائدہ مند تھے، اور یہ عام طور پر روئی کے سلسلے ہی میں پائے جاتے ہیں، دوسری فصلوں کی صورت میں بڑے خریداروں کے گماشتے اور دوسرے درمیانی آدمی غلہ خریدنے کے واسطے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ چنانچہ مدراس کی دیہی تحقیقات میں ہم پڑھتے ہیں کہ "دیہاتی اپنی روئی سنّور اور دوبٹی لے جاتے ہیں اور روئی صاف کرنے والی گرنیوں کے گماشتوں کو جو وہاں کثیر تعداد میں ہوتے ہیں، فروخت کر دیتے ہیں، دیہاتی دوسری پیداوار یں بازار میں نہیں لاتے بلکہ ان تاجروں کو فروخت کرتے ہیں جو گاؤں میں آتے رہتے ہیں، تمباکو، سنا، مرچیں، اور شکر قند ان سوا کاسی تاجروں کو فروخت کر دی جاتی ہیں جو دیہات میں باقاعدہ آیا کرتے ہیں[2] یا پھر "جو خاص چیز دیہاتی فروخت کرتے ہیں وہ دھان ہے، وہ اس کو بازار میں نہیں لاتے ہیں، ہر ایک زمیندار اپنے خرچ کی ضرورت کے مطابق دھان رکھ لیتا ہے اور باقی، غلے کے بیوپاریوں کو رقم کے واسطے فروخت کر دیتا ہے[3]"۔ ایک دوسری تحقیقات میں ہم کو ان طریقوں کی تفصیل ملتی ہے کہ

---

[1] کیٹنگ، حوالۂ بالا صفحات ۶۲-۱۶۰۔

[2] [3] سلاٹر، جنوبی ہند کے چند دیہات، صفحات ۳۹، ۹۰ و ۶۷۔

کس طرح گاؤں کی مختلف فصلیں فروخت کی جاتی ہیں کمبو، چولم، اور راگی (یہ سب باجرے کی قسمیں ہیں) اور دالیں مقامی طور پر صرف ہوتی ہیں۔ دھان اور دھنیا تاجر موقع پر لاتے ہیں اور یہ چیزیں ضلعے میں صرف ہوتی ہیں، اس کے برخلاف روئی اور سنا کا کچھ حصہ تو موقع پر فروخت کر دیا جاتا ہے اور کچھ ٹٹی کورن لے جایا جاتا ہے اور یہ دونوں برآمدی فصلیں ہیں۔ نیز ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سنا کی فصل درو ہونے سے پہلے ہی خرید لی جاتی ہے اور بعض اوقات روئی کی فصل میں بھی یہی صورت اختیار کی جاتی ہے۔"[1]

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ برار کی منڈیاں[2] کاشتکاروں کے لیے بڑی مفید ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روئی اور غلے کے قانون بازارات (۱۸۹۷ء) کے تحت قائم اور منظم ہوئیں، بازاروں کو منظم کرنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ برآمدی فصلوں کی صورت میں بھی مختلف حصوں میں پیداواروں کی فروخت کی صورتوں میں اختلاف ہے۔ ہندوستانی روئی کمیٹی کی تحقیقات سے یہ بات بڑی اچھی طرح واضح ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ منظم بازاروں کے انتظامات سے بڑی حد تک مستفید ہونے کا انحصار کاشتکار کی معاشی حالت پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب قرضداری وغیرہ کے متعلق حالات مماثلت رکھتے ہوں اس وقت بھی تنظیم کاشتکار کے واسطے بہت مفید ہے جیسا کہ برار اور خاندیس کے متضاد حالات سے ظاہر ہوتا ہے[3]۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں روئی کی صورت میں منڈیوں کی حالت بہت بہتر ہے اور برار کا قانون اگرچہ عمومی ہے مگر

۲۱۷

[1] سلاٹر، جنوبی ہند کے چند دیہات، صفحات ۳۹، ۹۰ و ۶۷۔

[2] صفحہ ۱۵۴ (انگریزی متن)۔

[3] زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۸۵۔

اس کا انطباق روئی کی منڈیوں پر ہی ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء کا بمبئی کا قانون بھی صرف روئی کے بازاروں کو منظم کرنے کے واسطے بنایا گیا۔ دوسری برآمدی فصلوں کی منڈیوں کی حالت بدترین ہے[1]۔ برمی چاول کی تجارت کی جو تصویر زرعی کمیشن نے پیش کی ہے[2] وہ بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ چند سال قبل مسٹر نول پٹن نے پیش کی تھی۔ جوٹ کی تجارت میں کاشتکار اور جوٹ کی گرہیوں کے درمیان تقریباً چار ادارے موجود تھے[3]۔ اس لیے زرعی کمیشن نے سفارش کی کہ روئی کے علاوہ دوسرے پیداواروں کی منڈیوں کو منظم کرنا بھی ضروری ہے اور اس قسم کی منڈیاں ہر جگہ صوبے واری قوانین کے تحت قائم ہونا چاہییں۔

یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ۱۹۱۴ء کے بعد سے بازاروں کی حالت میں کیا تبدیلی ہوئی، مسٹر ڈارلنگ بتاتے ہیں کہ پنجاب میں جنگ کی وجہ سے اور امداد باہمی کی ترقی کی بدولت، اناجی قرضوں کا دستور کم ہوتا جا رہا ہے، صوبۂ بمبئی میں روئی کی انجمن ہائے فروخت کے آغاز سے ترقی کی جانب کچھ قدم بڑھائے گئے، ابتدا میں صوبے کے اکثر حصوں میں ان انجمنوں کی روئی کے تاجروں نے بڑی مخالفت کی، لیکن اب اس مشکل پر قابو پایا جا چکا ہے[4]۔ مسٹر ڈارلنگ کو پنجاب کی نہری نو آبادیوں میں "آبادکاروں میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ یہ مقامی بنیے کو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنا غلہ خود ہی بازار میں

---

[1] رپورٹ صفحہ ۳۸۵۔

[2] صفحہ ۱۵۲ (انگریزی متن)۔

[3] زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۳۸۶ نیز بن دیکر، بنگال ڈیلٹا کی دولت و مرفہ الحالی صفحات ۵۲-۵۳۔

[4] صوبہ بمبئی میں انجمن ہائے امداد باہمی کی حالت کی رپورٹ ۱۹۲۷-۲۸ء۔

لاتے ہیں[1]"۔ لیکن پنجاب کی نہری نو آبادیوں کی حالت خاص طور پر بہتر تھی اور اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایسا رجحان سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قرضداری ہندوستانی کاشتکار کی سب سے بڑی لعنت ہے، یہ دیہات میں ہر جگہ عام ہے اگرچہ اس کی اصلی وسعت کا اندازہ معلوم نہیں، بڑے پیمانے پر قرضے کے اعداد فراہم کرنے کی سب سے پہلی اہم کوشش مسٹر ڈارلنگ نے کی اور انھوں نے معلوم کیا کہ پنجاب کے خود کاشت زمینداروں کا صرف ۱۷ فی صدی حصہ مقروض نہ تھا۔ اور قرضہ آسامیوں کی طرح خود کاشت زمینداروں میں بھی عام تھا[2]۔ قرضے کی مقدار کے متعلق ان کا اندازہ تھا کہ ملکی زمینداروں میں قرضے کا اوسط ان کی زمین کی تقریباً تین سالہ خالص آمدنی کے مساوی ہے۔ مختلف صوبجاتی بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹیوں نے صوبوں میں قرضے کا بار معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس طرح برطانوی ہند کے کل قرضے کی تعداد نو ارب روپے کے قریب معلوم ہوئی، بعض کمیٹیوں نے غیر مقروض کاشتکاروں کا فی صدی معلوم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے اور یہ متفقہ رائے تھی کہ حالیہ سالوں میں اور بالخصوص جنگ کے بعد قرض داری کا بار بڑھ گیا ہے اور مرکزی بنک کاری کمیٹی نے اس طرف اشارہ کیا کہ اس اضافے کی وجہ زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ ہے جو مزارعین کے لیے ایک ناقابل برداشت بار ہو گیا ہے[3]۔ لیکن بنک کاری کمیٹی کی رپورٹ کے بعد

---

[1] حوالۂ متذکرۂ بالا صفحہ ۱۶۲۔

[2] حوالۂ متذکرۂ بالا باب اول۔

[3] ہندوستانی بنک کاری کی تحقیقات کرنے والی مرکزی کمیٹی کی اکثریت والی رپورٹ (۱۹۳۱ء) صفحہ ۵۶۔

قیمتوں میں مزید تخفیف ہوگئی اور اس نے صورت حال کو اور بدتر کردیا۔ زیر تبصرہ دور کے ابتدائی سال مجموعی حیثیت سے کاشتکاروں کے لیے بڑی مصیبت کے تھے، سوائے روئی کے اور دوسری زرعی پیداواروں کی قیمتیں، دوسری قیمتوں کے ساتھ نہ بڑھیں اور پھر قحط بھی تھے اور قحط سے کیا فرق ہوجاتا ہے اس کا اندازہ ڈاکٹر منن کے اس تخمینے سے ہوتا ہے کہ جاتے گاؤں بڈرک میں ۱۹-۱۹۱۸ء کے قحط کا یہ مطلب تھا کہ ان کی قرضداری میں ۴۴ فیصدی کا اضافہ ہوگیا[1]۔ اس کے برخلاف یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اچھے سالوں میں کوئی فرق ہوجاتا تھا۔ مسٹر ڈارلنگ نے قطعی طور پر ثابت کردیا ہے کہ کاشتکار کی معاشی حالت جتنی بہتر ہوگی اتنا ہی اس کا قرضہ زیادہ ہوگا۔ اور قرض لینے کے بے قید مروجہ طریقوں کی بدولت خوش حال سالوں کا مطلب یہ ہے کہ قرضے کی رقم میں کافی اضافہ ہوگیا ہے، عام واقعہ یہی تھا کیونکہ جہاں تک جنوبی ہند کا تعلق ہے مسٹر سلاٹر اس بات کا یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ حقیقت اراضی کی قدر میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قرضے کی رقم میں بھی اضافہ ہورہا ہے[2]۔ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حقیت اراضی کی پیدائش کس طرح قرضداری کی ذمہ دار رہی ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جس آدمی کی کوئی ساکھ نہ ہو وہ کوئی بڑا قرضہ آسانی سے حاصل نہیں کرسکتا اور وہ تمام اسباب جو کاشتکار کی ساکھ میں اضافہ کرتے ہیں اس کی قرضداری میں بھی اضافے کا باعث ہوتے ہیں

---

[1] منن، ایک دکنی گاؤں کی زمین و محنت، تحقیق نمبر ۲ صد ۱۳۵۔

[2] سلاٹر، حوالۂ متذکرہ بالا صـ ۲۴۱۔ زرعی کمیشن کا بھی کہنا ہے کہ وہ ہمیں جو شہادت ملی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ڈارلنگ کے عام نتائج کسی ایک صوبے سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان کا انطباق ایک بڑے رقبے پر ہوتا ہے'' (صفحہ ۴۳۲)۔

اور کاشتکار کی حد قابل گذارہ سطح سے جتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی اس میں قرض لینے کی صلاحیت زیادہ ہوجاتی ہے اور اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ قرضداری کا علاج یہ ہوسکتا ہے حکومت زائد محصول عائد کردے تاکہ اس کا معیار کم ہوجائے[1] لیکن ظاہر ہے کہ یہ مشورہ نراسی ہے۔

قانون کے ذریعے قرضداری کو روکنے کی کوشش کا آغاز بہت پہلے یعنی قانون امداد مزارعین دکن کے زمانے سے شروع ہوچکا ہے۔ لیکن یہ اور اسی قسم کے دوسرے طریقے کوئی اثر پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں، سنہ ۱۹۱۸ء کا ربائی قرضوں کا قانون تقریباً تمام صوبوں میں تقویم پارینہ بن چکا ہے۔ اگرچہ زرعی کمیشن اس بات پر متفق ہے کہ قانون سازی سے قرضداری کی برائی کا قلع قمع نہیں ہوسکتا تاہم اس نے سنہ ۱۹۲۷ء کے قانون برطانوی ساہوکاران کے نمونے پر قانون سازی کی سفارش کی تاکہ ہمارے ساہوکاری طریق کی کھلم کھلا خرابیاں کم ہوجائیں، اور وہ اس بات کا بھی یقین رکھتا تھا کہ دیہی دوالے کے سادہ قوانین موروثی قرضوں کے بار کے اضافے کو روکنے میں بڑے مفید ثابت ہوں گے۔[2] بنک کاری کی مرکزی کمیٹی نے زرعی کمیشن کی آخری سفارش سے اتفاق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ صوبے داری حکومتیں رضاکارانہ اصولوں پر قرضے کی مصالحت کی سخت جد و جہد کریں کیونکہ دیہی قرض داری کی خرابی کو روکنے کا سب سے موثر علاج یہی ہے۔[3]

خود کاشت۔ زمینداروں کے پاس سے ساہوکاروں کے پاس

---

[1] کلورٹ، پنجاب کی دولت اور مرفہ الحالی باب پنجم۔

[2] رپورٹ ص ۴۴۴۔

[3] رپورٹ ص ۴۶۵۔

اراضی منتقل ہونے کا سوال بھی قرضداری کے مسئلے سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتا ہے، اس کے متعلق اتنی بھی معلومات نہیں جتنی کہ زرعی قرضداری کے متعلق ہیں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو بالکل ہی موجود نہیں، اس لیے ہمیں صرف زرعی کمیشن کے قول کو نقل کرنے پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ "بیشتر صوبوں میں ساہوکاروں کی مقبوضاتی اراضیات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے"[1] قوانین کے ذریعے زمین کی منتقلی پر جو پابندیاں عائد کی گئیں تھیں ان کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے اور زیر تبصرہ دور میں ان قوانین میں صوبجات متوسط کے قانون انتقال اراضی ۱۹۱۶ء کا اضافہ ہوا جس کا نفاذ چھتیس گڈھ ڈیوزن کے قدیم قبائل کے ارکان تک محدود تھا۔ پنجاب اور بندیل کھنڈ دونوں جگہ کے قوانین نے جہاں تک ان کے ابتدائی فرض کا تعلق تھا یعنی زرعی طبقوں سے غیر زرعی طبقوں میں زمین کے انتقال کو روکنا اس کو بہت کامیابی سے انجام دیا۔ لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلا یہ کہ آیا ان قوانین نے زرعی طبقوں میں ہلکی کاشتکاروں کی اراضی کو صاحب جائداد لوگوں کے پاس منتقل ہونے سے روکا۔ اس سلسلے میں کوئی خاص معلومات موجود نہیں۔ اور اگر، جہاں یہ قانون نافذ تھے وہاں زمین کی منتقلی میں کمی نہ ہوئی بلکہ صرف مالکان زمین یا ساہوکاروں کا ایک طبقہ پابند ہو گیا، تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا غیر زرعی طبقوں کے مقابلے میں غائب زمیندار لازمی طور پر بہتر ہے اگر وہ زرعی طبقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر ڈارلنگ کی شہادت سے یہی پتا چلتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں، بلکہ اگر کوئی فائدہ ہے تو وہ غیر زرعی ہونے کی صورت

[1] رپورٹ صفحہ ۴۲۱ ۔

ہی ہیں ہے۔[1]

اب یہ بات عرصہ ہوا تسلیم کی جا چکی ہے کہ ان خرابیوں کا واحد علاج، امداد باہمی کی تحریک کی وسعت ہے، انتقال اراضی صرف اسی وقت ختم ہو سکے گا جبکہ قرضے کا بار تباہ کن نہ ہو اور قرضداری کو محض اعتبار کی بے ربط تحدید سے نہیں روکا جا سکتا۔ ارزاں قرض کے ذریعے حکومت کی امداد کا طریقہ بھی بہت ہی محدود تھا۔ ہم اوپر ان دو قوانین کا ذکر کر چکے ہیں جن کے تحت حکومت کاشتکاروں کی مدد کیا کرتی تھی[2]۔ قانون ترقیات اراضی کے تحت جو قرضے لیے گئے ان سے خاص طور پر آب پاشی کی سہولتوں کو بہتر بنانے اور زیادہ تر کنوئیں کھودنے کے لیے فائدہ اٹھایا گیا اور ۲۲۱ [ا]ل قرضہ مزارعین کے تحت عام طور پر مصیبت کے زمانے میں مختلف کاموں، مثلاً تخم، مویشی وغیرہ کی خریداری کے لیے قرضے دیے جاتے ہیں، قحط کمیشن اور آب پاشی کمیشن دونوں نے ان قوانین کے سخت گیر نظام پر تنقید کی ہے۔ لیکن اب تقریباً ربع صدی گزر جانے کے بعد حالات کچھ درست ہو گئے، کیونکہ مجموعی حیثیت سے زرعی کمیشن ان ضابطوں سے مطمئن رہا جن کے تحت اب قرضے دیے جا رہے ہیں، بہرحال حکومت کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور ان سے یا تو سخت مصیبت کے وقت یا ان عملی تعمیری کاموں کے واسطے حکومت سے قرضہ لینے پر بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ جن کی جانچ حکومت کے نظم و نسق کی معمولی مشین کر سکتی ہے۔ ورنہ صرف ایک ہی ادارہ ہے جو کاشتکار کی حالت میں حقیقی اصلاح کر سکتا ہے اور یہ قرضہ امداد باہمی ہے، کیونکہ کاشتکار کو ارزاں اور

---

[1] ڈارلنگ، حوالۂ بالا صفحات ۱۸۷ و ۱۹۰

[2] صلاء (انگریزی متن)۔

امتیازی دونوں ہی قسم کے قرضوں کی ضرورت ہے۔

۱۹۱۴ء میں ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک بمشکل ایک عشرے کی تھی، ۱۹۰۴ء کے قانون سے اس کا آغاز ہوا، لیکن اس کی ترقی نے ۱۹۱۲ء میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرائی، ۱۹۱۲ء کے قانون نے انجمن ہائے امداد باہمی کے قانون کے تحت قائم ہونے والی انجمنوں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ زرعی قرضوں کے علاوہ دوسری انجمنیں بھی قائم ہونے لگیں، اور انفرادی انجمنیں بڑے پیمانے پر اتحادوں کی صورت میں ملنے لگیں، یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح حکومت کے بعض عہدہ داروں کی ترغیب اور بعد میں حکومت کی تحقیق کے بعد ہندوستان میں امداد باہمی کے تجربے کا آغاز ہوا۔ تقریباً ایک عشرے تک ابتدائی اصولوں پر کام کے تجربے کے بعد ۱۹۱۴ء میں حکومت نے اس تحریک کے پورے نظام پر از سر نو غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی اور ۱۹۱۵ء کے بعد سے امداد باہمی کی ترقی کا کام زیادہ تر اسی کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر ہوا۔

ہندوستان میں اس تحریک کی تنظیم تین درجوں میں منقسم ہے۔ بنیاد ابتدائی انجمن ہے، اور ابتدائی انجمنوں کی مالی امداد اور نگرانی کا کام عام طور پر ضلع کے مرکزی بنک کے سپرد ہے، اور اس سارے نظام کے سرے پر صوبہ واری بنک ہے، ابتدائی انجمن اور مرکزی بنک کے درمیان اکثر صورتوں میں ایک درمیانی تنظیم اور ہے وہ یا تو نگرانی کرنے والے اتحاد، یا ضمانتی اتحاد یا بنکاری کے اتحاد ہیں۔ ضمانتی اتحاد نہ صرف اپنی رکن انجمنوں کی نگرانی کرتے تھے بلکہ باہمی طریق پر ان کے قرضوں کی ضمانت بھی لیتے تھے سوائے اپنے اصل صوبے یعنی برما کے اور کہیں یہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئے ضمانتی اتحادوں کا طریقہ صوبجات متحدہ میں بڑی ناکامی سے ختم ہوا،

اور صوبۂ بمبئی میں، جہاں کہ پہلے اس صورت کا آغاز ہوا تھا وہاں بھی ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور ۱۹۲۵ء سے یہ طے کر دیا گیا کہ ان کے بجائے نگراں اتحاد قائم کیے جائیں، نگرانی کرنے والے اتحاد ابتدائی انجمنوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جو ایک جگہ جمع ہو کر مشترک طور پر ایک تربیت یافتہ اور لائق نگراں کو اپنی رکن انجمنوں کے کام کی نگرانی کے واسطے مقرر کرتے ہیں، یہ صورت مدراس میں زیادہ نظر آتی ہے، بنکاری اتحاد پنجاب کا تجربہ ہے، جہاں بنکاری اور قرضے کے کام کو نگرانی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، لیکن یہ درمیانی اتحاد سوائے برما، مدراس، بمبئی اور پنجاب کے اور کہیں عام نہیں ہیں، اور دوسری جگہ مرکزی بنک ہی تمام ابتدائی انجمنوں کی نگرانی کا کام کرتے ہیں۔ زرعی کمیشن کی رائے تھی کہ مناسب یہ ہے کہ مالیات اور نگرانی دونوں کا کام الگ الگ ہونا چاہیئے، لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جس کی کوئی عام حمایت نہ تھی[1]۔ ہندوستانی تحریک امداد باہمی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر صوبے میں ایک سرکاری مسجل موجود ہے، قانون انجمن ہائے امداد باہمی کے تحت اس کو رجسٹری شدہ انجمنوں کے معائنے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں ان کی نوعیت کار کی تحقیق، اندرونی نزاعات کا تصفیہ، اور خصوصاً ان کو ختم کر دینے والے اہم واقعات پر غور کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے، سرکاری محکمے کی جانب سے تمام رجسٹری شدہ انجمنوں کی تنقیح کا انتظام بھی ہے۔ اس طرح تحریک کی صحیح رہنمائی کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت کے سر ہے۔

زیر تبصرہ دور میں اس تحریک نے کافی ترقی کی، لیکن یہ بہت زیادہ غیر ہموار رہی ہے، بعض صوبوں میں یہ بہت پھیل گئی اور بعض میں

[1] ملاحظہ ہو مسٹر پی، اے کوٹن کا مضمون: سہ ماہی رسالہ "دی بمبئی کوآپریٹو" (دسمبر ۱۹۲۸ء)۔

یہ بہت ہی محدود ہے، زرعی کمیشن نے دیہی رقبوں کے کل خاندانوں کے لحاظ سے زرعی انجمنوں کے ارکان کے تناسب کا تخمینہ لگانے کی کوشش کی، بڑے صوبوں میں جہاں تناسب قابل لحاظ ہے وہ صرف پنجاب، بمبئی اور مدراس ہے جہاں تناسب علی الترتیب ۲ء۱۰، ۸ء۷ اور ۹ء۷ فی صدی ہے دوسرے صوبوں میں یہ ۴ فی صدی سے کم ہے اور صوبجات متحدہ میں ۸ء ۰ فی صدی ہے[1] لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زیر تبصرہ دور میں اس تحریک نے حیرت انگیز ترقی کی جس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکے گا۔

پنجسالہ اوسط

		سنہ ۱۹۱۰-۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء تا سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء	سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء
ابتدائی زرعی انجمنیں	انجمنوں کی تعداد	۱۰,۸۹۱	۲۵,۸۷۳	۵۱,۷۱۶	۷۱,۱۴۰	۸۸,۳۷۷
	تعداد ارکان	۴,۵۹,۰۹۶	۹,۳۰,۴۰۲	۱۶,۶۱,۰۹۸	۲۳,۲۷,۸۹۹	۳۰,۰۹,۹۰۰
ابتدائی غیر زرعی انجمنیں	انجمنوں کی تعداد	۶۶۴	۱,۶۶۲	۴,۱۸۳	۷,۰۶۹	۹,۷۶۱
	تعداد ارکان	۰۹,۱۵۷	۲۰۲۶,۰۳۱	۴,۹۳,۵۰۹	۷,۳۰,۱۲۶	۹,۹۲,۲۹۰

[1] حوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۔

لیکن ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت غیر محدود ذمہ داری والی زرعی انجمن ہائے قرضہ کی رہی ۔ ۱۹۲۶۔۲۷ء میں زرعی انجمن ہائے قرضہ کی تعداد ۵ ۴ ۳ ۳ د ۳ ، تھی جن میں سے صرف چار سو کے قریب محدود ذمہ داری والی انجمنیں تھیں ، اور یہ قدرتی بات ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ مناسب شرح پر زرعی قرضے کی طلب اہم ضرورت ہے جس کی تکمیل لازمی ہے ۔ نیز اس بات کا انتظام بھی کیا گیا کہ انجمن ہائے قرضہ کی ایسی انجمنوں سے تقویت پہنچائی جائے جو کاشتکار کے واسطے اس کی پیداواروں کی مناسب قیمت بھی حاصل کر سکیں اس قسم کی انجمن ہائے فروخت کی نمایاں اور کامیاب مثالیں گجرات اور کرناٹک کی روئی فروخت کرنے والی انجمنیں ہیں ، بنگال میں جوٹ اور دھان فروخت کرنے والی ، صوبجات متوسط میں روئی کی آڑھتی دوکانیں اور پنجاب میں زرعی کمیشنی دکانیں ، انجمن ہائے فروخت کی دوسری کامیاب مثالیں ہیں ۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اس قسم کے اشتراک کی وسعت ابھی بہت قلیل ہے ابھی تک ہندوستان میں پیدائش امداد باہمی نے بالکل ترقی نہیں کی ، مزارعین کے نقطۂ نظر سے امداد باہمی کی جد وجہد کی دوسری اہم صورتیں بنگال کی آب پاشی اور پنجاب کی قطعات اراضی کو یکجا کرنے والی انجمنیں ہیں ۔

غیر زرعی امداد باہمی نے بھی بہت سی صورتیں اختیار کرلی ہیں صارفین کی تحریک جو بیشتر ملکوں میں بڑی اہم ہے یہاں بہت کمزور ہے ، پیدائش تحریک زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہے اور اس سمت میں جس سے آیندہ کے لیے زیادہ توقع بندھتی ہے وہ صناعوں میں امداد باہمی کا رواج ہے ۔ ان میں حسب توقع جولاہوں کی انجمنیں زیادہ ہیں ، بقیہ میں دھات اور چمڑے کا کام کرنے والے اور رنگریز وغیرہ شامل ہیں ۔ لیکن ان تمام انجمنوں میں ایک مشترک

۲۲۴

دشواری یہ ہے کہ منظم بازارات کا فقدان ہے اور ابھی تک اس جانب کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی گئی۔

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کی رفتار ترقی نیز اس کی مالی حالت دونوں بہت زیادہ قابل اطمینان ہیں، جس امداد پر یہ قائم ہے اور جس جذبے کے تحت اس کا آغاز کیا گیا اس کے متعلق اکثر شکوک کا اظہار کیا جاتا ہے، ابتدا ہی سے یہ تحریک ایسی ہے جو سرکاری سرپرستی اور رہنمائی میں پروان چڑھی اس تحریک میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی وہیں ہوئی جہاں ضلعے کے انتظامی عہدہ داروں نے اس کی ترقی میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ غیر سرکاری کفیل زیادہ تر بیرونی لوگ ہونا چاہییں۔ تحریک بمشکل خود بخود چلنے والی تھی۔ اور اس میں اصلاحی شکل کی قوت متوازنہ کی بھی کمی تھی بیشتر صورتوں میں ترقی فریب دہ تھی اور محکمے کی مسلسل نگرانی کی کمی کی وجہ سے یہ تقریباً بالکل ناکام تھی، جیسی صورت صوبجات متوسط میں آیندہ پیش آئی، حالیہ سالوں میں تقریباً ہر ایک صوبے داری مسجل نے اس امر کی رپورٹ پیش کی کہ اس کی مزید ترقی میں رکاوٹ کی ضرورت ہے تاکہ تحریک مجتمع ہوجائے اور کمزور انجمنیں خارج ہوجائیں، صوبہ واری رپورٹ[1] کا مندرجۂ ذیل اقتباس کاشتکار کے عام رجحان کی وضاحت کرتا ہے مسجل نے لکھا ہے کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ دکن کا متوسط کاشتکار ابھی اس دور سے نہیں گزرا جہاں کہ وہ انجمن کو محض ساہوکار کا ایک بدل تصور کرلے، اس نے پرانے زمانے میں جہاں تک ہوسکا ہمیشہ ساہوکار سے قرض لیا اور جب انجمن ہائے امداد باہمی وجود میں آئیں اور اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کو ارزاں شرح پر قرض مل سکتا ہے تو

[1] صوبۂ بمبئی میں انجمن ہائے امداد باہمی کی کارگزاری کی رپورٹ ۲۶-۱۹۲۷ء ص ۱۸۔

اس نے پہلے سے بھی زائد قرض لینا شروع کر دیا اور ہمیں سہولت بخش قرضہ بد ترین صورت میں نظر آتا ہے"۔ یہ ظاہر ہے کہ تحریک امداد باہمی کی تمام مشکلات میں مروجہ کساد بازاری کی وجہ سے اور زیادہ اضافہ ہو گیا[1] اور اس وقت یہ تحریک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس تحریک کی صورت سارے ہندوستان میں یکساں نہیں ہے، لیکن جب تک اس تحریک کی پرورش و حفاظت میں سرکاری عمل دخل ختم نہ ہو اس کے پورے فوائد سے استفادہ کرنا ممکن نہیں۔ ۲۲۵

تقسیم و انتشار اراضی کا مسئلہ کچھ دنوں سے خاص توجہ کا مرکز بن گیا ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات بھی فراہم ہو چکی ہیں۔ اور ان سب سے یہی پتا چلتا ہے کہ یہ خرابیاں عام ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم کو جو معلومات ملتی ہیں وہ زیادہ تر انفرادی گاؤں کی تحقیقات پر مبنی ہیں، اور ان سے کسی خاص مقام پر اس خرابی کی عمومیت کا اظہار نہیں ہوتا لیکن مفلس ترین اور خطرناک حصوں مثلاً بمبئی دکن، بندیل کھنڈ، مشرقی پنجاب اور صوبۂ مدراس کے اکثر حصوں میں صورت حال بڑی ابتر معلوم ہوتی ہے کونکن میں یہ غیر معقولیت کی انتہائی حدود پر پہنچ گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف علاقوں میں بڑا اختلاف ہے۔ انتشار اراضی کا مسئلہ اتنا زیادہ بنیادی نہیں ہے اور غالباً اس کا علاج آسانی سے ممکن ہے، پنجاب میں قطعات اراضی کو یکجا کرنے والی انجمن ہائے امداد باہمی نے اچھا خاصہ کام کیا اور نشر و اشاعت کی وجہ سے

---

[1] کساد بازاری نے اس تحریک کی ساری عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اس سے جو فوائد حاصل کرنے کی امید تھی وہ بالکل پوری نہ ہوئی، مجموعی حیثیت سے یہ تحریک بڑی ناکام رہی اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء کے عشرے میں بہت سی انجمنیں شکست ہو گئیں (مترجم)۔

رضا کارانہ طریق کے ذریعے زمینوں کو یکجا کرنے کا تھوڑا بہت کام بھی شروع ہو گیا ہے، حکومت کے قانون بھی امداد کر رہے ہیں اور صوبجات متوسط میں اراضی کو لازمی طور پر یکجا کرنے کا ایک قانون حال ہی میں نافذ ہوا۔ لیکن تقسیم اراضی کا مسئلہ زیادہ مشکل ہے اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے جو قانون بنائے جائیں ان میں بلا اراضی والے مزدوروں کو بڑھتے ہوئے طبقے کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے دراصل مسئلہ ایک ہے اور جو قوانین وراثت سے تعلق رکھنے کے بجائے اضافہ آبادی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے، مسلسل تقسیم اراضی آبادی کی کثیر تعداد کو زمین سے تعلق رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔[1] محض ملکیت کی اکائی کو متاثر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ خرابی زمینداری علاقوں میں جہاں ملکیت کی اکائی بڑی ہے اور رعیت واری علاقوں میں جہاں ملکیت اور کاشت کی اکائیاں ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں، دونوں جگہ یکساں ہے۔ ملکیت پر بندشیں عائد کر دینے سے محض رعایت یافتگان کا طبقہ پیدا ہو جائے گا اور صرف لگان پر زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔[1] بمبئی کے چھوٹے قطعات اراضی کے مسودے[2] ہی صرف ایسے قانون ہیں جنھوں نے قانونی طریقہ پر اس خرابی کو رفع کرنا چاہا۔ انھوں نے قوانین وراثت میں کسی تبدیلی کی حمایت نہیں کی۔ مشینوں کی موجودگی کے بعد اس اقل ترین رقبے کا اندازہ لگایا جس پر ایک الگ قطعے کی حیثیت سے نفع بخش طریقے پر کاشت ہو سکتی ہے۔ اور قدیم ٹکڑوں کی مزید تقسیم یا نئے ٹکڑوں کی پیدائش کو روکا جا سکتا ہے، اور یہ خاص طور پر اس طرح ہو کہ منتشر

---

[1] بنگال کے چھوٹے ملکی کاشتکار روز[...] کی حالت سے مقابلہ کیجیے۔ بحوالہٴ بالا صفحہ ۲۱، نیز ملاحظہ ہو زرعی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۱۳۶ پنجاب کی نہری نو آبادیوں میں تقسیم اراضی پر رکاوٹوں کے نتائج۔

[2] مقامی کونسل میں شدید مخالفت کی وجہ سے یہ مسودہ ملتوی کر دینا پڑا۔

ٹکڑوں پڑوسیوں کو شفع اور لگان پر اٹھا دینے کے حقوق دیے جائیں۔ اور نئے ٹکڑوں پر کاشت کی ممانعت ہو تاوقتیکہ آس پاس ایسے ٹکڑوں کا اتصال نہ ہو جن کا مجموعی رقبہ معاشی اکائی کے برابر ہو جائے' یہ طریقہ غالباً قوانین وراثت میں ترمیم کرنے کی لاحاصل کوشش سے زیادہ قابل ترجیح ہے' لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ٹکڑوں پر پڑوسیوں کو اس قسم کے حقوق دینے سے خود کاشت زمینداروں کے پاس سے ساہوکاروں یا بڑے مالکان اراضی کے پاس زمین منتقل ہونے کی تحریک کو زیادہ تقویت ملے گی۔ اور بنیادی طریقے پر قانون کی کامیابی کے تناسب کے ساتھ ہی ساتھ بلا اراضی والے ایک نئے مزدور طبقے کی تعداد بڑھ جائے گی۔ مسلسل تقسیم اراضی کی بدولت آبادی کے بڑے حصے کو زمین سے روزی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اگرچہ معیار زندگی گھٹ جاتا ہے اور کم روزگار کی مزمن حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ کاشت کی اکائی میں کامیاب اضافے سے ان لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے گی جو زمین پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ قطعی بے روزگاروں کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہو جائے گا" یہ گویا کہ کا ایک پرانا مسئلہ ہے کہ سب کے لیے نیم وقتی کام ہو یا کچھ لوگوں کو تخفیف کر کے باقی لوگوں کو پورے وقت مصروف رکھا جائے' لیکن جب تک ہم یہ نہ سوچ لیں کہ تخفیف شدگان کے ساتھ کیا کرنا ہے اس وقت تک اس مخصوص تجربے کو ہندوستان کی اہم ترین صنعت یعنی زراعت میں آزمانا بڑا خطرناک ہے۔

زیرِ تبصرہ دور میں نہروں سے سیراب ہونے والے رقبے میں کافی اضافہ ہوا' وہ بہت سی تجاویز جو آب پاشی کمیشن کی سفارشات پر شروع کی گئیں تھیں ان سالوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں اور مزید حوصلے مندانہ کاموں کو بھی ہاتھ میں لیا گیا۔ اصلاحات

کے آغاز کی وجہ سے آبپاشی کا مسئلہ صوبوں کے تفویض کردیا گیا، اور تبدیلی کے وقت آبپاشی کے کاموں کی تقسیم میں بھی ردو بدل ہوگیا اور وہ تمام ذرائع خواہ کلاں ہوں یا خورد اور جن کے اصل و آمدنی کے حسابات رکھے جاتے ہیں، اب ان کو صرف دو قسموں میں تقسیم کردیا گیا یعنی پیدآور اور غیر پیدآور (جو قدیم اصطلاح تامینی کے مقابلے میں زیادہ قطعی نہ تھی)۔

۲۲۷ اس دور میں جن کاموں کی تکمیل ہوئی ان میں بلا شبہہ سب سے زیادہ اہم، پنجاب کی سہ گونہ نہروں کی اسکیم تھی، یہ ایک بڑی وسیع اسکیم تھی جو تین نہروں کے ملے ہوئے سلسلے پر مشتمل تھی۔ ۱۹۱۵ء میں جھلم کی بالائی نہر جاری ہوئی، ۱۹۱۲ء میں چناب کی بالائی نہر کھلی اور ۱۹۱۳ء میں باری دوآب کی زیریں نہر کا اجرا ہوا۔ اگرچہ مختلف حصے کچھ پہلے کھل گئے مگر یہ سب ۱۹۱۷ء سے پہلے مکمل نہیں ہوئیں۔ تامینی کاموں میں گوداوری کی نہروں کا سلسلہ تھا جو ناسک اور احمد نگر کے اضلاع کو قحطوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ۱۹۱۹ء میں جاری ہوئیں، بمبئی دکن علاقے میں دو اسکیمیں حال ہی تیار ہوئیں یعنی بھنڈار دارا اور بھاٹ گر کے بند، جنھوں نے پرآورا اور نیرا کی نہروں کے سلسلے کو بہت زیادہ وسیع کردیا۔ ۱۹۱۶ء میں صوبجات متحدہ میں، ساردا نہروں کا سلسلہ جاری ہوا جس سے اودھ اور روہیل کھنڈ کے بڑے حصے کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم ہوجانے کی توقع ہے۔

آخری عشرے میں جو بڑے کام شروع کئے گیے ان میں سب سے زیادہ اہم سکھر بند کی اسکیم ہے جو آب پاشی کے کاموں میں سب سے بڑا کام بیان کیا جاتا ہے[1] اور وادی ستلج کی اسکیم ہے جس کی وجہ سے

---

[1] آب پاشی کا سالانہ تبصرہ ۱۹۲۱-۲۲ء صفحہ ۱۲۔

نہ صرف تحفظ ہوگا بلکہ جنوبی پنجاب کے اضلاع اور بیکانیر اور بھاؤ نگر کی ملحقہ ریاستوں کا ایک بڑا حصہ زیر کاشت آجائے گا۔ ۱۹۳۲ء میں سکھر کے بند کا خاص حصہ کھولا گیا، اور اس کے ذریعے سیرابی شروع ہوگئی ہے اگرچہ ابھی اس میں کئی سال درکار ہوں گے جبکہ اس اسکیم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ وادی ستلج کی تجویز کا کام مختلف مدارج میں ہوا اور اس کا آخری حصہ بھی ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوگیا۔ آب پاشی کی تیسری بڑی تجویز جو ابھی تعمیری منزل میں ہے، کاویری کا ذخیرۂ آب ہے جس کی خاص خصوصیت کاویری پر متّور کا بند ہے، اندازہ ہے کہ جب یہ اسکیم مکمل ہوجائے گی تو وہ کاویری کے ڈیلٹا میں پانی کی موجودہ رسد میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان کو بہتر بنانے کے علاوہ کافی نئے رقبوں کو بھی سیراب کرے گی[1]۔

موجودہ صدی میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ تقریباً تمام ان بڑے کاموں میں ہوئی جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی جب آب پاشی کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی تھی اس وقت حکومت کے ذرائع سے سیراب ہونے والے رقبے کی مقدار ۱۸۰ لاکھ ایکڑ تھی جو اب بڑھ کر تقریباً تین سو لاکھ ایکڑ ہوگئی۔ اور حسب معمول یہ بھی توقع کرنا چاہئے کہ اس توسیع سے صرف مخصوص حصوں ہی نے فائدہ اٹھایا، ۲۲۸ چنانچہ اس کی وضاحت مندرجۂ ذیل ایکڑی اعداد سے ہوجائے گی کہ مختلف صوبوں میں حکومت کے تمام ذرائع سے

---

[1] ممالک محروسہ کا نظام ساگر بھی گزشتہ عشرے کا ایک اہم کام ہے (مترجم)۔

سیراب ہونے والے رقبے کا اوسط ۳۰-۱۹۲۷ء کے تین سالوں میں کیا تھا[1] یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کے ذرائع سے سیراب ہونے والے کل رقبے کا ۹۲ فی صدی سے زائد حصہ ان پانچ صوبوں میں ہے نہری ذرائع کو صرف مخصوص و موافق حالات کے تحت ہی ترقی دی جاسکتی ہے اور ملک کے بڑے حصے کے لیے آبپاشی کے خورد ذرایع ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، یہ توقع کی گئی تھی کہ جب آبپاشی صوبوں کے تحت آجائے گی تو خورد ذرائع پر کافی توجہ کی جائے گی، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوا۔ بعض منتشر کوششیں کی گئیں لیکن ان پر زور نہیں دیا جاسکتا مثلاً حکومت بمبئی نے ایک خاص افسر اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ ناسک اور خاندیس کے اضلاع کے بندوں کی دیکھ بھال کرے۔ اور زرعی کمیشن نے جب اس رائے کا اظہار کیا کہ خورد ذرائع کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا تھا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے گزشتہ زمانے میں ان پر وہ توجہ نہ کی جس کے یہ مستحق تھے۔

زرعی کمیشن نے جو اعداد دیے ہیں[2] ان سے یہ معلوم ہوگا کہ آج بھی کنوؤں سے سیراب ہونے والے رقبے میں ۳-۱۹۰۲ء کے مقابلہ میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ اگر کچھ ہوا تو حالیہ سالوں میں اس رقبے میں تخفیف ہی کا رجحان نظر آتا ہے۔ زرعی کمیشن نے جزوی طور پر ان اعداد کی وضاحت اس طرح کی کہ ان کنوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو نہری ذرائع کی توسیع کی وجہ سے بعض حصوں مثلاً

[1] کل برطانوی ہند	۲۹،۹۵۴	(ہزار ایکڑ)	سندھ	۳،۶۴۰ (ہزار ایکڑ)	
پنجاب	۱۱،۲۰۱	〃	صوبجات متحدہ	۳،۵۸۰	〃
برما	۷،۲۷۸	〃	مدراس	۱،۹۹۴	〃
[2] ضمیمہ ہفتم					

پنجاب میں نا قابل استعمال ہو گئے لیکن اس کے باوجود بھی ان میں کوئی خاص ترقی نظر نہیں آتی۔ حال ہی میں زرعی محکمے نے سطحی نو آری کنوؤں کی تعمیر اور ان کی گنجائش بڑھانے کے لیے پانی کھینچنے والے نلوں کی تنصیب کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ لیکن ان تجربات کے نتائج کچھ زیادہ وسیع نہیں ہیں اور کنوؤں سے آبپاشی کا کام، تالاب بند وغیرہ کے مقابلے میں ابھی تیزی سے کرنا باقی ہے۔ جیسا کہ دوسرے محکموں میں ہوتا ہے آبپاشی کے سلسلے میں بھی اگر حکومت نے بڑے کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لینے کی قابلیت دکھائی تو چھوٹی اور ۲۲۹ مقامی کوششوں کو بالکل نظر انداز کر دیا حالانکہ لوگوں کی بہبودی کے لیے وہ بھی کچھ کم اہم نہ تھیں۔

فصل دوم

صنعتی ترقی

سب سے پہلے زیر تبصرہ دور کی عام معاشی خصوصیات کا اظہار ضروری ہے، جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی بہتیری صنعتوں مثلاً روئی، کوئلہ مغنیسہ وغیرہ کی ترقی رک گئی، مگر بعض دوسری صنعتوں میں یہ چیز بالکل محسوس نہ ہوئی، چنانچہ چائے کی صورت یہی رہی۔ لیکن یہ رکاوٹ عارضی تھی اور جیسے ہی عام قیمتوں میں اضافہ شروع ہوا تو تمام صنعتوں کے منافعے بڑھنے لگے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ برآمدی صنعتوں میں جہازوں اور بعض صورتوں میں ریلوں کی قلت کی وجہ سے مسلسل دشواریاں پیش آئیں، لیکن جہازوں کی قلت معدنوں یا صنعتوں میں اتنی محسوس نہیں ہوئی جتنی کہ زرعی پیداواروں میں ہوئی کیونکہ خصوصیت سے اول الذکر چیزوں کی مانگ بھی جنگ کے زمانے میں کافی بڑھ گئی تھی، اور ان کی حیثیت بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ جنگ کے زمانے کی ایک دوسری خاص خصوصیت یہ رہی کہ سارے متحارب ملکوں میں ہر قسم کی معاشی جدوجہد پر حکومت کی نگرانی قائم ہو گئی، اس نے مختلف صنعتوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا بعض

مصنوعات کی برآمد کی قطعی ممانعت کردی گئی اور حکومت نے بڑی مقداروں میں معینہ قیمت پر خریداری شروع کردی۔ کوئلے کی برآمد کی ممانعت اور حکومت کی خریداری کی وجہ سے اس بات کی ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ اس کی رسد اور مختلف صنعتوں میں اس کی تقسیم پر کوئلے کے عہدہ دار نقل وحمل کے توسط سے نگرانی قائم کی جائے۔ حکومت کی بڑی خریداریاں چند دوسری صنعتوں مثلاً جوٹ، مغنیسہ، ابرک اور چائے کی ترقی میں مزید اضافے کا باعث ہوئیں۔ زرعی اشیا پیدا کرنے والوں اور صنعتی چیزیں بنانے والوں میں فرق بہت واضح ہے۔ زرعی اشیا پیدا کرنے والوں کے لیے جنگ کا مطلب یہ تھا کہ ان کے پرانے برآمدی بازار ختم ہوگئے صنعتوں میں اس کا مطلب روئی اور کوئلے کے لیے بیرونی مسابقت کا خاتمہ، یا جوٹ مغنیسہ اور دوسری معدنی پیداواروں کے لیے جو ذخائرِ حرب کے واسطے مفید تھیں ایک مخصوص طلب کا پیدا ہو جانا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں مصنوعات کی قیمت میں بحیثیت مجموعی اضافہ ہوگیا اس کے برخلاف خام پیداواروں کی قیمت میں بہت خفیف اضافہ ہوا اور اجرتیں بھی بہت تھوڑی بڑھیں۔ مزید براں یہ کہ مشینوں اور دوسرے سامان کی درآمد میں مشکلات کی وجہ سے تمام صنعتوں میں موجودہ پیدا کنندوں اور مالکوں کی حیثیت مضبوط ہوگئی اور خاص طور پر جنگ کے آخری سالوں میں انھوں نے خوب منافع کمایا۔ ۲۳۰ لڑائی کے اختتام کے فوراً بعد ہی ہر قسم کے سامان کی طلب میں اضافہ ہوگیا۔ قیمتیں تیزی سے بڑھیں اور ۱۹۱۸ء کے ختم ہوتے ہی تھوڑے عرصے کے لیے غیر معمولی صنعتی خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ ساتھ ہی فوراً ردِعمل بھی شروع ہوگیا اور ۱۹۲۱ء شدید تجارتی سرد بازاری کا سال رہا۔ تجارتی جدوجہد میں اس قدر تخفیف ہوگئی کہ اس سال ریلوں کو بھی اپنے منافع میں اس کے اثرات محسوس کرنا پڑے بیشتر صنعتوں

میں یہ ردِ عمل ۱۹۲۰ء کے وسط سے محسوس ہونے لگا، لیکن روئی کی صنعت میں یہ ۱۹۲۲ء سے پہلے محسوس نہیں ہوا۔ دراصل عجیب وغریب صنعتی حالات خود ہی غیر معمولی گرم بازاری اور اس کے بعد شدید سرد بازاری کے ذمہ دار رہے، لیکن ان دونوں تحریکوں کے اثرات جنگ کے بعد والے دور میں مبادلے کی سخت دشواریوں سے اور زیادہ شدید ہو گئے۔

تغیرات مبادلہ اس دور کے معاشی واقعات میں برابر ایک اہم حصہ لیتے رہے، ۱۹۱۶ء میں حکومت ہند کے لیے معیار مبادلہ طلا اور ۱۶ پنس والی پرانی شرح کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ چاندی کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے روپے کی فلزی قیمت ۱۶ پنس سے بڑھ گئی۔ اور اگست ۱۹۱۷ء میں حکومت نے اس معیار کو قایم رکھنے کی کوشش ترک کر دی۔ اس کے بعد سے روپے کی شرح مبادلہ کا انحصار چاندی کی قیمت کے تغیرات پر منحصر ہو گیا، اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک شرح مبادلہ میں کافی اضافہ ہوا، مگر ہندوستان کی تجارت خارجہ پر اس کا کوئی خراب اثر نہیں پڑا ہندوستان کی اہم ترین پیداواروں کی قیمتیں جو جنگ کے زمانے میں گر گئیں تھیں وہ ۱۹۱۹ء میں کافی بڑھ گئیں، ۱۹-۱۹۱۸ء کا قحط، افراط زر اور تجارت کی فراوانی یہ سب قیمتوں میں اضافے کا باعث ہوئیں، شرح مبادلہ جو اگست ۱۹۱۷ء میں ۱۷ پنس تھی اپریل ۱۹۱۸ء میں ۱۸ پنس ہو گئی، شرح میں خفیف اضافے کے باوجود ۱۹-۱۹۱۸ء میں توازن تجارت موافق رہا۔ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں بیرونی ملکوں میں ہندوستانی پیداواروں کی مانگ تیزی سے شروع ہوئی، ہندوستان میں قیمتوں کی زیادتی اور شرح مبادلہ غیر موافق رہنے کے باوجود ۲۰-۱۹۱۹ء میں برآمد کے اعداد بہت زیادہ رہے، خصوصیت سے یہ خام پیداواروں کی صورت میں ہوا، جن کی یورپ اور دوسرے

مقامات کی مختلف صنعتوں میں کافی مانگ تھی، اور ان میں تجارتی گرم بازاری پیدا ہوگئی مثلاً چمڑا اور کھالیں، خام جوٹ، روغنی بیج، رنگائی اور دباغت کے مسالے، لاک وغیرہ، جوٹ کی مصنوعات کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا اور چاندی کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے چین کے سوت کا بازار بھی مستقل رہا۔ درآمد میں اس کے متوازی اضافہ نہیں ہوا کیونکہ مصنوعات یا وہ سامان جو ہندوستان کی درآمد کا بڑا حصہ ہوتا تھا اس کے حاصل ہونے میں مشکلات تھیں، سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء ساری دنیا میں بڑی تجارتی جد وجہد کا سال رہا۔ وقتی رجائیت، زمانۂ جنگ کی اعلیٰ شرح منافع قائم رہنے کی امید، قیمتوں کی سطح میں اضافہ، اور جنگ کے زمانے کی غیر تسکین پذیر احتیاجات کی وجہ سے طلب میں کثیر اضافے نے ساری دنیا کے آجروں کو ترغیب دی کہ وہ اپنی پیداواروں میں اضافہ، اور کاروبار کو وسیع کردیں۔ نئی کمپنیاں قائم ہوئیں اور مشینوں اور دوسرے سامان کے واسطے ساری دنیا سے بیرونی ملکوں اور بالخصوص انگلستان کو بڑی تعداد میں فرمائشات حاصل ہوئیں، اور وہ ملک جو برطانیہ عظمیٰ کی طرح خاص رسد کرنے والے تھے اس بڑھی ہوئی طلب کو فوراً پورا کرنے سے قاصر رہے اور طلب پوری نہ ہونے کا یہ مطلب تھا کہ فرمائشات دوچند ہوگئیں، اور ان میں بہت زیادہ تخمین سے کام لیا جانے لگا۔ ہندوستان کی صورت میں یہ بات اس لیے اور زیادہ شدید ہوگئی کہ شرح مبادلہ میں برابر اضافہ ہو رہا تھا، جس نے درآمد کو مزید تقویت پہنچائی۔ شرح مبادلہ مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں ۱۸ پنس سے بڑھ کر ستمبر سنہ ۱۹۱۹ء میں ۲ شلنگ ہوگئی اور اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں ۲ شلنگ ۴ پنس کی انتہائی حد پر پہنچ گئی۔ اعلیٰ شرح مبادلہ نے درآمد کرنے والوں کی ہمت افزائی کی، اور ان کو فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں حکومت کے بیبنگٹن اسمتھ کمیٹی کی ۲ شلنگ

۲۳۱

فی روپیہ والی سفارشات منظور کر لینے سے اس شرح میں تسلسل کے آثار نظر آنے لگے۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں طلب پوری نہ کر سکنے کی صلاحیت کی وجہ سے درآمد کی مقدار کم رہی اور یہ مالی سال ہندوستان کے لیے قابل لحاظ متوازن ادائیوں کی صورت میں ختم ہوا لیکن اپریل ۱۹۲۰ء میں ساری دنیا میں گرم بازاری کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ ۲۰-۱۹۱۹ء کی گرم بازاری در اصل قیمتوں کی گرم بازاری تھی، جو دنیا کے سارے ملکوں کی طلب کی بحالی پر منحصر تھی اور جس کو حکومت کے افراطِ زر والے مسلک سے مزید تقویت ہوئی۔ نیز اس کو اس وجہ سے اور امداد پہنچی کہ جنگ کی وجہ سے دنیا کی پیدائشی صلاحیت میں بہت کمی آگئی تھی۔ لیکن جب یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں تو تمام ملکوں میں سیلاب مخالف سمت میں بہنا شروع ہوا اور ۱۹۱۹ء میں آغاز جاپان سے ہوا۔ قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اجرتوں اور دوسرے مصارف میں اضافہ شروع ہو گیا تھا اور برِاعظم یورپ اپنی صنعتوں کے واسطے کسی بڑی مقدار میں خام مال فراہم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ ابھی تک یہ صنعتیں بحال نہ ہوئیں تھیں، ۱۹۲۰ء کے ابتدائی مہینوں میں انگلستان کے وزیر خزانہ نے اپنے ہاں قیمتوں کے اضافے کو روکنا شروع کر دیا اور خوش حالی کے مختصر دور کا خاتمہ ہو گیا۔ جس طرح کہ گزشتہ سال مبادلے کی وجہ سے گرم بازاری میں اضافہ ہوا تھا اسی طرح اس سال ہندوستان میں مبادلے کی دشواریوں کی وجہ سے صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی۔ چاندی کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے شرح مبادلہ میں خاص طور پر اضافہ ہو رہا تھا فروری ۱۹۲۰ء میں یہ بیشترین نقطے پر پہنچ گئی اور اس کے بعد اس میں تخفیف ہونا شروع ہوئی، اور اس نے قدرتی طور پر مبادلے کو متاثر کیا، اور اپریل ۱۹۲۰ء سے روپے کی شرح مبادلہ تیزی سے گھٹنے لگی دسمبر ۱۹۲۰ء تک شرح ۱۸ پنس پر آگئی اور مئی ۱۹۲۱ء میں ۱۵ پنس کی کمترین حد

۲۴۲

پر پہنچ گئی۔ ہندوستان کے پرانے یوروپی گاہکوں کی عدم خریداری کی صلاحیت، نیز گزشتہ سال کے اعلیٰ شرح کے اثرات اور ۱۹۲۰-۲۱ء کے نامساعد زرعی حالات، ان سب نے مل کر برآمد کی مقدار کو کم کردیا۔ اس کے برخلاف جو فرمائشیں گزشتہ سال کی گئی تھیں وہ اب آرہی تھیں چنانچہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں ایسی چیزوں مثلاً آہنی سامان، آلات، اوزار، مشینیں، کرنیوں کا سامان، فلزائیں، موٹریں، سائیکلیں، ریلوں کا سازوسامان اور ڈبوں کی درآمد بیشترین حد پر پہنچ گئی اور ۱۹۲۱-۲۲ء تک اس کا معیار برقرار رہا (مشینوں اور کرنیوں کے سامان کی مقدار ۱۹۲۱-۲۲ء میں ۱۹۲۰-۲۱ء سے زیادہ بڑھ گئی تھی) یہ درآمد دراصل گزشتہ گرم بازاری کے زمانے کی فرمائشوں کا نتیجہ تھی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ صنعتوں کی پیدائشی قوت اس وقت بڑھی جبکہ ان کی طلب گر رہی تھی ۱۹۲۰-۲۱ء کی درآمد میں سوتی کپڑے کے اعداد خاص طور پر قابل لحاظ ہیں لنکاشائر سے آنے والے سوتی کپڑوں کی درآمد جنگ کے زمانے میں بہت کم ہوگئی اور قبل از جنگ والے معیار سے گر گئی تھی لیکن جنگ کے اختتام پر طلب پھر تیز ہوگئی اور درآمد کرنے والوں نے اعلیٰ شرح مبادلہ سے فائدہ اٹھاکر باہر بہت زیادہ فرمائشات بھیجدیں، اعلیٰ قیمتوں کا یہ سامان جس کی فرمائش گرم بازاری اور موافق شرح مبادلہ کے تحت ہوئی وہ ۱۹۲۰ء میں بڑی مقدار میں آنا شروع ہوا۔ لیکن اب شرح مبادلہ تخفیف کی طرف مائل تھی، اور خوش حالی غائب ہو چکی تھی اور درآمد کرنے والوں نے اپنے آپ کو شدید مشکلات میں گھرا ہوا پایا۔ یہ صورت دسمبر ۱۹۲۰ء میں ظاہر ہوئی جبکہ بمبئی کے کپڑوں کی دیسی انجمن نے طے کیا کہ کوئی درآمد کنندہ ۲ شلنگ فی روپے کی شرح سے کم پر معاہدہ منظور نہیں کرے گا۔ یہ دراصل معاہدی ذمہ داریوں سے سبکدوشی تھی اور بمبئی کے تاجروں کی تقلید فوراً ہی دہلی، امرتسر اور دوسرے مقامات کے کپڑا درآمد کرنے والوں نے شروع کردی اور ۲۳۳

اس اقدام نے ہندوستان کے اکثر تجارتی مرکزوں کی بے اعتمادی میں اضافہ کر دیا۔

اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی معاشی بہتری کا انحصار صنعتی دور کے بجائے زرعی موسم پر ہے سنہ ۱۹۰۵ء میں روئی اور جائے کی صنعتوں کے واقعات ہندوستان میں جدید قسم کی گرم و سرد بازاری کی پہلی مثال پیش کرتے ہیں، ہندوستان کی پیدایشی صنعت اس قدر مختصر اور منتشر ہے کہ ملک کی عام صنعتوں پر اس کے متوازی عام اثرات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ سب سے پہلی صنعتی تحریک جو کل ہند حیثیت رکھتی تھی وہ رجائیت کی ایک لہر تھی جو ہندوستانی صنعت میں سنہ ۱۹۱۰ء میں نظر آتی ہے اور سودیشی تحریک بڑی حد تک اسی کا نتیجہ تھی۔ اس زمانے میں مختلف صنعتی کام شروع کرنے اور تجارت و صنعت کی مالی امداد کرنے کے واسطے مختلف تجاویز سوچی گئیں۔ اس زمانے میں جو بنک قائم ہوئے وہ عموماً اور پنجاب و صوبۂ بمبئی میں خصوصاً ناکام رہے اور سنہ ۱۹۱۳ء کی یہ ایک خاص خصوصیت تھی، ان ناکامیوں سے جس رجحان کا پتا چلتا ہے وہ محض مالی تھا اور اس کا ملک کی صنعتوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں یا اس کے بعد جو متفرق کاروبار جاری ہوئے وہ بہت جلد ناکام ہو گئے، بہر حال جنگ نے ہندوستانی صنعت کی ترقی کے لیے عام طور پر نئے اور مساعد حالات پیدا کئے اور جنگ کے اختتام پر ہر چیز میں گرم بازاری کے آثار نظر آتے تھے۔

اس گرم بازاری کی نظیر ملنا قطعاً ناممکن ہے۔ کمپنیوں کے قیام کے اعداد سے اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء میں ۹۰۵ نئی کمپنیاں جن کا مجوزہ سرمایہ ۲۷۵ کروڑ تھا اور سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ۹۶۵ کمپنیاں جن کا مجموعی سرمایہ ۱۴۶ کروڑ روپے تھا قائم ہوئیں سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں

ہندوستان میں کل رجسٹری شدہ کمپنیوں کی تعداد ۲،۶۸۱ اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۷۶ کرور کے قریب تھا۔ ۱۹۱۸-۱۹ء میں ان کی تعداد ۲،۷۱۳ اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۱۰۶ کرور روپے تھا۔ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ان کی تعداد ۴،۷۰۱ اور ادا شدہ سرمایہ ۲۲۳ کرور روپے تھا۔[1] اعداد ایسے ہی ہیں جن کی توقع کی جا سکتی تھی، جنگ کے زمانے میں بہت ہی کم کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن موجودہ کمپنیوں کے کاروباری سرمائے میں قابل لحاظ اضافہ ہو گیا۔ یعنی جنگ کے تین سالوں میں کمپنیوں کی تعداد میں ۷۵ فی صدی کا اضافہ ہوا تو ادا شدہ سرمایہ دگنے سے زائد ہو گیا۔ لیکن اس کا بڑا حصہ سرمایۂ مشترک کے کامیاب کاروباری حوصلے پر منحصر نہ تھا چونکہ اس وقت غیر معمولی امید افزا حالات پھیلے ہوئے تھے اس لیے لوگوں نے خوب حصے خریدے، ساتھ ہی ساتھ اکثر کاروبار میں لاپروائی اور فریب دہی سے بھی کام لیا گیا۔ صنعتی تمسکات اور خصوصاً جوٹ اور روئی کی گرنیوں مغنیسہ اور سیمنٹ کی کمپنیوں کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی، لوگوں کے اصل مشغول کرنے کا اندازہ اس نصیبے سے ہو جاتا ہے کہ ٹاٹا بنک کے وہ حصے جن کی اصل قیمت پندرہ روپے تھی اس وقت ۹۰ روپے میں فروخت ہو رہے تھے جبکہ ذخیرہ محفوظ بالکل نہ تھا۔ ٹاٹا کی تیل کی گرنی کے سو روپے والے قیمت متعارفہ کے حصے کی قیمت مشین کی تنصیب سے قبل ہی ۵۷۵ روپے لگائی جا رہی تھی۔[2] دراصل اس کی وجہ اصل مشغول کرنے والوں کے ہاں ٹاٹا کا غیر معمولی اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے اکثر اوقات خفیہ سازشیں بھی ہو رہی تھیں، جس نے مقامی دلالان حصص کی انجمن کو اپنی شہادت میں یہ کہنے پر

۲۳۴

[1] یہ اعداد صرف برطانوی ہند کے ہیں۔

[2] بمبئی اسٹاک اکسچینج کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، ضمیمہ پنجم (۱۹۲۴ء)۔

مجبور کیا کہ " بہرحال یہ خواہش کی جاتی ہے کہ تنظیما اور کمپنیوں کے گماشتے، جن کمپنیوں کا انتظام کرتے ہیں اس میں انھیں نجین سے کام لینے میں باز رہنا چاہیے"[1] اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں عام طور پر گرم بازاری کا عروج رہا۔ لیکن پھر یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور اس کے بعد اکثر صنعتوں میں کساد بازاری کا دور شروع ہوا اور تجارت میں ایک طویل عرصے تک بے اعتمادی قائم رہی۔

تقریباً صحیح طریقے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کساد بازاری موجودہ زمانے تک ختم نہیں ہوئی، ہندوستان میں دوسرے ملکوں کی طرح سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد خوش حالی کا کوئی دور نہیں آیا اور خصوصاً زر کی حکمت عملی کی وجہ سے قیمتوں کے معیار میں اضافہ نہیں ہوا، قیمتیں گری ہوئی رہیں اور مزارعین کی حالت خراب رہی۔ سنہ ۱۹۲۷ء کے اختتام تک خوش حالی میں بحالی کے آثار نظر آنے لگے تھے لیکن عالمی ابتری کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۹ء کے آخر میں صورت حال پھر خراب ہوگئی۔ اگرچہ مزارعین بہت زیادہ متاثر ہوئے لیکن اکثر صنعتوں میں کساد بازاری کے اثرات شدت سے محسوس کیے گئے قدرتی طور پر تمام معاشی جدوجہد کی تاریخ یکساں نہیں ہے مثلاً چائے جنگ کے بعد والی کساد بازاری سے بہت جلد سنبھل گئی اور سنہ ۱۹۲۹ء تک اس کی حالت بھیاک رہی، لیکن روئی میں گرم بازاری زیادہ عرصے تک قائم رہی اور اسی طرح اس کے بعد آنے والی سرد بازاری کا دور بھی طویل رہا۔

جنگ کے بعد والے کساد بازاری کے دور کو طویل کرنے کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت کے مسلک زر کے سر ہے۔ روپیہ جو دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں قبل از جنگ والے معیار سے نیچے

---

[1] حوالہ گزشتہ۔

اتر گیا تھا وہ اس سطح پر ابتدائے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء کے اوائل تک رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کیا اور ستمبر ۱۹۲۴ء میں شرح ۱۸ پنس (اسٹرلنگ) پر پہنچ گئی جو قبل از جنگ والی ۱۶ پنس (طلا) کے مساوی تھی۔ بڑھوتری کا رجحان برابر اسٹرلنگ کے متوازی رہا اور اس طرح اگرچہ ستمبر ۱۹۲۴ء سے اپریل ۱۹۲۵ء تک شرح ۱۸ پنس پر قائم رہی لیکن آخر الذکر تاریخ کے بعد جب سلطنت متحدہ میں معیار طلا کو اختیار کیا گیا تو در اصل قدر مبادلہ ۱۸ پنس سے بڑھ گئی مسلک زر کے اثرات ان تمام سالوں میں اور اس کے بعد بھی نظر آتے ہیں، تقریباً ہر صنعت میں یا ٹیرف بورڈ کی ہر تحقیقات میں اعلیٰ شرح مبادلہ کے اثرات کی شکایت کی گئی ہے حکومت کا قبل از جنگ والے دور کے مقابلے میں مساوات زر کو زائد شرح پر رکھنے کے اصرار نے در اصل جنگ کے بعد والی کساد بازاری کے دور کو طویل کر دیا۔ ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری کے اثرات ہندوستان سے باہر کی پیداوار ہیں اور اس کی رفتار سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کے معاشی حالات کا کس طرح دنیا کے دوسرے ممالک کی صنعتی اور تجارتی جد و جہد سے قریبی تعلق ہو گیا ہے۔

ہندوستان کی روئی کی صنعت بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں خوش حالی رہی اور اس کی ترقی جنگ کے زمانے تک جاری رہی، جنگ کے اختتام پر صنعت کی حالت کچھ اچھی نہ تھی کیونکہ ایک تو یہ ۱۹۱۳ء کے بینکوں کی ناکامیوں کے اثرات سے ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی، پھر جنگ کا ابتدائی سال کتائی اور بنائی دونوں شعبوں کے لیے بہت زیادہ غیر موافق رہا۔ بہر حال کساد بازاری آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہو گئی اور ۱۹۱۶ء کے قریب یہ صنعت خوشحال

دور میں تھی۔ کرایوں کی زیادتی اور ہندوستان میں اس کی درآمد پر زائد محاصل آمدنی عائد ہو جانے کی وجہ سے لنکا شائر کی صنعت مشکلات میں تھی، اس طرح ہندوستانی صنعت کی زائد قیمت اور بیرونی مسابقت کی کمی کی وجہ سے ملکی بازار میں اچھی خاصی کھپت ہونے لگی، اس کے ساتھ بعض ملحقہ ممالک مثلاً ایران، عراق، عرب اور شرقی افریقہ وغیرہ میں ہندوستانی مصنوعات کا بازار بڑھ رہا تھا۔ مختلف دشواریاں ضرور تھیں مثلاً سامان اور رنگوں وغیرہ کی قیمت بڑھ گئی تھی یا کوئلہ حاصل کرنے میں دقت تھی، لیکن اجرتوں میں اضافے کا کوئی رجحان نہ تھا اور مجموعی حیثیت سے لاگت نے سوت اور کپڑے کی قیمتوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیا، دوسری صنعتوں میں مشینیں وغیرہ نہ ملنے کی دقتوں کی وجہ سے گرنیوں کی تعداد میں زیادہ اضافہ نہ ہو سکا۔ زائد طلب پوری کرنے کے لیے کپڑوں کی پیدائش خاص طور پر بڑھ گئی، تکلوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہوا، اس کے برخلاف ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کرگھوں کی تعداد میں تقریباً ۱۵ فیصدی اور بنے ہوئے سامان کی پیدائش میں ۴۶ فی صدی کا اضافہ ہو گیا[1]۔ جنگ سے قبل ہندوستانی سوت کی برآمد بالکل جمودی حالت میں تھی اور جنگ کے زمانے میں نقل و حمل کی دشواریوں، جاپانی مسابقت اور چین میں کتائی کی نئی صنعت کے قیام سے ہندوستانی سوت کے خاص بازار یعنی چین میں تخفیف ہو گئی جس کی وجہ سے سوت کی برآمد میں بڑی کمی ہو گئی یہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ چونکہ خود ہندوستان میں سوت کی اچھی خاصی مانگ پیدا ہو گئی تھی اس وجہ سے ہندوستانی پیدا کنندگان نے بیرونی بازار کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے باوجود جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی سوت کی پیداوار میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا، کیونکہ ہندوستانی گرنیاں کپڑوں کی تیاری بڑے پیمانے پر کر رہی تھیں۔

[1] کوبرو، ہندوستان کے کپڑوں کی تجارت (۱۹۲۱ء)۔

کپڑوں کی درآمد کا سالانہ اوسط قبل از جنگ والے پنجسالہ دور میں ۲،۶۳۲.۰ لاکھ گز تھا جو جنگ کے زمانے میں گر کر ۱،۴۱۸.۰ لاکھ گز ہو گیا۔ درآمد عمدہ قسم کے کپڑوں کی ہوا کرتی تھی اور ان میں تخفیف کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی صنعت میں اچھے قسم کا کپڑا تیار کرنے کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ جنگ سے قبل کے مقابلے میں جنگ کے زمانے میں رنگین کپڑوں کی پیدائش میں ۵۰ فی صدی سے زائد اضافہ ہوا پہلے دور کی خاص خصوصیات یہ تھیں کہ سوت اور دھاگے کی پیدائش کے مقابلے میں پارچہ تیار کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی جانے لگی اور جنگ کے زمانے میں اچھے قسم کے کپڑے تیار ہونے لگے۔ اچھے قسم کے کپڑوں کی پیدائش کی توضیح اس طرح ہوتی ہے کہ اب ہندوستانی کرنیوں نے اچھے قسم کا سوت اور دھاگا تیار کرنا شروع کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں ایک سوت سے ۲۰ سوت والی لچھیوں میں قبل از جنگ کے مقابل کمی ہو گئی لیکن اس کے برخلاف اعلیٰ اقسام یعنی ۲۱ سوت سے ۳۰ سوت، ۳۱ سوت سے ۴۰ سوت، اور ۴۰ سوت سے زائد والی لچھیوں کی پیدائش میں کافی اضافہ ہوا لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ہندوستان میں بہتر قسم کے کپڑے کا صرف بڑھ گیا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں اور جنگ کے پانچ سال بعد کپڑے کا مجموعی صرف اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں صرف ہونے والے کپڑوں کی اقسام دونوں جنگ سے پہلے کے مقابلے میں کمتر تھیں، لیکن جنگ سے پہلے اعلیٰ قسم کے کپڑوں کی ساری طلب درآمد سے پوری ہوتی تھی جو قابل لحاظ تھی۔ جنگ کے زمانے میں درآمد شدت سے رک گئی۔ اور غیر تسکین پذیر احتیاجات کو ہندوستانی پیدائش سے پورا کرنا ضروری ہوا، اور اس کے لیے ایک طرف تو موٹے قسم کے کپڑے کی پیدائش شروع ہوئی اور دوسری طرف بہتر اقسام کی پیدائش کا تناسب بڑھ گیا۔ اگرچہ جنگ کے زمانے میں ۲۰ سوت والی لچھیوں کی اوسط پیدائش قبل از جنگ والے معیار سے کم تھی لیکن سوت کی برآمد میں اس سے بھی زیادہ کمی ہو گئی تھی اور ان لچھیوں کا وہ سوت جو ملک میں رہتا تھا اس کی مقدار قبل از جنگ والے معیار سے بلند تھی۔

۲۳۷

جنگ کے بعد والی گرم بازاری دوسری صنعتوں کے مقابلے میں روئی کی صنعت میں زیادہ طویل تھی، روئی کی صنعت میں اس گرم بازاری کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ کپڑے کی مانگ بڑھی ہوئی تھی، قبل از جنگ والے پانچ سالوں میں، دستی کرگھے کی مصنوعات کو چھوڑ کر ہندوستان میں کپڑے کے صرف کا اوسط تقریباً ۳۵،۶۷۵ لاکھ گز تھا اور جنگ کے زمانے میں یہ اعداد ۳۰،۲۴۵ لاکھ گز رہے، یہ باور کرنے کے بھی اسباب موجود ہیں کہ جنگ کے زمانے میں دستی کرگھوں کی مجموعی تعداد میں کمی ہو گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد طلب بہت بڑھ گئی، دوسری اشیا کے ساتھ ہی ساتھ کپڑے کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو گیا، ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے تین سالوں میں سوتی مصنوعات کی قیمتوں کا سالانہ اوسط ۱۹۱۴ء کی قیمتوں کے مقابلے میں تگنا تھا، اس کے برخلاف اُجرتیں پیچھے رہ گئیں اور ۱۹۲۰ء تک ان میں کوئی قابلِ لحاظ اضافہ نہیں ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہی درآمد کی مسابقت تیز ہو جاتی مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مخصوص حالات کی وجہ سے یہ شدت ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک بالکل محسوس نہ کی جا سکی۔ ہندوستان میں لنکا شائر اور جاپان ہی سے سوتی پارچہ درآمد کیا جاتا ہے لیکن اس بحث کی تفصیل میں پڑنا غیر ضروری ہے کہ یہ درآمد کس حد تک ہندوستانی سامان سے مسابقت کرتی تھی، جنگ سے قبل انگلستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے پارچے کی درآمد برائے نام تھی اور یہ باور کیا جاتا تھا کہ انگریزی اور ہندوستانی کرنیوں کی پیدائش ایک دوسرے سے کسی بڑی حد تک متصادم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی توجہ زیادہ تر موٹے قسم کا سوت اور کپڑوں کی پیدائش کی طرف تھی اور لنکا شائر ہندوستان میں اچھے قسم کے کپڑے درآمد کیا کرتا تھا۔ مسابقت کا اندازہ بعض وقت صرف ۲ فی صدی کے قریب لگایا گیا، لیکن ہندوستانی محکمۂ کروڑگیری کے ایک عہدہ دار کو تحقیقات سے مسابقت کا اندازہ ۲۶ فی صدی کے قریب تھا، آخر الذکر کو تخمینے سے زائد خیال کیا جاتا تھا۔[1]

۳۸

لہ اِنس کِف، ہندوستان میں برطانوی تجارت پر تبصرہ صفحہ ۹۷ (۱۹۲۱ء)۔

ٹیرف بورڈ سنہ ۱۹۲۶ء میں کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا، بہرحال آسانی کی خاطر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ قبل از جنگ والے دور میں ہندوستانی اور انگریزی سامان کے بازار ایک دوسرے سے الگ تھے، لیکن صنعت کی وسعت اور اچھے قسم کی کپڑے کی پیدائش، مسابقت کا دائرہ وسیع کر رہی تھی جنگ سے پہلے ہندوستان کو جس مسابقت کا اندیشہ تھا وہ یہ چین کے سوتی بازار میں جاپان کی طرف سے تھا۔ ہندوستان کو سوت اور پارچہ درآمد کرنے والے ملک کی حیثیت سے جاپان نے جنگ کے زمانے میں اہمیت اختیار کی، جاپانی سوتی پارچوں کی درآمد کا سالانہ اوسط جنگ سے قبل کے پنجسالہ دور میں تقریباً تیس لاکھ گز رہا لیکن جنگ کے زمانے میں یہ اوسط بڑھ کر ۷۰۹ لاکھ گز ہو گیا جنگ نے جاپانی صنعت کو ایک موقع عطا کیا اور اس نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء سے ہندوستان میں جاپانی سوتی مصنوعات کی درآمد میں اضافہ ہونا شروع ہوا درآمد کے اس اضافے کو اس وقت ہندوستانی صنعت نے محسوس نہیں کیا کیونکہ درآمد کی مقدار کچھ زیادہ نہ تھی اور لنکاشائر کی درآمد میں تخفیف کی وجہ سے رسد میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا، جنگ کے زمانے میں لنکاشائر کی درآمد میں برابر تخفیف ہوتی رہی، حتیٰ کہ سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں یہ اقل ترین حد پر پہنچ گئی اور اسی سال جاپانی درآمد اس حد پر پہنچ گئی جہاں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچی تھی جنگ کے بعد کے پہلے سال (سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) میں سلطنت متحدہ کی درآمدوں میں خفیف بحالی پیدا ہو گئی اور جاپان میں صنعتی کساد بازاری کی وجہ سے وہاں کی درآمد میں تخفیف ہو گئی، اس طرح اگرچہ لڑائی کے خاتمے نے درآمد کو آسان کر دیا لیکن ہندوستانی گرنیوں سے فوراً ہی مسابقت شروع نہیں ہوئی، مگر دوسرے سال (سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء) جاپانی درآمد میں تیزی سے تغیر ہوا، اور وہ کثیر مقدار جو کساد بازاری کی وجہ سے رک گئی تھی، اب ہندوستان میں ارزاں قیمتوں پر درآمد کی گئی، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں شرح مبادلہ کے اضافے نے روئی کی گرنیوں کی صنعت کو زیادہ متاثر نہیں کیا صنعت نے اعلیٰ شرح مبادلہ سے اس حد تک فائدہ اٹھایا کہ اس نے کم قیمت پر سامان درآمد کیا،

۲۳۹

چینی بازار کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ چین چاندی استعمال کرنے والا ملک تھا۔ صرف طلا استعمال کرنے والے ملکوں میں ہندستانی برآمد کی حیثیت گر گئی اور اسی زمانے میں ہندوستانی صنعت کی مانگ اندرون ملک پیدا ہو گئی اس لیے برآمد کی طلب میں تخفیف کو محسوس نہ کیا گیا۔ اگر شرح مبادلہ کچھ عرصے تک جاری رہتی تو یہ لازمی طور پر ہندوستانی صنعت کو مخالف سمت میں متاثر کرتی، اس کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ اس وقت لنکا شائر میں ہندوستانی زر آمد کرنے والوں نے بڑی فرمائشات بھیج دی تھیں۔ شرح مبادلہ میں تخفیف ایک طرح اس صنعت کے لیے بہت ہی باموقع رہی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سوتی مصنوعات کی قیمت دوسری اشیا کی قیمتوں میں تخفیف کے ساتھ کم نہیں ہوئی اگرچہ ہندوستان میں باہر سے درآمد ہونیوالے پارچے کی قیمتیں گر رہی تھیں لیکن شرح مبادلہ میں مسلسل تخفیف کی وجہ سے اس کے اثرات باطل ہو گئے اور سنہ ۱۹۲۱ء سے قبل ہندوستان میں کپڑے کی قیمتوں میں کوئی تخفیف شروع نہیں ہوئی۔ گرم بازاری کے دور میں بہت سی کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن ان میں سے اکثر کو مشینوں وغیرہ کی فراہمی میں دشواریاں رہیں اور اس وجہ سے کسی بڑی حد تک وسعت اور اضافہ ممکن نہ تھا اس لیے سنہ ۱۹۲۲ء سے قبل پیدائشی صلاحیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اس طرح ہندوستان کی روئی کی صنعت کی خوشحالی کے طویل دور کے واسطے تمام مساعد حالات موجود تھے تین سالوں یعنی سنہ ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں یہ صنعت بڑی خوشحال رہی اور منافعوں کا اوسط غیر معمولی طور پر زائد رہا۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد روئی کی صنعت میں جو سرد بازاری پیدا ہوئی وہ جنگ کے بعد والے دور کے معاشی حالات کا قدرتی نتیجہ تھی، سوتی پارچوں کی طلب میں بحالی جو جنگ کے اختتامی سال کی ایک خاص خصوصیت تھی، طویل عرصے تک جاری رہنے والی چیز نہ تھی اور خصوصاً جب کہ عام صنعتی سرد بازاری کا آغاز ہو گیا ہو اور مزارعین ابھی تک پست حالت میں ہوں۔ اس امر کی طرف اکثر اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے متوسط کپڑے کے خریدار کے پاس ایک معینہ ماحصل

۲۴۰

ہوتا ہے جو وہ کپڑوں پر صرف کرتا ہے اور اگر اس کی آمدنی میں اضافہ نہ ہو مگر کپڑے کی قیمت بڑھ جائے تو اس کو اپنی خریداری میں کمی کرنا پڑتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں کپڑے کا مجموعی خرچ جس کا اندازہ قبل از جنگ والے دور میں ۸۰۔۴ کرور گز لگایا گیا تھا وہ جنگ اور جنگ کے بعد والے پانچ سالوں میں گر کر ۰۰۔۴ کرور گز رہ گیا۔ ۱۹۲۱ء سے کپڑے کی قیمت میں تخفیف شروع ہوئی اور اب شرح مبادلہ بھی ادنیٰ ترین حد پر پہنچ گئی اور قیمتوں میں سب سے زیادہ تخفیف ۲۲-۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ اس سال سے تخفیف برابر جاری رہی یہاں تک کہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں درآمدی سامان کی قیمت ۱۴-۱۹۱۳ء کے معیار کے مساوی ہو گئی (خصوصاً بھورے کپڑے میں جو ہندوستانی گرنیوں کی اہم پیدائشی مصنوعات میں شامل ہے) گرم بازاری کے زمانے میں اجرتیں بھی بڑھ گئی تھیں اور وہ خوشحالی کا دور گزر جانے کے بعد آسانی سے کم نہیں ہوتیں، یہ بمبئی کی صنعت کی ایک خاص خصوصیت تھی، دوسرے مرکزوں میں بمبئی کے مقابلے میں اجرتیں آسانی سے کم ہو جاتی تھیں۔ جیسا کہ عموماً بیشتر کساد بازاریوں میں ہوتا ہے، خوشحالی کا دور گزر جانے کے بعد صنعت کی پیدائشی صلاحیت بڑھ جانے کی وجہ سے مقدار میں اضافہ ہو کر صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی۔ جنگ کے بعد منافعوں کی اعلیٰ شرح نے بہت سے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ روئی کی کتائی اور بنائی کے واسطے نئی کمپنیوں کے خاکے تیار کریں۔ مشینوں اور گرنیوں کے سازوسامان کی کثیر فرمائشیں جو گرم بازاری کے زمانے میں کی گئیں انھوں نے یہ سامان ۲۱-۱۹۲۰ء اور ۲۲-۱۹۲۱ء سے قبل کسی بڑی مقدار میں نہ پہنچنے دیا، لہذا اس طرح نئی وسعت اور نئے پیداکنندوں کے واقعی اثرات ۱۹۲۲ء اور اس کے بعد محسوس ہونا شروع ہوئے، جن نئے کاروبار کی ابتدا ہوئی ان کے مصارف اصل گرم بازاری کے دور کی قیمتوں پر منحصر تھے اور اصل کی ان رقوم میں ۱۹۲۰ء میں شرح مبادلہ کی تبدیلی کی وجہ سے اور اضافہ ہوا۔ ٹیرف بورڈ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس دور میں امریکن روئی کی قیمتوں کی سطح برابر اعلیٰ رہی، جس نے ہندوستانی روئی کی قیمتوں کو متاثر کیا اور یہ ایک معادنی سبب

بھی رہا۔ ادنیٰ شرح مبادلہ نے اس صنعت کی دشواریوں میں اور اضافہ کردیا یہ یہ سب کل ہند خصوصیات تھیں اور ان کا اثر بھی سارے ہندوستان پر پڑا اگرچہ مدارج میں اختلاف رہا جیسا کہ ٹیرف بورڈ نے بتایا ہے کہ تقریباً اس سارے دور میں یعنی ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک بمبئی کی صنعت خسارے میں تھی لیکن دوسرے مرکزوں پر اچھے انتظام والی گرنیاں ان سالوں میں اچھا خاصا منافع تقسیم کررہی تھیں[1]۔

کساد بازاری کی حالت تقریباً اس پورے دور میں جاری رہی، لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ روئی کی صنعت ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری اور اس کے بعد ہندوستانی مزارعین اور ہندوستان کی دوسری صنعتوں کے مقابلے میں بہت کم متاثر ہوئی۔ اس کے چند خاص اسباب تھے مثلاً سیاسی تحریکات کروڑ گیری وغیرہ جنھوں نے اس صنعت کی پیدائشی قوت کو بڑھادیا، اگرچہ ان میں سے کسی سال میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مجموعی حیثیت سے صنعت کو جو منافع ہوا وہ کسی طرح بھی قابل لحاظ تھا۔

جو اسباب مندرجہ بالا عبارت میں بیان کیے گئے ہیں وہ ہر صنعتی تسلسل کے تخفیفی رجحان کی خاص خصوصیات ہیں، لیکن جنگ کے بعد والے دور میں روئی کی صنعت کی نئی اور ممتاز خصوصیت، جاپانی مسابقت کی بڑھتی ہوئی اہمیت تھی، جنگ نے جاپانی صنعت کو ایک شاندار موقع عطا کردیا اور اس دور میں جاپان سے سوتی پارچے کی برآمد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، پہلا سال جس میں یہ درآمد کثیر رہی ۱۹۱۶-۱۷ء تھا اور ۱۹۱۸-۱۹ء میں غیر معمولی طور پر ۲۳۸۰ لاکھ گز کپڑے کی درآمد ہوئی اس کے بعد ہی فوراً زبردست

---

[1] سوتی پارچہ بافی کی صنعت کے متعلق ٹیرف بورڈ کی رپورٹ، یہ خصوصیت متعاقب دور میں جاری رہی، اور حتیٰ کہ کساد بازاری کے دور میں بھی بعض مقامات مثلاً احمد آباد وغیرہ میں نئی گرنیاں قائم ہوئیں اور قدیم گرنیاں حیرت انگیز منافع تقسیم کرتی رہیں مثال کے لیے ملاحظہ ہو، انڈین ٹیکسٹائل جرنل، فروری ۱۹۳۳ء "احمد آباد کی گرنیوں کی حالت"

ردعمل شروع ہوا جو دو سال جاری رہا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کے بعد پھر اضافہ شروع ہوا اور ۲۷-۱۹۲۶ء میں مقدار ۱۹-۱۹۱۸ء سے بڑھ گئی، اس کے بعد بھی درآمد برابر بڑھتی رہی حتیٰ کہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں وہ ۹۲۰ء ۵ لاکھ گز کی بیشترین حد پر پہنچ گئی۔ جاپان سوتی پارچوں کے مختلف بازاروں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر رہا ہے۔ بھورے کپڑوں میں اس کی درآمد سلطنت متحدہ سے بڑھ گئی ہے رنگین کپڑوں میں بھی اس نے قابل لحاظ ترقی کر لی ہے اور ۳۱-۱۹۳۰ء سے یہ سفید پارچے کے بازار میں بھی داخل ہونا شروع ہو گیا ہے سوت کی پیدائش میں جاپانی مسابقت ۲۰ سوت سے کم والی لچھیوں میں زیادہ اہم نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس درجے میں درآمد بہت کم ہے اور ملکی بازار محفوظ ہے۔ ہندوستانی صنعت نے اب خاص طور پر ۳۱ سے ۴۰ یا ۴۰ سوت سے زائد والی لچھیوں کی طرف توجہ کرنا شروع کی اور ان ہی میں مسابقت تیز رہی ٹیرف بورڈ نے ۲۶-۱۹۲۶ء میں محسوس کیا کہ اگرچہ ہندوستانی سوت کی جاپانی درآمد سے مسابقت کم تھی لیکن جاپانی سوت کی مسابقت نے ہندوستانی سوت پر سرد بازاری پیدا کرنے والے اثرات ڈالے، سوتی پارچے میں مسابقت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، ۱۹۳۰ء میں موزانے کی بحث کے سلسلے میں جو نوٹ تیار کیا گیا اس میں وزیر تجارت نے اندازہ لگایا کہ سلطنت متحدہ سے درآمد ہونے والے سوتی پارچوں کی تقریباً ½۱۲ فی صدی[1] اور جاپانی درآمد کا ۹ فی صدی اور دوسرے ملکوں کی درآمد کے ۴ فی صدی سامان کی براہ راست ہندوستانی صنعت سے مسابقت ہوتی تھی، یہ تخمینے خاص طور پر اس تحقیقات پر مبنی ہیں جو ۱۹۲۹ء میں مسٹر ہارڈی نے کی۔ مسٹر ہارڈی نے مسابقتی سامان کی مختلف اقسام کا کافی گہرا مطالعہ کیا اور اپنے نتائج میں بتایا کہ بھورے کپڑے کے مقابلے میں رنگین سامان میں مسابقت کم شدید ہے، لیکن جیسا کہ ٹیرف بورڈ (۱۹۳۲ء) کے سامنے

۲۴۲

لہ۔ بمبئی کی مالکان گرنی کی انجمن نے ۱۹۳۲ء میں ٹیرف بورڈ کے سامنے جو نمایندگی کی اس میں اس عدد کو تخمینے سے کم بتایا۔

بمبئی کے مالکان گرنی کی انجمن نے اپنی نمایندگی میں ظاہر کیا کہ ۱۹۲۷ء کے بعد سے جاپان نے اس درجے میں اچھی خاصی ترقی کر لی تھی۔ جاپان کی شاندار صنعت نے اپنی درآمد کی وجہ سے اس سارے دور میں ہندوستانی گرنیوں کی قیمتوں پر مضر اثرات ڈالے۔

کساد بازاری کے اس دور میں بمبئی کی صنعت کی حالت عجیب رہی، ہندوستان میں روئی کے کارخانوں کی صنعت کا آغاز بمبئی سے ہوا اور جزیرہ بمبئی ہمیشہ سے اس صنعت کا خاص مرکز رہا انیسویں صدی تک اس کی فوقیت برقرار رہی لیکن حالیہ سالوں میں یہ صنعت بہت منتشر ہو گئی ہے ۱۹۰۵ء میں کل ہندوستانی پیداوار میں بمبئی کے کتے ہوئے سوت اور بنے ہوئے کپڑے کا تناسب علی الترتیب ۵۸ اور ۵۵ فی صدی رہا۔ ۱۹۱۳-۱۴ء میں یہ تناسب ۵۲ اور ۵۱ فی صدی ہو گیا۔ جزیرے کی ترقی کو محدود کرنے والا ایک اہم سبب اس کی جغرافی خصوصیات تھیں بھاری محاصل یا محنت کا گراں ہونا یہاں کے بعض دوسرے مخصوص نقصانات تھے، لیکن بعض فوائد مثلاً سامان یا روئی کی درآمد یا دوسرے اخراجات کی کمی سے ان کی کچھ تلافی ہو جاتی تھی۔ جنگ کے بعد سب سے زیادہ ترقی احمد آباد میں ہوئی لیکن دوسرے مرکزوں مثلاً مدراس، شولاپور، ناگپور اور کانپور میں بھی یہ صنعت کسی قدر پھیل گئی اور ملک کے دوسرے منتشر حصوں میں بھی گرنیاں قائم ہو گئیں، مسٹر ہارڈی نے ۱۹۲۹ء کی تحقیقات میں اس مسئلے کو بھی چھیڑا اور ان کا خیال تھا کہ بمبئی کی صنعت [جبکہ پورے وقت کام کر رہی ہو] اور دوسرے ہندوستانی مرکزوں کی پیدائش میں جو مخصوص قسم کی فوقیت تھی وہ ۱۹۲۷-۲۸ء میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۲۷-۲۸ء میں کل ہندوستان کی پیداوار مختلف مرکزوں میں اس طرح بٹی ہوئی تھی۔ جزیرہ بمبئی ۴۹ فی صدی، احمد آباد ۲۲ فی صدی، صوبۂ بمبئی اور اس کے ملحقہ رقبوں کی گرنیاں ۱۳ فی صدی، اور بقیہ ۱۶ فی صدی، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۲۷-۲۸ء سے بمبئی کی پیداوار میں حقیقی کمی ہو رہی تھی تو تمام دوسرے مرکزوں میں اضافہ

ہو رہا تھا اور ان تمام سالوں میں بمبئی سے باہر برابر نئی گرنیاں قایم ہوتی رہیں۔

بمبئی کی صنعت میں جو چند خاص دقتیں تھیں ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے مزید برآں یہ کہ بمبئی کی صنعت نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی کہ اس کو اپنی حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے کرنا چاہیے تھی، مثلاً اس نے موٹے کپڑے کی پیدائش کا سلسلہ جاری رکھا جو لازمی طور پر غیر منافع بخش کام تھا، حالانکہ اس کو اچھے کپڑے کی طرف توجہ کرنا چاہیے تھی، اس سلسلے میں ٹیرف بورڈ نے اس کا مقابلہ احمد آباد کی صنعت سے کیا، بمبئی کی صنعت کو اگر خوشحال ہونا ہے تو اس کی ضروریات کو ترقی یافتہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اس کو اپنے بازارات کو وسیع کرنا اور ان کو قائم رکھنا چاہیے۔ اس کا کوئی ایسا مقامی بازار نہیں ہے جیسا کہ اکثر اس صنعت کا دوسرے مرکزوں پر ہے، لہذا بیرونی مال کی مسابقت میں آسانی، اس کے لیے کوئی قابل لحاظ امر نہیں ٹیرف بورڈ کی مثال اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ سوتی پارچوں کا بمبئی سے شولاپور (جس کا فاصلہ ۲۸۳ میل ہے) تک ریل کا کرایہ تقریباً وہی ہے جو کرایہ بمبئی سے جاپان تک خام روئی بھیجنے یا وہاں سے بمبئی تک سوتی پارچے منگوانے کا ہے اگرچہ بمبئی کو دوسرے مرکزوں کے مقابلے میں ملک کے تمام طویل راستوں کی نقل و حمل کے لیے موافق کرایوں کی آسانی حاصل ہے لیکن اس کا ایسا کوئی معین مقامی بازار نہیں ہے جہاں اس کی کھپت یقینی ہو اور چونکہ یہ بالائی مرکزوں کے لیے کسی اچھے قسم کا کپڑا تیار نہیں کرتی، اس وجہ سے اس کی حالت اور زیادہ ابتر ہو گئی ہے۔ لہذا بمبئی کی صنعت کو برآمد کے بازار پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑتا تھا اور جنگ سے پہلے بھی اسی پر اس کا انحصار تھا۔

۲۴۴

جنگ سے قبل ہندوستانی روئی کی صنعت کا سب سے اہم بازار چین کا سوتی بازار تھا، جنگ سے پہلے پنجسالہ دور میں ہندوستان سے سوت کی برآمد کا اوسط ۹۳۰ء ۱ لاکھ پونڈ تھا جس میں سے تقریباً ۱۷۰۰ لاکھ پونڈ کا

خریدار چین تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں سوت اور دھاگے کی پیدائش ۶۰۷،۴ لاکھ پونڈ تھی اور اس طرح کل پیدائش کا تقریباً ۳۰ فیصدی حصہ برآمد کیا جاتا تھا، جیسا کہ اوپر بتایا گیا[1] چین سے سوت کی تجارت میں ترقی گذشتہ صدی کے آٹھویں عشرے میں ہوئی مگر بعد میں کوئی ترقی کُن بازار نہ رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر اس صنعت میں جو خوشحالی ہوئی وہ دراصل سوت کی صنعت میں ہوئی، لیکن چونکہ چین کی طلب وسیع تغیرات کے تابع تھی لہٰذا کرنیوں کو ترغیب ہوئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ بنائی کے شعبے کھول دیں اور زیر تبصرہ دور میں اس میں ایک اہم تغیر واقع ہوا۔ جنگ سے قبل بھی ہندوستان کو سوت کے بازار میں جاپان سے مقابلہ کرنا دشوار تھا، جنگ نے تجارت برآمد کی دشواریوں میں مزید اضافہ کردیا۔ نیز چین میں خود کتائی کی صنعت ترقی کرنے لگی۔ ۱۹۱۴ء سے ہندوستان کے سوت کی مجموعی مقدار میں تیزی سے کمی ہونے لگی، جنگ کے زمانے میں اوسط مقدار ۱۳۰۰ لاکھ پونڈ تھی، جنگ کے بعد یہ اوسط ۸۲۰ لاکھ پونڈ رہ گیا اور حالیہ سالوں میں برآمد کی مقدار ۲۵۰ لاکھ پونڈ کے قریب آگئی، چین نے اب تقریباً ہندوستان کا سوت خریدنا بالکل ترک کردیا تھا، بلکہ اب وہ ہندوستان میں سوت برآمد کرنے لگا۔ گویا اس معاملے میں صورت بالکل برعکس ہوگئی۔ ہندوستان اب اپنی سوتی پیداوار کا بہت ہی کم حصہ باہر بھیجتا ہے اور اس کے بڑے حصے کی زیادہ تر ہندوستانی کرگھوں اور ہندوستانی بازار میں کھپت ہونے لگی ہے، سوتی پارچوں کی برآمد کی تاریخ سوت کی تجارت برآمد کی تاریخ سے مختلف ہے، ہندوستان جنگ سے قبل جس حد تک سوتی پارچے باہر برآمد کرتا تھا اس کی مقدار نسبتہً کم تھی، اور جنگ سے قبل ہندوستان کی کل پیداوار کا صرف ۹ فیصدی حصہ باہر جاتا تھا۔ پھر یہ کہ تجارت کا انحصار ایک ہی بازار پر نہیں تھا بلکہ مختلف

۲۴۵

[1] صفحہ ۷۵ (انگریزی متن)

بازاروں پر تھا، جن میں سے خاص ایران، عراق، مشرقی افریقہ، آبنائی نوآبادیاں اور لنکا تھے، جنگ کے زمانے میں تجارت میں قابل لحاظ اضافہ ہوا، اور اضافے کی رفتار جنگ کے بعد بھی قائم رہی، اس زمانے کے اوسط علی الترتیب ۰۵ ۵را اور ۰ ۴۶ را لاکھ گز تھے، زیر تبصرہ دور میں اس پہلو میں کوئی خاص تغیر واقع نہیں ہوا لیکن اس کی نوعیت میں بڑی تبدیلی ہوگئی۔ جنگ سے پہلے برآمد میں رنگین کپڑوں کے مقابلے میں بھورے کپڑوں کی مقدار بڑھی ہوئی تھی، جنگ کے زمانے میں رنگین کپڑوں کا حصہ بھورے کپڑوں کے مقابلے میں بڑھا ہوا رہا، جنگ کے بعد بھورے کپڑوں کا اہمیت تیزی سے گھٹنے لگی، اس طرح اگرچہ برآمد کی مجموعی مقدار بڑھ گئی لیکن بھورے کپڑوں کی جو مقدار اب برآمد کی جاتی ہے وہ قبل از جنگ والے معیار سے بہت کم ہے۔ ۳۱-۱۹۳۰ء اور ۳۲-۱۹۳۱ء کے دو سال میں اوسطاً بھورے کپڑے ۹۰ لاکھ گز اور رنگین کپڑے ۹۱۷ لاکھ گز برآمد کیے گئے، اس تبدیلی کا سبب جاپانی مسابقت ہے، مشرق اقصےٰ اور مشرقی افریقہ کے حالیہ تجارتی وفد نے بتایا کہ ہندوستانی بھورے مال کی قیمتوں نے ہندوستان کو اُس کے بازاروں پر قبضہ رکھنے یا جاپان سے مسابقت کرنے سے روک دیا ہے اور یہ صرف ادنیٰ رنگین سامان کے بنے ہوئے کپڑے، اور سوت میں دوسرے مسابقت کنندوں سے نبرد آزما ہو کر اپنی حیثیت قائم رکھ سکتا ہے، اگرچہ جنگ کے بعد ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی تجارت برآمد میں اضافہ ہوا مگر ہندوستانی گرنیاں جتنا کپڑا پیدا کرتی تھیں ان میں کوئی تناسب نہ رہا۔ اور سوت کے بازار کا نقصان ایک خالص خسارہ رہا۔ اس نے بمبئی کی صنعت کی حیثیت کو خاص طور پر صرف ملکی بازار پر بھروسہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

دوسرے مرکزوں کے مقابل بمبئی کی صنعت میں جو ابتری پیدا ہوئی اس کے منجملہ اسباب میں سے ایک چیز خوشحالی کے زمانے میں مالی انتظامات کی لاپروائی تھی اور خصوصاً یہ صورت زائد از مقدار اصل لگانے میں رہی۔

دوسرے مرکزوں میں مقدار سے زائد اصل لگانے کی وجہ خاص طور پر یہ تھی کہ یا تو کاروبار میں وسعت ہوئی یا بڑی ہوئی قیمتوں پر نئے کام تعمیر ہوئے لیکن بمبئی میں اس کی وجہ مینیجنگ ایجنسیوں اور سرمایے کی تبدیلی تھی اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ساسون کی گرنیاں جن کی کتابی قیمت

۴۴۶

کا اندازہ ۲٫۷۵ کرور روپیہ تھا، ایک سنڈیکیٹ کو جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی ۶ کرور روپے میں فروخت کی گئیں[1]۔ لہٰذا یہ ایک قدرتی امر تھا کہ جاپانی مسابقت سے تامین عطا کرنے کے سلسلے میں بمبئی کی گرنیوں کے مالکوں کی انجمن ہمیشہ پیش پیش رہی۔ سب سے پہلی درخواست سنہ ۱۹۲۶ء میں پیش کی گئی[2] اور ٹیرف بورڈ جس نے اس درخواست پر غور کیا اپنی رپورٹ میں بمبئی کی صنعت کی پوری حالت پر روشنی ڈالی۔ بورڈ نے مختلف سفارشات کیں کہ کس طرح کفایات داخلی اور صنعت کی تنظیم میں اصلاحات کرکے تحفظی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ بورڈ نے مالی امداد کی بعض سفارشات بھی پیش کیں، حکومت نے ان سفارشات کو نامنظور کرکے سوت کے پانچ فیصدی محصول بحساب قیمت کو تبدیل کرکے پانچ فی صدی محصول بحساب قیمت یا ڈیڑھ آنہ فی پونڈ جو بھی زائد ہو عائد کر دیا۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ ۳۱ سوت سے ۴۰ سوت والی لچھیاں جن میں جاپانی مسابقت سخت ہے اس قسم کی مخصوص تامین سے مستفید ہوں گی۔ لیکن سوتی تامین کا یہ معیار ناکافی تھا اور جاپانی مسابقت بدستور بڑھتی رہی، بمبئی کی صنعت کو سنہ ۱۹۲۸ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کی طویل اور شدید ہڑتالوں نے اور زیادہ نقصان پہنچایا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں تامین کے مسئلے پر پھر زور دیا گیا اور اس کے نتیجے میں مسٹر ہارڈی کا تقرر ہوا تاکہ وہ محصول بحساب قیمت کے بجائے معین محاصل تجویز کرنے کے لیے مسئلے پر

---

[1] بمبئی اسٹاک ایکسچینج کمیٹی کی رپورٹ، ضمیمہ پانچ (سنہ ۱۹۲۳ء)

[2] اس سے قبل صنعت کی کچھ امداد اس طرح کی گئی کہ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء میں روئی کا محصول چنگی ملتوی کر دیا گیا اور بعد میں یہ بالکل منسوخ ہو گیا۔

غور کریں، نیز وہ سوتی درآمدی سامان کی مسابقت پر بھی ایک عام رپورٹ پیش کریں۔ مسٹر ہارڈی نے اندازہ لگایا کہ ٹیرف بورڈ کی رپورٹ کے بعد سے جاپانی برآمد تیز اور مسلسل ہے اور حکومت ہند پر سوتی کپڑے کی صنعت کو تامین عطا کرنے کے لیے پھر زور ڈالا گیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں تامین عطا کی گئی۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے جو محصول مال ۱۱ فی صدی تھا وہ برطانوی مال پر ۱۵ فی صد اور غیر ممالک کے مال پر ۲۰ فی صدی کر دیا گیا۔ اس اقدام کو اس طرح مناسب قرار دیا جا سکتا ہے کہ چونکہ ہندوستانی صنعت، برطانوی صنعت کا استخفاف کر کے بڑھی اور اس پر گیارہ فی صدی محصول پہلے ہی سے عائد تھا اور اب ہندوستانی صنعت کے لنکاشائر کی مسابقت سے تحفظ کے لیے ۱۵ فی صدی محصول کافی ہے، لیکن جاپانی مسابقت کے واسطے یہ ضروری ہے کہ تامین کی ایک اونچی دیوار کھڑی کی جائے۔ اس عام پیمانے میں یہ استثنا تھا کہ بھورے کپڑے خواہ وہ برطانوی ہوں یا غیر برطانوی اُن پر اقل ترین معینہ محصول ۳ ½ فی صدی فی پونڈ ہوگا۔ حکومت کی مالی ضروریات کے تحت دوسرے سال یعنی مارچ اور اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء میں محاصل میں اضافے کے لیے مزید تامین عطا کی گئی گویا سنہ ۱۹۳۱ء کے اختتام پر سوتی پارچے پر محصول کا پیمانہ یہ تھا کہ برطانوی مال پر ۲۵ فی صدی، اور غیر برطانوی مال پر ۳۱ ½ فی صدی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں مارکان گرنیوں کی درخواست پر مصنوعی ریشمی کپڑوں پر زیادہ محصول عائد کر دیا گیا، لیکن یہ بھی کافی نہ تھا اور جاپانی درآمد برابر بڑھتی رہی اور قیمتیں گرتی رہیں، اس کی مخصوص وجہ گھٹی ہوئی شرح مبادلہ تھی لہٰذا حکومت سے ایک دوسری استدعا کی گئی اور ٹیرف بورڈ سے اس امر کے متعلق رائے دریافت کی گئی۔ بورڈ نے سنہ ۱۹۳۲ء کے وسط میں رپورٹ پیش کی جس میں یہ سفارش کی کہ عارضی طور پر غیر برطانوی مال پر ۵۰ فی صدی محصول عائد کر دیا جائے، یہ تجویز فوراً قبول کر لی گئی اور اب بورڈ نے امداد کے مستقل ذرائع پر غور کرنا شروع کیا۔

۲۴۷

زیر تبصرہ دور میں ہندوستانی سوتی صنعت بہت کافی پھیل گئی۔ جنگ

کے بعد پانچ سالوں میں سوتی پارچے کی پیدائش کا اوسط تقریباً ۱۱،۰۵ لاکھ گز تھا اور سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء اور سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے تین سالوں میں اوسط ۲۶،۵۰ لاکھ گز رہا۔ دستی کرگھوں کی پیداوار کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن مختلف اوقات میں جو تخمینے لگائے گئے[1] اگر ان پر بھروسہ کیا جائے تو قبل از جنگ والے دور میں ۱۲۰ کرور گز، جنگ کے زمانے میں ۱۰۰ کرور گز اور جنگ کے بعد پیدائش کا اوسط ۱۲۰ کرور گز کے قریب رہا[2]۔

۲۴۸

جنگ کے زمانے میں گرنیوں، تکلوں اور کرگھوں میں اضافہ ممکن نہ تھا، لیکن سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے بعد کے عشرے میں ان سب میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، جس کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ہو سکے گا۔

سنہ	گرنیوں کی تعداد	تکلوں کی تعداد	کرگھوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء	۲۵۷	۶۸،۷۰،۸۰۴	۱،۲۳،۷۸۳	۳،۳۲،۱۷۹
سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء	۳۳۴	۸۷،۱۴،۱۶۸	۱،۵۹،۴۶۴	۳،۷۳،۵۰۸
سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	۳۳۹	۹۳،۱۱،۹۵۳	۱،۸۲،۴۲۹	۳،۹۵،۴۷۵

ان اعداد سے حقیقی طور پر پیدائشی جدوجہد کا کوئی پتہ نہیں چلتا، ابتدائی پانچ سالوں میں گرنیوں میں جو اضافہ ہوا اس کی بڑی وجہ جنگ کے بعد والی خوشحالی تھی اور جب تک نئی مشینوں کی تنصیب کا کام مکمل ہوا اس وقت تک خوشحالی ختم ہو چکی تھی، لہٰذا پیدائش میں کوئی تناسبی اضافہ نہیں ہوا سنہ ۲۵-۱۹۲۱ء

[1] تمثیل کے لیے ملاحظہ ہو، کے، ایس، راؤ۔ ہندوستان کی دستی پارچہ بافی پر ایک نوٹ (سنہ ۱۹۲۴ء)

[2] سر جارج شوستر نے سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں موازنے کی توضیحی تقریر میں مجلس مقننہ میں بیان کیا کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہونے والے گزشتہ دس سال میں دستی بنائی کی پیداوار کا سالانہ اوسط ۱۴،۰۶ لاکھ گز رہا اور سنہ ۱۹۳۲ء میں یہ مقدار ۱۵،۰۰ لاکھ گز رہی۔

تسبتہً کم پیدائش کا دور تھا۔ اس کے برخلاف ۱۹۲۵ء کے بعد والا دور پیدائش کے لحاظ سے بہت بڑھا ہوا رہا، حالانکہ اس زمانے میں ساری دنیا میں اس صنعت میں کساد بازاری پھیلی ہوئی تھی اور جب ہندوستانی صنعت کی پیدائش بہت زیادہ بڑھ گئی تو درآمد میں کمی شروع ہوگئی اور لنکا شائر ہندوستانی بازار میں ہندوستان اور جاپان دونوں سے شکست کھا گیا۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں ہندوستانی تجارت پر جو تبصرہ کیا گیا، اس میں ہندوستانی گرنیوں کے بنے ہوئے کپڑے کی اس مقدار (پیدائش و درآمد دونوں لحاظ سے) کا کچھ اندازہ لگایا گیا جو ہندوستان میں صرف کے واسطے موجود تھا، اگرچہ اس میں ذخیروں کے اعداد شامل ہیں پھر بھی یہ دلچسپ ضرور ہیں، ۱۴-۱۹۱۳ء، ۳۰-۱۹۲۹ء، ۳۱-۱۹۳۰ء اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں کپڑے کے صرف کا اوسط علی الترتیب ۱۰۱ اور ۲ ۴/۵، ۸۲ / ۷۱، ۳۶۰ / ۳۳ اور ۳۶۴۵۲ لاکھ گز رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دستی کرگھوں کے مال کی پیدائش میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تو ہندوستان میں کپڑے کا صرف ہندوستانی آبادی کے لحاظ سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ مخصوص طور پر حالیہ سالوں میں ایک خاص خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ عمدہ کتائی، تنوع اور اچھے قسم کے کپڑوں کی پیدائش کا رجحان بڑھ رہا تھا، ۲۶-۱۹۲۵ء میں ہندوستانی گرنیوں میں اگر سوت کی پھی کا اوسط ۱۸٫۴ تھا تو ۳۲-۱۹۳۱ء میں ۲۰٫۵ ہوگیا، اگرچہ کپڑے کے سلسلے میں اس طرح اعداد کی کوئی سند پیش کرنا ممکن نہیں لیکن دھوتیوں، نہین سفید سوتی کپڑوں اور ململ کی زائد پیدائش سے اسی قسم کے رجحان کا پتا چلتا ہے[۱]۔ نیز اسی کے ساتھ ساتھ افریقہ اور مصر سے روئی کی درآمد بڑھ رہی تھی، جس کو ہندوستانی گرنیاں اچھے کپڑے کی پیدائش کے واسطے استعمال کر رہی تھیں اور اگر یہ تمام رجحانات کامیابی کے ساتھ کام کرتے رہیں تو ہندوستانی روئی کی صنعت کی ترقی میں کوئی فوری دشواری

۲۴۹

---

[۱] ڈی، بی، مہتہ۔ سوتی پارچہ بافی کی صنعت کی پیدائش کے متعلقہ چند اعداد (۱۹۳۱ء)

[۲] بمبئی کے مالکان گرنیوں کی ٹیرف بورڈ کے سامنے نمائندگی (۱۹۳۲ء) صفحہ ۲۸

حائل ہوتی نظر نہیں آتی۔

ہندوستانی جوٹ کی صنعت ہمیشہ سے ایک مخصوص حیثیت کی حامل رہی ہے، جنگ نے اس کی حیثیت کو اور زیادہ مضبوط کردیا دوسرے ملکوں کو خام جوٹ کی برآمد کم ہوجانے کے امکانات نے اس کی قیمتوں میں اضافے کو روک دیا لیکن جنگ کی وجہ سے اس صنعت کی مصنوعات مثلاً ریت اور غلے کے تھیلوں اور ٹاٹ وغیرہ کی طلب بہت بڑھ گئی، نیز یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ جنگ کے زمانے میں اکثر صنعتوں میں موجودہ کارخانوں کی حیثیت مخصوص طور پر خوش قسمت رہی کیونکہ امتناعی گرانیوں، مشینوں اور سامان کی فراہمی کی مشکلات کی وجہ سے نئے مسابقت کنندوں کے میدان میں آنے کے امکانات بہت کم تھے، اگرچہ اس زمانے میں بعض نئی کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن مجموعی حیثیت سے کرگھوں میں دو سو سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس زمانے میں جوٹ کی صنعت زیادہ تر حکومت کی فرمائشات پوری کرنے میں لگی رہی اور حکومت نے کثیر پیدائش کو یقینی بنانے کے لیے اس صنعت کے واسطے قانون کارخانہ کے بعض دفعات کی تنسیخ کردی، جنگ کے آخری زمانے میں لائسنس کے بغیر خام جوٹ کی برآمد ممنوع کردی گئی اور ہندوستانی گرنیوں میں خام جوٹ کا صرف بڑھنے لگا۔ جنگ شروع ہونے والے پہلے سال میں ہندوستانی گرنیوں میں خام جوٹ کے ۴۴ لاکھ گٹھے صرف ہوتے تھے تو ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان سالانہ اوسط ۵۵ لاکھ گٹھے رہا، اس کے برخلاف برآمد کم ہونے لگی جو ۱۹۱۷-۱۸ء میں صرف ۱۷ لاکھ گٹھے رہ گئی اس زمانے میں جوٹ کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور نہ اجرتوں میں کوئی خاص تغیر ہوا، لہٰذا ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جوٹ کی گرنیاں خوب منافع کمائیں، باوجود اس کے کہ ذخیرہ محفوظ اور مطالبات فرسودگی میں وقتی طور پر اضافہ کردیا گیا تھا لیکن پھر بھی منافعوں کا معیار بہت اعلیٰ رہا، ناظم اعداد و شمار کے

لہ۔ ڈی، آر، واس۔ جوٹ کا رُومان، (۱۹۲۸ء)

۲۵۰ تخمینے کے مطابق جوٹ کی گرنیوں میں اداشدہ سرمایے پر خالص منافع کی شرح ۱۹۱۵ء میں ۵۸ فی صدی، ۱۹۱۶ء ۷۵ فی صدی، ۱۹۱۷ء میں ۹۸ فی صدی اور ۱۹۱۸ء کے نصف اول میں ۷۳ فی صدی رہی اور جیسا کہ ناظم موصوف نے بتایا آخر الذکر ایک یادگاری منافع ہے[1]۔

لیکن یہ صورت حال ہمیشہ رہنے والی نہیں تھی اور جیسے ہی جنگ ختم ہوئی تو جوٹ کی صنعت کو بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگی فرمائشات ختم ہوگئیں اور اس کا مطلب یہ تھا کہ طلب میں خاصی کمی ہوگئی، اگرچہ حکومت نے جنگ کے اختتام پر وہ تمام سامان خرید لیا جو جنگ کی وجہ سے تیار ہوا تھا۔ خام جوٹ کی قیمتیں اور اجرتیں ہمیشہ ادنیٰ سطح پر نہ رہ سکتی تھیں اور وہ بڑھنے لگیں۔ جنگ کے زمانے کے اعلیٰ منافعوں نے نئی کمپنیوں کو کاروبار شروع کرنے کی ترغیب دی اور جب مشینیں وغیرہ فراہم ہونے لگیں تو خود پرانی کمپنیوں نے بھی اپنے کاروبار بڑھانا شروع کیے۔ جنگ کے بعد اس صنعت کو جس دوسری مشکل کا سامنا کرنا پڑا وہ کوئلے کی رسد کی شدید قلت تھی اور محض اس وجہ سے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان اکثر گرنیاں بند کرنا پڑیں[2]۔ صنعت کی خاص دشواری یہ تھی کہ صنعت و تجارت دونوں میں عالمی کساد بازاری پیدا ہوگئی تھی اور اس کی بدولت طلب میں تخفیف ہو رہی تھی، اس وجہ سے وسط ۱۹۱۹ء سے کم اوقات کار کے معاہدے نافذ ہونا شروع ہوئے، ۱۹۲۰ء میں خفیف سی بحالی ہوئی لیکن اپریل ۱۹۲۱ء میں پھر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اوقات کار گھٹا دیے جائیں چنانچہ ہفتے میں چار دن کام کرنے کا معاہدہ طے ہوا جو ۱۹۲۹ء تک جاری رہا[3]۔ لیکن صرف یہ بھی کافی نہ تھا اور پیداائش میں تخفیف کوئی فیصلہ کن چیز نہیں رہی ۲۵۱ کیونکہ صلح کے بعد وسعت کی جو تجاویز اختیار کی گئیں ان کے اثرات محسوس ہونے لگے

---

[1] ہندوستانی تجارت پر تبصرہ بابت ۱۹۱۸-۱۹ء صفحہ ۲۱
[2] ہندوستان کی جوٹ کی گرنیوں کی انجمن کی رپورٹ بابت ۱۹۲۰ء۔
[3] جنگ کے بعد اس صنعت میں جو اضافہ ہوا اس کی وضاحت ذیل کے اعداد سے بخوبی

اور ۱۹۲۲ء میں جوٹ کی گرنیوں نے مزید توسیع نہ کرنے کا معاہدہ کیا، ان مشکلات کے باوجود جنگ کے بعد جوٹ کی صنعت نے بہت کچھ ترقی کی، جنگ کے زمانے میں جو توسیع ہوئی وہ بہت ہی مستحکم تھی اور جنگ کے زمانے میں جوٹ کے صرف کا اوسط بحال رہا اور ہندوستان سے برآمد ہونے والی اشیا میں جوٹ کی مصنوعات کی حیثیت بہت ممتاز رہی، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جوٹ کی مصنوعات ہی ہندوستان کی وہ اہم مصنوعات ہیں جو ہندوستان سے برآمد کی جاتی ہیں، چنانچہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں کل اشیائے برآمد کی قیمت کا ۴۶،۲۶ فی صدی حصہ انھی سے حاصل ہوا، جوٹ کی گرنیوں نے اپنی باہمی تنظیم کی بدولت اس دور میں کافی منافع حاصل کیا، ان کی نیم اجارہ دارانہ حیثیت نے ان کو ہمیشہ دوسرے ملکوں کی شدید مسابقت سے محفوظ رکھا اور جنگ کے زمانے میں مخصوص ذخیرۂ محفوظ کی عاقلانہ حکمت عملی اور اپنی پیدائش کو طلب کے مقابلے میں گھٹا دینے سے یہ ان مزید دشواریوں سے بچ گئیں جو جنگ کے بعد تمام دوسری صنعتوں کو پیش آئیں، لیکن ۱۹۲۹ء کے بعد یہ تنظیم بھی عالمی کساد بازاری کا بار برداشت نہ کر سکی، جوٹ کی گرنیاں کئی سال سے ۵۴ گھنٹے فی ہفتے کے حساب سے کام کر رہی تھیں اور ۱۹۲۸ء میں ان کے ذخیروں کی حالت قابل اطمینان تھی لہٰذا انھوں نے جولائی ۱۹۲۹ء میں اپنے اوقات کو ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ کر دینے کا معاہدہ کیا، بدقسمتی سے پیدائش میں یہ اضافہ ٹھیک اسی وقت ہوا جبکہ زرعی قیمتوں میں کساد بازاری شروع ہو رہی تھی، تجارت بین الاقوام اور بالخصوص زرعی

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ: ہوجاتی ہے۔

	۱۵-۱۹۱۴ء	۱۹-۱۹۱۸ء	۲۴-۱۹۲۳ء	۳۱-۱۹۳۰ء
گرنیوں کی تعداد	۷۰	۷۶	۸۹	۹۸
تکلون کی تعداد	۷،۹۵،۵۲۸	۸،۳۹،۹۱۹	۱۰،۴۳،۴۱۷	۱۱،۴۰،۴۳۵
کرگھوں کی تعداد	۳۸،۳۷۹	۴۰،۰۴۳	۴۹،۰۳۸	۵۳،۹۰۰
کام کرنے والے مزدور	۲،۳۸،۲۷۴	۲،۷۵،۵۰۰	۳،۳۰،۴۰۸	۳،۴۳،۲۵۷

پیداواروں کی مانگ میں تخفیف کی وجہ سے جوٹ کی مصنوعات کی طلب بہت مندی ہوگئی اور سال بھر پورے طور پر کام کرنے کے بعد جوٹ کی گرنیوں کو اپنے ذخیرے خطرناک نظر آنے لگے، ۱۹۲۹ء میں عالمی تجارت کے لحاظ سے جوٹ کی فصل زیادہ رہی اور ۱۹۳۰ء میں بھی جوٹ کی فصل وافر رہی اور پیداوار یادگاری حد پر پہنچ گئی، اس کی وجہ سے خام جوٹ کی قیمتوں میں فوری تخفیف ہوئی اور اس نے صنعت کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ زوردار تبلیغ کی بدولت ۱۹۳۱ء میں جوٹ کے رقبے میں تیزی سے کمی ہوگئی مگر اس سال کی ادنیٰ پیدائش کے باوجود قیمتیں آگے نہ بڑھ سکیں، ۱۹۳۰ء میں انجمن نے ۵۴ گھنٹے کا ہفتہ اختیار کیا اور اوائل ۱۹۳۱ء میں ۴۰ گھنٹے کے ہفتے پر نوبت آگئی اور مزید برآں انھوں نے اپنے کرگھوں کے ۱۵ فی صدی حصے کو فروخت کرنا طے کیا اس کی وجہ سے ایک طرف تو خود انجمن کے اراکین اور دوسری طرف رکن اور غیر رکن گرنیوں میں شکر رنجی پیدا ہوگئی، ان جھگڑوں کی وجہ سے صورت حال اور بدتر ہوگئی آخر کار اگست ۱۹۳۲ء میں رکن انجمن اور غیر رکن گرنیوں کے درمیان پیداوار کو محدود رکھنے کا ایک معاہدہ طے پا گیا۔ ۲۵۴

زیر تبصرہ دور میں ہندوستان میں معدنیات کی پیدائش میں انقلابی تغیرات ہوئے، اس دور میں اہم ترین فلزاتی صنعت یعنی لوہے اور فولاد کا کاروبار بہت ہی مستحکم بنیاد پر قائم ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے مختلف حصوں میں متعدد معدنی مخزنوں پر کام کا آغاز ہوا، دراصل جنگ بڑی حد تک ہندوستان کے معدنی ذرائع کو ترقی دینے کا سبب ہوئی، آلاتِ حرب کی خاطر حکومت ہند اور عوام دونوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور فلزاتی و کیمیاوی درجے کی متعدد نئی کلیدی صنعتوں نے اہمیت اختیار کرنا شروع کی۔ کرومائٹ اور ولفرم کی پیدائش کو اسلحہ کی ضروریات کے تحت زوردار ترغیب ملی، لیکن ان دونوں صورتوں میں ان کی پیداوار اور برآمد جو جنگ کی وجہ سے ہوئی تھی جنگ کے بعد قائم نہ رہ سکی اور ان صنعتوں کی خوش حالی عارضی تھی، اسی طرح شورے کی صنعت کی بحالی بھی چند روزہ تھی لیکن جنگ کے سال لوہے اور

فولاد کی صنعت کے واسطے سب سے زیادہ پائدار رہے، جنگ کے بعد برما میں متعدد خام دھاتوں کی پیدائش کے سلسلے کا آغاز بھی کافی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ زیریں برما میں خام ٹین سے استفادہ شروع کیا گیا اور بالائی برما میں جہاں تانبہ بھی ملتا ہے وہاں سیسہ، جست اور چاندی کی کانوں پر کام کا آغاز ہوا، اس اضافے کے باوجود فلزاتی نوعیت سے ہندوستان کی معدنی پیداواروں کی صورت وہی رہی جو ۱۹۱۴ء میں تھی[1] کوئلے اور پٹرول کی طرح بعض اہم معدنیات اس طور پر صرف کی جاتی ہیں جس کو براہ راست طریقہ کہا جاتا ہے، خام لوہا ہی فلزاتی مصنوعات کی اہم بنیاد رہا لیکن اس کے علاوہ متعدد دوسری چیزیں مثلاً مغنیسہ، ابرک، سیسہ، جست، ٹین اور تانبہ خام شکل ہی میں برآمد کی جاتی ہیں، ہندوستان میں مقناطیس کی پیدائش بہت ہی محدود ہے۔ ابرک ٹکڑوں اور ریزوں کی شکل میں برآمد کیا جاتا ہے اور اس کے سفوف سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا جاتا، نہ یہاں میکا نائٹ بنانے کی کوشش شروع کی گئی، حالانکہ ہندوستان میں بہترین قسم کا ابرک پیدا ہوتا ہے اور اس کو عملی حیثیت سے لاکھ کا اجارہ حاصل ہے، سیسہ جست اور چاندی صفائی کے واسطے خام شکل میں برآمد کی جاتی ہیں، برما کی خام دھاتوں سے جست اور گندھک کا تیزاب حاصل کرنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں جمشید پور میں ان کو صاف کرنے کا ایک کارخانہ کھولنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، قلعی دار فولاد اور اس کے سامان کے واسطے جست باہر سے برآمد کرنا پڑتا ہے، اسی طرح صفائی کے واسطے خام ٹین آبنائی نوآبادیوں کو بھیجا جاتا ہے اور ہندوستان کے ٹین سازی کے کارخانے وہاں سے ٹین درآمد کرتے ہیں۔ سیسہ چاندی اور تانبہ بھی ہندوستان کی اہم اشیائے درآمد میں شامل ہیں۔

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں فلزاتی صنعتوں کے قیام

۲۵۴

[1] صـ۱۱۲۔ (انگریزی متن)

کے واسطے خام سامان کی کمی نہیں ہے اور ہندوستان میں ٹین سازی کے کامیاب تجربے نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ پیدایش کی فنّی دقتیں بھی ناممکن العمل نہیں ہیں۔ موجودہ محدودگی کا سبب صرف اندرونی مانگ کا نہ ہونا ہی نظر آتا ہے[1] جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ان کی پیدائش میں اس وقت فائدہ ہو سکتا ہے جبکہ یہ بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوں، لہذا ہم کو ہرجہتی صنعتی ترقی کا انتظار کرنا چاہیئے تاکہ ہندوستان میں یہ صنعتیں قائم ہو جائیں۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۱۳ء کے قریب کوئلے کی صنعت میں ہندوستان کے اندر کوئلے کی مانگ کے لحاظ سے رفتار ترقی سست تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برآمد گھٹ گئی اور درآمد بڑھ گئی یہی وہ زمانہ تھا جبکہ مشرقی افریقہ کا کوئلہ پہلی مرتبہ مشرقی بازاروں میں آیا اور جس نے بعد میں ہندوستان کی صنعت پر خاص اثر ڈالا، کوئلے کی صنعت پر جنگ کا سب سے فوری اثر یہ ہوا کہ اس کی طلب میں تخفیف ہو گئی کیونکہ جنگ کی وجہ سے تقریباً ہر صنعت میں عارضی طور پر گڑبڑ ہو گئی تھی، لیکن طلب اور خصوصاً ریلوں کی مانگ بہت جلد بحال ہو گئی لیکن اس کے بعد اس صنعت کو دوسری دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۱۷ء تک اس کی رفتار ترقی بہت ہی سست رہی۔ یہ دشواریاں خاص طور پر نقل و حمل کی تھیں، سمندر کے ذریعے نقل و حمل تو تقریباً ناممکن ہو گئی اور ۱۹۱۵ء میں زیادہ سے زیادہ کوئلہ ریل سے جانے لگا، اور سال کے اختتام تک تو یہ نوبت آ گئی کہ ہندوستان میں سارا صرف ہونے والا کوئلہ اسی ذریعے سے پہنچایا جاتا تھا[2]۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ہندوستان میں کوئلے کی درآمد بند ہو گئی اور اس طرح ملک میں ہندوستانی کوئلے کی اہمیت بڑھنے لگی، اگرچہ نقل و حمل کا مسئلہ دشوار تھا اور ساحلی جہازرانی کا تقریباً خاتمہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے

۲۵۴

[1] ہندوستان میں تیزابوں کی مجموعی طلب کا اندازہ ٹیرف بورڈ نے ۱۲ ہزار ٹن گندھک کے تیزاب کی صورت میں کیا۔ بھاری کیمیاوی صنعتوں کے متعلق ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (۱۹۲۹ء)

[2] معدنیات کے ناظر خصوصی کی رپورٹ (۱۹۱۵ء)

باوجود ابتدائی سالوں میں لنکا اور آبنائی نو آبادیوں کے قریبی بندرگاہوں تک ہندوستانی کوئلہ پہنچنے لگا، چونکہ ہندوستان کے کوئلے کی جملہ ضروریات بنگال کی کانوں سے پوری ہوتی تھیں اور یہ تمام کوئلہ ریل کے ذریعے لے جایا جاتا تھا اور ۱۹۱۶ئہ میں کوئلے کی منتقلی میں مال گاڑیوں کی شدید قلت محسوس ہونے لگی اب صنعتوں کی طلب میں بھی بحالی پیدا ہو چلی تھی اور ۱۹۱۷ئہ میں حکومت بھی ایک بڑے خریدار کی حیثیت سے میدان میں آگئی، اور اس نے اعلیٰ قسم کا کوئلہ خریدنا شروع کر دیا۔ قدرتی طور پر اس کوئلے کو نقل وحمل کی سہولتیں ملنا چاہئیں تھیں، لہٰذا حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ کوئلے کی نقل وحمل پر زیادہ سے زیادہ نگرانی رکھے، اور ۱۹۱۷ئہ کے آخر میں ناظم کول کا دفتر قایم ہوا، اچھے قسم کی رسد کا بڑا حصہ چونکہ حکومت خریدنے لگی لہٰذا عوام کے لیے ادنیٰ اور قلیل مقدار میں کوئلہ بچنے لگا، اور کوئلے کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۱۷ئہ سے کوئلے کی صنعت کی ترقی کا ایک بڑا بحرانی دور شروع ہوا، آیندہ چار سال تک کوئلے کی طلب رسد سے مسلسل بڑھتی رہی، مگر صنعت کی وسعت محدود تھی کیونکہ نہ تو کوئلہ لے جانے کے لیے مال گاڑیاں تھیں اور نہ کان کنی کے لیے زائد مزدور تھے، اگرچہ ۱۹۱۹ئہ کے بعد سے عوام کو کوئلے کی نقل وحمل کے ذمہ دار عہدیدار کی بدولت اچھے قسم کا کوئلہ ملنا شروع ہو گیا تھا مگر حکومت کی کوئلے کی خریداری اپریل ۱۹۲۰ئہ میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۱۹ئہ میں ان اضلاع میں جہاں سے کوئلے کی کان کنی کے واسطے مزدور بھرتی کیے جاتے تھے قحط پڑھ گئے، اس کی وجہ سے پیداوار بہت بڑھ گئی، ۱۹۲۰ئہ اور ۱۹۲۱ئہ کے درمیان اگرچہ کثیر طلب اور مال گاڑیوں کی قلت کی شکایت بدستور باقی رہی مگر مزدوروں کی دشواریوں کی وجہ سے ۱۹۱۹ئہ کے مقابلے میں پیداوار کم رہی، کوئلے کی صنعت کی وسعت کا انحصار ہندوستان کی صنعتی ترقی پر تھا، اس کا اندازہ خود اس طرح ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں ترقی ہوئی اس وقت ہندوستانی کوئلے کی برآمد کم رہی، اور کچھ عرصے تک حکومت کو اس کی برآمد پر بندشیں

عائد کرنا پڑیں، اگرچہ سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد بیرونی اور بالخصوص جنوبی افریقہ کے کوئلے نے ہندوستانی کوئلے کو مشرقی بازاروں سے نکال دیا لیکن زیر تبصرہ دور میں کوئلے کی صنعت کی حیثیت ملکی بازار میں بہت زیادہ مستحکم ہوگئی چنانچہ ذیل کے اعداد سے اس کی وضاحت ہوجائے گی کہ ملک کے اندرونی صرف میں ہندوستانی کوئلے کا حصہ کتنے فی صدی تھا۔ ۲۵۵

سنہ ۱۹۰۹-۱۳ء	۹۳٫۹ فی صدی
سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء	۹۶٫۹ " "
سنہ ۱۹۱۹-۲۳ء	۹۷٫۷ " "[1]

سنہ ۱۹۲۶ء میں ہندوستانی ٹیرف بورڈ اپنی تحقیقات میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت تناسب تقریباً ۹۷٫۵ فی صدی تھا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگرچہ جنگ کے زمانے میں جہازوں کی دقتیں ہندوستانی کوئلے کو ملکی بازار پر قبضہ کرانے کی ذمہ دار تھیں لیکن اس طرح جو فائدہ حاصل کیا گیا وہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ بعد میں اس میں تھوڑا سا اضافہ بھی ہوا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے سنہ ۱۹۱۷-۲۱ء کے دور میں اس صنعت میں تیزی سے ترقی ہوئی حتیٰ کہ وہ ادنیٰ کوئلہ بھی جس کی حالت کچھ نازک تھی نہ صرف تیزی سے فروخت ہوا بلکہ اس زمانے میں جبکہ حکومت نے خریداری شروع کردی تھی، اعلیٰ کوئلے سے زیادہ اچھی قیمتوں پر فروخت ہوا اس زمانے میں نئی کانوں میں اضافہ اور پرانی کانوں میں توسیع دونوں طرح سے ترقی ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں مزدوروں کی شدید قلت کی وجہ سے بڑی معدنوں کے مالکوں کو ترغیب ہوئی کہ وہ کوئلہ کاٹنے والی مشین اور معدنیات

[1] ہندوستان کی معدنیات پر پنجسالہ تبصرہ (سنہ ۱۹۱۹-۲۳ء)۔

میں بجلی کا استعمال شروع کر دیں تاہم ابھی تک ہندوستانی کوئلے کی صنعت ایک چھوٹے پیمانے پر چلنے والی صنعت ہے اور خوش حالی کے زمانے میں متعدد چھوٹی کانوں ہی میں اضافہ ہوا، چھوٹی کانوں کی تعداد کا اندازہ اس طرح ہو جائے گا کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں تقریباً نصف کے قریب کانوں کی پیداوار کا اوسط ایک ہزار ٹن ماہانہ سے کم تھا۔[1] اس واقعے نے مال گاڑیوں کی قلت کے سوال کو اور زیادہ بڑھا دیا اور کانوں میں بہتر مشینوں اور کان کنی کے عمدہ طریقوں کے استعمال میں بھی یہی سبب مانع رہا۔

جنگ کے زمانے میں نقل و حمل کی دقت کی وجہ سے ہندوستانی کوئلے کی برآمد بہت گر گئی لیکن جب سنہ ۱۹۱۹ء میں پیداوار بہت زائد ہوئی تو اس میں پھر اضافہ ہونے لگا اور برآمد میں یہ اضافہ اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان کی وہ صنعتیں جو خوش حالی کے مختصر دور سے گزر رہی تھیں، ان کی طلب نامکمل تھی، کوئلے کی مقدار کافی نکل رہی تھی لیکن ڈبوں کی قلت کی وجہ سے کل پیداوار کے مقابلے میں جو کوئلہ منتقل کیا جاتا تھا اس کی مقدار بہت کم ہوتی تھی، کوئلے کی برآمد کو روکنے کے لیے آواز اٹھائی گئی اور حکومت ہند نے ان حالات میں ضروری خیال کیا کہ وہ بلا لائسنس کوئلے کی برآمد روک دیے، یہ طریقہ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء میں اختیار کیا گیا کوئلے کی برآمد پر اس بندش میں سنہ ۱۹۲۱ء میں اور سختی برتی گئی اور جنوری سنہ ۱۹۲۳ء میں یہ قیود اٹھالی گئیں اواخر سنہ ۱۹۲۱ء میں خوش حالی کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور کوئلے کی صنعت اپنی پیداوار کی طلب میں کمی محسوس کر رہی تھی سنہ ۲۱-۱۹۱۸ء کے درمیان جو بہت سے کاروبار شروع کئے گیے وہ ناکام رہے اور ہندوستانی صنعت اس زمانے میں کساد بازاری کے ایک طویل دور سے گزر رہی تھی۔ کوئلے کی صنعت بھی کساد بازاری سے متاثر ہوئی، سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد نقل و حمل کی دشواریاں کم ہونا شروع ہوئیں اور سنہ ۱۹۲۴ء کے وسط سے ڈبوں کی رسد

[1] کوئلے کی کانوں کی کمیٹی، باب ششم (سنہ ۱۹۲۰ء)

۲۵۶

جملہ ضروریات کے واسطے کافی ہونے لگی، اب جنوبی افریقہ کے کوئلے سے شدید مسابقت اس صنعت کی ایک اور مشکل بن گئی۔ غرض حالی کے زمانے میں کوئلے کی صنعت کے حالات ہی جنوبی افریقہ کے کوئلے کی کامیابی کے بڑی حدتک ذمہ دار ہیں، برآمد پر قیود، ریلوں کی قلت، طلب کی شدت کے زمانے میں ہندوستانی معدنوں کا ادنی قسم کا کوئلہ مہیا کرنا یہ سب اس سبب کا نتیجہ ہیں۔ ہندوستانی بندرگاہوں سے کوئلے کی ساحلی تجارت میں تخفیف ہوگئی، کلکتہ کوئلہ لادنے والے بندرگاہ کی حیثیت کھو بیٹھا، اور تقریباً سارے برآمدی بازار ختم ہوگئے، دوسری طرف جنوبی افریقہ کی حکومت نے اپنے ہاں کے کوئلے کی کافی امداد کی اس وجہ سے اس کو بازاروں پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوگئی۔ سنہ ۱۹۱۷-۲۱ء کے درمیان کوئلے کی صنعت کو جو مشکلات پیش آرہی تھیں وہ نقل وحمل اور کام کرنے کے بہتر طریقوں کی دشواریاں تھیں اور سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد جو سوال اس کے سامنے تھا وہ ہاتھ سے نکلے ہوئے بازاروں پر دوبارہ قبضے کا تھا۔ ہندوستانی کوئلے کو جنوبی افریقہ کے کوئلے سے مسابقت کرنے میں سب سے بڑی دشواری شرح کرایہ کی زیادتی تھی، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ صورت اختیار کی گئی کہ ایسٹ انڈیا اور بنگال ناگپور ریلوں نے سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد تمام برآمدی کوئلے کی شرح کرایہ میں ۲۵ فی صدی تخفیف کردی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ہندوستانی کوئلے کی کمیٹی نے اس معاملے پر تفصیل سے غور کیا اور اس نے محسوس کیا کہ برآمدی بازاروں پر دوبارہ قبضہ کرنے کا مسئلہ دراصل قیمت اور قسم کا سوال ہے، انھوں نے نقل وحمل کی آسانیاں مہیا کرنے کی خاص طور پر سفارش کی نیز کرایوں میں مزید ۳۷½ فی صدی تخفیف کی سفارش کی۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے برآمدی بازار پر صرف اسی صورت میں قبضہ کیا جاسکتا ہے جبکہ صرف اعلیٰ قسم کا کوئلہ ہی باہر بھیجا جائے، اس لیے انھوں نے مجلس درجہ بندی کے قیام کی سفارش کی، جو بیرونی خریداروں کو نوعیت وغیرہ کے متعلق سندیں دیا کرے، سنہ ۱۹۲۵ء سے کرایوں میں مزید سفارشی تخفیف

۲۵۷

عمل میں آئی اور اسی سال کوئلے کی درجہ بندی کا قانون نافذ ہوا۔ جہازوں پر لادنے والے کوئلے کی درجہ بندی اور اس کی نوعیت کے بارے میں سندوں کے اجرانے بیرونی خریداروں میں اعتماد بحال کر دیا اور ۱۹۲۵ء کے بعد کوئلے کی تجارت برآمد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا اور بڑی حد تک تقریباً سارے پرانے بازاروں پر قبضہ کر لیا گیا اور حال ہی میں ہانگ کانگ کا ایک نیا بازار بھی ہاتھ لگ گیا[1]۔

ہندوستانی کوئلے کے برآمدی بازاروں کا سوال کچھ دنوں سے عوام کے سامنے ہے مگر اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستانی کوئلے کی کل پیدائش کے لحاظ سے اس کا تناسب بہت ہی کم ہے، جنوبی آفریقہ کی مسابقت سے اس صنعت کو جو نقصان پہنچا، اس کا تخمینہ مسٹر جن والا کے اندازے کے مطابق ۱۱ لاکھ ۲۵ ہزار ٹن ہے، جو حالیہ سالوں میں ہندوستان کی کل پیداوار کا ۶ فی صدی سے بھی کم ہے اس طرح یہ واضح ہو جائے گا کہ ہندوستانی کوئلے کی صنعت کا بڑا انحصار خود ہندوستان کے اندر کوئلے کے بڑھے ہوئے صرف پر ہے۔ اور حالیہ سالوں میں اس میں قابل لحاظ اضافہ بھی ہوا، اس سلسلے میں ہندوستانی ٹیرف بورڈ[2] نے ہندوستان میں کوئلے کے خالص صرف کے جو اعداد دیے ہیں وہ دلچسپ ہیں، ان میں ضائع شدہ حصہ اور کانوں میں صرف ہونے والا

---

[1] ہندوستانی کوئلے کی برآمد:-

	(ہزار ٹن میں)
جنگ سے پہلے کا اوسط	۸۲۵
جنگ کے بعد کا اوسط	۴۳۴
سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء	۶۴۵
سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	۶۸۸
سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	۵۱۷

[2] کوئلے کی صنعت کو تامین حفاظت عطا کرنے کے متعلق ٹیرف بورڈ کی رپورٹ، ضمیمہ دوم۔

کوئلہ شامل نہیں۔

ہزار ٹن میں

سنہ ۱۹۱۰ء	سنہ ۱۹۱۳ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۲۳ء	سنہ ۱۹۲۵ء
۹٫۸۸۶	۱۴٫۲۸۱	۱۷٫۹۱۴	۱۷٫۶۹۲	۱۸٫۴۳۱

گزشتہ دور کی طرح ریلیں کوئلے کی بڑی خریدار رہیں اور کوئلے کے بڑھتے ہوئے خرچ میں ریلوں کی توسیع کو کافی دخل ہے، لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اضافے کا ایک بڑا سبب ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت کا قیام ہے۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں لوہے کی صنعت (جس میں انجینیری کے کارخانے شامل ہیں) ریلوں کے بعد دوسری بڑی خریدار تھی، اور اس نے اس سال ہندوستان کی کل پیداوار کا ۱۲ فی صدی حصہ صرف کیا[1]۔ اور ٹیرف بورڈ کی اکثریت والی رپورٹ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر کوئلے پر کوئی تائینی محصول عائد کیا جاتا تو بھی اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا کہ کوئلے کی صنعت نے فولاد کی تائین سے حاصل کیا۔

اگرچہ گزشتہ پندرہ سالوں میں ملک کا اندرونی صرف بہت بڑھ گیا، لیکن جنگ کے بعد سے کوئلے کی صنعت خستہ حال ہی رہی، ایک طرف تو ملک کی عام صنعتی کساد بازاری اور کوئلے کی بدل کی ترویج نے اس کی طلب میں تخفیف کی دوسری طرف خوش حالی کے زمانے میں کانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، نیز بجلی اور کوئلہ کاٹنے والی مشینوں کی بدولت رسد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا[2]۔ ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بہتر قسم کا کوئلہ پیدا کرنے والی کانیں جن کے ہاں اچھے قسم کے آلات اور مشینیں تھیں

[1] ہندوستان کی معدنیات پر پنجسالہ تبصرہ (سنہ ۲۳-۱۹۱۹ء)۔
[2] جنگ کی گرم بازاری کے زمانے میں کانوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ، پھر ان میں

جاری رہ سکیں، اور غیر کارگزار کانوں کی بڑی تعداد میدان سے خارج ہو گئی نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قیمتوں اور تجارتی حالات کی حالیہ سرد بازاری سے دوسری معاشی کوششوں کے مقابلے میں کوئلے کی صنعت کم متاثر ہوئی۔

زیر تبصرہ دور میں کوئلے کی صنعت نے جو ترقی کی وہ واضح طور پر قابل اطمینان کہی جا سکتی ہے اور یہ عام رائے معلوم ہوتی ہے کہ اس صنعت میں آیندہ ترقی کے وسیع امکانات موجود ہیں جہاں تک اس صنعت کے ملکی بازاروں کا تعلق ہے تو سوائے بمبئی اور سندھ کو چھوڑ کر اس کی حالت بہت مضبوط ہے اور اندرونی طلب کو بڑھنا چاہئے۔ لیکن دوسری طرف صنعت کی مشکلات بھی ظاہر ہیں، ہندوستانی کوئلے کا بڑا حصہ رانی گنج اور جھریا کی کانوں سے نکلتا ہے اور ان کی جائے وقوع کی وجہ سے ان کو دور دراز کے ملکی بازاروں اور خصوصاً مغرب و جنوب میں کوئلہ بھیجنے میں دشواری ہوتی ہے۔ نقل و حمل کے اخراجات کی زیادتی ایک مسلسل دشواری ہے مزید یہ کہ چند سالوں سے کان کنی کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں، اس کی کچھ وجہ تو اجرتوں کی عام سطح میں اضافہ ہے، لیکن اس کا خاص سبب یہ ہے کہ کام معدنیات کی ۲۵۹

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: تخفیف اور کوئلے کی بڑھی ہوئی تعداد کو ذیل کے نقشے میں ظاہر کیا گیا ہے جو کمیشن مزدوران کی رپورٹ سے لیا گیا ہے۔

سال	پیداوار (ٹن میں)	معدنوں کی تعداد	روزانہ کام کرنیوالے مزدوروں کی اوسط تعداد
سنہ ۱۵-۱۹۱۱ء (سالانہ اوسط)	۱،۴۷،۳۱،۹۰۴	۵۵۴	۱،۲۸،۸۸۴
سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء (")	۱،۸۴،۸۶،۹۸۸	۷۰۰	۱،۶۷،۸۸۱
سنہ ۱۹۲۲ء	۱،۸۱،۷۰،۹۸۸	۹۵۳	۱،۸۴،۳۵۵
سنہ ۱۹۲۶ء	۲،۱۰،۹۳،۰۲۴	۷۲۲	۱،۷۰،۹۲۸
سنہ ۱۹۲۹ء	۲،۳۳،۰۸،۱۷۴	۵۴۸	۱،۶۵،۲۵۸

سنہ ۱۹۳۱ء میں پیداوار ۲۰،۵۱۵ ہزار ٹن رہی۔

گہرائیوں تک پہنچ گیا ہے، ہندوستانی کوئلے کے مخزنوں کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے دور دراز کے خریداروں کو کوئلہ مہنگا پڑنے لگا اور اخراجات میں کمی کرنے کے لیے اکثر جگہ اس کے بدل تلاش کیئے گیئے، کوئلے کا پرانا بدل لکڑی تھی اور یہ ابھی تک مختلف ریلوں مثلاً جنوبی ہند، برما روہیل کھنڈ و کمایوں میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے، جنگ کی گرم بازاری کے زمانے میں جب کوئلے کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تو چند مزید بدل تلاش کیئے گیئے اور ۱۹۱۸ئہ میں کراچی اور بمبئی کے قریب تیل کا استعمال بطور ایندھن شروع ہوا، بعد میں بمبئی کی گرنیوں میں جل بجلی کا رواج ہو چلا اور بمبی کے قرب وجوار کی ریلوں میں کافی طویل فاصلوں کے لیے برقی طاقت استعمال ہونے لگی۔

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت کی تاریخ فی الحقیقت ایک دلچسپ رومان ہے یہ دراصل ایک صنعتی دماغ یعنی مسٹر جے، ین، ٹاٹا آنجہانی کی دور اندیشی اور ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی بعض کوششیں ہوئیں، لوہا و فولاد پیدا کرنے کی ابتدائی کوششوں میں سے ایک صوبہ مدراس میں پورٹو نوذو کے مقام پر ہوئی اور مسٹر ہیتھ نے ۱۸۳۰ئہ میں جدید طریقوں پر کام کا آغاز کیا جس کا سلسلہ چھٹے عشرے تک برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی کوششیں ہوئیں مگر وہ ناکام رہیں، کامیاب ہونے والا سب سے پہلا کاروبار خام لوہے کی پیدائش کے واسطے بارا کر کے مقام پر ۱۸۷۵ئہ میں قائم ہوا اور جس کو ۱۸۸۹ئہ میں بنگال کی لوہے کی کمپنی نے خرید لیا، طویل عرصے تک یہ کمپنی نفع بخش طریقے پر فولاد بنانے میں ناکام رہی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جو لوہا استعمال کیا جاتا تھا وہ بہت ہی ادنیٰ قسم کا ہوتا تھا لیکن بیس سال کی مسلسل جد وجہد کے بعد جب اچھے قسم کے خام لوہے کا پتا چلا تو اس کو منافع ہونے لگا۔ مسٹر واٹسن نے ۱۹۰۷ئہ میں اس کارخانے کے خام لوہے کی پیدائش کا اندازہ ۵۰ ہزار ٹن سالانہ

لگایا۔ آئندہ دس سال میں کارخانے میں توسیع اور جدید تنظیم ہوئی اور صنعتی کمیشن نے اس کے لوہے کی خام پیداوار کا اندازہ عام حالات میں دس ہزار ٹن ماہوار کیا تھا۔

صوبۂ متوسط میں ضلع چاندہ کے بعض آہنی مخزنوں کے متعلق ایک جرمن ماہر کی رپورٹ پڑھنے کے بعد مسٹر ٹاٹا کو سب سے پہلے ہندوستان میں لوہے و فولاد کی صنعت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، مگر اس وقت ان کو عہدے داروں کی عدم دلچسپی اور آئندہ کے متعلق لائسنس عطا کرنے والے ضابطوں کی دقتوں کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی۔ چند سال بعد پھر مسٹر ٹاٹا کو ہندوستان میں خام لوہا نکالنے کی دھن سوار ہوئی اور اس مرتبہ انھوں نے لارڈ جارج ہیملٹن کو جو اس وقت وزیرِ ہند تھے اس کی تعمیر میں دلچسپی لینے کے لیے تیار کر لیا اور اس طرح کم از کم سرکاری تنفر کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔ مسٹر ٹاٹا ریاستہائے متحدہ امریکا سے ایک فلزیاتی ماہر اپنے ساتھ لائے تاکہ وہ صوبجات متوسط کے معلوم شدہ ذخائر کی تحقیقات کرے، اصلی جگہ یعنی لوہارہ ضلع چاندہ کے خیال کو ترک کر دیا گیا کیونکہ ایک تو وہاں خام مال کافی نہ تھا دوسرے کوئلے کی دقت تھی، اس کے بعد صوبجات متوسط کے شرقی علاقے یعنی دُرگ کی تحقیقات کی گئی، یہاں خام لوہا تو کافی تھا مگر کوئلے کی دقت تھی چنانچہ بہار کے کوئلے اور دُرگ کے خام لوہے کے درمیان ایک اتصالی مقام پر نظر ڈالی گئی اس نوبت پر مسٹر پی، ین، بوس، ہندوستان کی ارضی تحقیقات کے ایک وظیفہ خوار عہدے دار کی خط و کتابت کی بنا پر جانچ کنندہ جماعت میور بھنج کی ریاست میں پہنچی اور وہاں اس کو خام لوہے کے بڑے مخزن مل گئے، جن کے کچھ حصوں سے ٹاٹا کمپنی اب استفادہ کر رہی ہے[2]۔ ٹاٹا کے لوہے و فولاد کے کارخانے کا

---

[1] واٹسن، رسالۂ بنگال میں لوہا و فولاد۔

[2] حالات سنہ ۱۹۰۴ء میں اس نوبت پر پہنچے اور اس عرصے (سنہ ۱۹۰۵ء) میں مسٹر جے، ین، ٹاٹا کا

آغاز سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوا، اس کا سارا سرمایہ ہندوستانی ہے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں کارخانے میں مشین کی تنصیب وغیرہ کا کام شروع ہوا، دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء میں پہلی مرتبہ لوہا اور سنہ ۱۹۱۳ء میں فولاد تیار کیا گیا کارخانہ جس بنیاد پر قائم ہوا تھا اس میں سالانہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن خام لوہا اور ایک لاکھ ٹن فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا خیال رکھا گیا تھا اور جیسے ہی کمپنی نے اپنی پیداوار بازار میں لانا شروع کی تو جنگ شروع ہوگئی، جس کی وجہ سے صنعت کی ترقی کے لیے بڑے موافق حالات پیدا ہوگئے، فولاد کی درآمد بڑی مشکل ہوگئی لہذا ہندوستانی کمپنیوں نے اپنی پیدائش میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء کے چند مہینوں میں ٹاٹا کمپنی نے برآمدی اغراض کے واسطے مقناطیس بھی بنانا شروع کیا لیکن بعد میں فولاد کی فوری ضروریات کے تحت یہ طے کیا گیا کہ آئندہ اس مرکب کو تیار نہ کیا جائے سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء کے قریب پرانا کارخانہ پورے شباب پر آگیا، ٹیرف بورڈ کے اعداد کے مطابق ۱،۴۷،۴۹۷ ٹن خام لوہا، ۱،۳۹،۴۳۳ ٹن فولادی اینٹیں اور ۹۸،۷۲۶ ٹن فولادی اشیا تیار ہوئیں، جن میں بھاری ریل کی پٹریاں اور سامان، سلاخیں اور ہلکی ساخت کی چیزیں زیادہ تھیں، جنگ کے زمانے میں جب طلب میں اضافہ ہوا تو کمپنی کو اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کی ترغیب ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء میں وسعت کی ایک بڑی تجویز تیار کی گئی اور اس اضافے کی پہلی قسط سنہ ۱۹۱۹ء میں پنکھوں والی بھٹی کی تنصیب تھی جس نے خام لوہا پیدا کرنے کی صلاحیت کو تگنا کر دیا سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء کے درمیان قدیم کارخانے میں فولاد دھونکنے کے واسطے تین کھلے ہوئے آتش دانوں کا اور اضافہ ہوا جس کی وجہ سے فولاد کی پیدائش ۲۷ فی صدی بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ٹیرف بورڈ کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲،۷۰،۲۷۰ ٹن خام لوہا، ۱،۸۲،۱۰۷ ٹن فولادی اینٹیں اور ۱،۸۱،۲۵۱

۲۶۱

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ انتقال ہوگیا۔

ٹن فولادی سامان تیار ہوا وسعتی تجاویز میں دو نئی انجن بھٹیوں کا اضافہ بھی شامل تھا، ان میں سے پہلی نے ۱۹۱۹ء اور دوسری نے ۱۹۲۲ء سے کام شروع کر دیا فولاد کی زائد پیدائش کے واسطے دو دو رخی بھٹیاں قائم کی گئیں نئے بیلن دار گرنیوں کا اضافہ ہوا اور اس طرح پلیٹ اور چادریں بنانیوالی گرنیاں، چادروں کی سلاخیں اور سیخوں کی گرنیاں قائم ہو کر پلیٹوں، چادروں اور چادری سلاخوں کی پیدائش ممکن ہوگئی۔ مجوزہ تجویز کے مطابق ان اضافوں کی تکمیل ۱۹۲۱ء تک ہو جانا چاہیے تھی لیکن ابتدا میں جنگ کی مشکلات اور بعد میں جنگ کے بعد والی گرم بازاری کی وجہ سے فرمائشات کی تکمیل جلد نہ ہو سکی اور تعمیر میں کافی دقت لگا اور یہ سب کام ۱۹۲۴ء میں مکمل ہوئے اور ان پر کام شروع ہو گیا۔

لیکن اس عرصے میں وہ حالات بالکل بدل گئے جن کے تحت یہ صنعت کام کر رہی تھی، جنگ کے زمانے میں لوہے اور فولاد کی درآمد بڑی دشوار تھی، اس لیے قیمتیں بہت اعلیٰ ہوگئیں جنگ کے ختم ہوتے ہی اوائل ۱۹۱۹ء میں قیمتوں میں بڑی تخفیف ہوگئی لیکن چونکہ اسی کے ساتھ خوش حالی کا دور شروع ہو گیا تھا اس لیے قیمتیں پھر بڑھنا شروع ہوئیں اور ۱۹۲۰ء میں ایک یادگاری معیار پر پہنچ گئیں، ۱۹۲۱ء میں سرد بازاری ایسی ہی رہی جیسی کہ گزشتہ سال گرم بازاری تھی اور ۱۹۲۱ء کے بعد قیمتوں میں مزید تخفیف شروع ہوئی، جب فولاد کی قیمت میں کمی ہوگئی تو مصارف پیدائش اچھے خاصے بڑھ گیے کیونکہ ۲۳-۱۹۲۱ء کے درمیانی سالوں میں کوئلے کی قیمت بڑھ گئی تھی اور اجرتوں میں بھی معقول اضافہ ہو گیا تھا۔

۲۶۲

۱۹۲۱ء کے بعد ٹاٹا کے لوہے و فولاد کے کارخانے نے اپنے آپ کو

سلہ ٹیرف بورڈ نے معلوم کیا کہ جنگ کے زمانے میں فولاد کی جتنی مقدار پیدا کرنا ممکن تھی وہ سب پیدا کی گئی، لیکن جنگ کے بعد درآمدی فولاد کی مسابقت کی وجہ سے کمپنی نے نوعیت کی طرف

مشکلات کے دور میں پھنسا ہوا پایا اور صنعت کی حالت کی وجہ سے ہندوستانی مالیاتی کمیشن کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی جس نے اپنی رپورٹ میں اس کا خاص تذکرہ کیا، اور جب اس کمیشن کی سفارشات پر ٹیرف بورڈ کا تقرر ہوا تو ٹاٹا کمپنی کی درخواست سب سے پہلے پیش ہوئی، ٹیرف بورڈ نے محسوس کیا کہ اگرچہ ہندوستان میں فولاد کی صنعت بالآخر بلا کسی تامین کے کھڑی ہو سکے گی لیکن اس وقت یہ ایک بڑے نازک عبوری دور سے گزر رہی ہے، جس کو تامین کے بغیر آسانی سے طے کرنا ممکن نہیں، ٹاٹا کے لوہے و فولاد کے کارخانے کی اصل تجویز کفایت شعاری پر مبنی نہ تھی البتہ ٹیرف بورڈ کی رائے تھی کہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں جو مزید توسیع ہوئی اس کی بدولت مصارف پیدائش میں بڑی کفایت ہو جائے گی، نیز یہ کہ کمپنی نے بہت سے بیرونی، با مہارت لوگوں کو ملازم رکھ لیا ہے لیکن جب کچھ عرصے بعد ہندوستانی ان کی جگہ لے لیں گے تو اجرت کی مد میں بھی تخفیف ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ ۱۹۱۹ء یا اس سے قبل مختلف ریلوں سے پٹریوں کے واسطے جو معاہدے کیے گئے تھے وہ نسبتاً ادنیٰ قیمتوں پر مبنی تھے اور ان کی وجہ سے کمپنی نقصان میں تھی، ٹیرف بورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹاٹا کمپنی کے واسطے ۱۹۲۳ء میں فولاد کو نفع بخش طریقے پر تیار کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن اس کا وسیع امکان ہے اور مستقبل میں قوی توقع ہے کہ جب مصارف پیدائش میں تخفیف ہو جائے گی تو صنعت کو تامین کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا ٹیرف بورڈ نے جس تامینی حد کی سفارش کی وہ ہندوستان میں درآمد ہونے والے فولاد کی قیمت اور اس قیمت کے فرق پر مبنی تھی جس پر ہندوستانی کارخانہ دار اس کو معقول منافع کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے۔ تامین تین سال کے واسطے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ہو زیادہ توجہ شروع کر دی، جس کی وجہ سے لاگت میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا۔

۲۶۴

عطا ہو کیونکہ آئندہ کی قیمتیں غیر متوقع ہیں، تامین اس طرح عطا کی جائے کہ عام مالی محاصل کے علاوہ ان اشیاء کی درآمد پر مزید معینہ محاصل عائد کئے جائیں جو ٹاٹا کمپنی تیار کرتی ہے نیز کٹے ہوئے لوہے کو بھی تامین دی جائے کیونکہ اس کی عام اقسام ان بہت سے کاموں میں استعمال ہو سکتی ہیں، جن میں فولاد استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز ریل کی پٹریوں اور لوہے کے جوڑوں کی تیاری پر بھی تین سال کے واسطے تدریجی پیمانے کے لحاظ سے خاص امداد دی جائے، ان سفارشات کی وجہ سے مجلس نے اس بات کی بھی سفارش کی کہ گھڑے ہوئے فولاد پر بھی محصول بڑھایا جائے تاکہ ہندوستان کی انجینیری کی صنعت اس دقت سے بچ جائے جو اس کو فولاد کی تامین سے اٹھانا پڑے گی، حکومت نے ان سفارشوں کو منظور کر لیا اور ۱۹۲۴ء میں فولاد کی صنعت (تامین) کا قانون نافذ ہو گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ٹیرف بورڈ کو پھر اس مسئلے پر رپورٹ پیش کرنا پڑی کیونکہ ان کے تخمینوں کے مطابق جس قیمت پر فولاد ہندوستان میں درآمد کیا جا سکتا تھا اس میں فولادی صنعت کی عالمی کساد بازاری اور ممالک یورپ کے مبادلوں کے تنزل کی وجہ سے بڑی گڑبڑ ہو گئی، فولاد کی قیمت بہت زیادہ گر گئی اور درآمد بہت بڑھ گئی، لہٰذا ٹاٹا کمپنی نے تامینی محاصل میں اضافے کی درخواست کی تاکہ نئی قیمتوں پر تامین کا پرانا معیار باقی رہ سکے ٹیرف بورڈ نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اس مسئلے پر رپورٹ کرتے ہوئے متلافی محاصل کا مشورہ دیا، لیکن حکومت نے اس کا بدل یہ تجویز کیا کہ ایک سال کے واسطے ۵۰ لاکھ کی ہیشتوں رقم امداد کے لیے مقرر کر دی۔ ۱۹۲۵ء میں مزید تحقیقات ہوئی اور حکومت امداد کے ذریعے مزید اعانت کرنے پر تیار ہو گئی اور آئندہ دو سال کے واسطے ۶۰ لاکھ کی امدادی رقم منظور کی۔ ۱۹۲۶ء میں تین سال کی اصل مدت ختم ہو گئی اور ٹیرف بورڈ کو دوبارہ فولاد کی صنعت کو تامین دینے کے

متعلق غور کرنا پڑا۔

بنگال کی لوہے کی کمپنی سب سے پہلی کمپنی ہے جس نے تجارتی طریق پر ہندوستان میں لوہے کی پیدائش کا کام شروع کیا، زیر تبصرہ دور میں اس کی ترقی اچھی خاصی رہی، جنگ کے زمانے میں اس کی پیداوار بڑھتی رہی اور جنگ کے آخری سالوں میں اس نے برآمد کے واسطے مقناطیس کثیر مقدار میں تیار کرنا شروع کیا۔ جنگ کے بعد والی کساد بازاری کا اثر خام لوہے کی صنعت پر کچھ زیادہ نہ ہوا، اس صنعت میں ہندوستان کو مخصوص طور پر چند فوائد حاصل تھے اور ۱۹۲۴ء میں ٹیرف بورڈ نے لکھا ہے کہ ہندوستان دنیا کے تمام دیگر ملکوں کے مقابلے میں خام لوہا ارزاں طریقے پر نکالتا ہے۔ ۱۹۲۴ء تک خام لوہے کی پیدائش خصوصیت سے منافع بخش رہی، لیکن فولادی صنعت میں کساد بازاری کی وجہ سے اس صنعت پر اثرات پڑنا لازمی تھے اور ۱۹۲۵ء میں طلب میں کمی اور قیمتوں میں بہت زیادہ تخفیف ہوگئی، بنگال کی لوہے کی کمپنی کو اپنا کلتی کا کارخانہ کچھ عرصے کے لیے بند کرنا پڑا، اس مرتبہ قیمتوں میں اس قدر تخفیف ہوئی کہ ٹیرف بورڈ نے اندازہ لگایا کہ تابین کے تحت ٹاٹا کے واسطے یہ زیادہ منافع بخش ہے کہ وہ لوہے کو خام شکل میں فروخت کرنے کے بجائے اس کو زیادہ سے زیادہ فولاد میں ڈھالے، خام لوہے کی صنعت میں کساد بازاری بہت جلد ختم ہوگئی اور اس کے کچھ سال بعد ہندوستانی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوا، بنگال کے لوہے کا کارخانہ ۲ لاکھ ٹن سالانہ خام لوہا پیدا کرسکتا ہے اور اس کا بڑا حصہ خود کمپنی کے ہاں یا ہندوستان کے دوسرے لوہا ڈھالنے والے کارخانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ۲۶۴

لوہے کا دوسرا اہم کارخانہ انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی ہے جس کا آغاز جنگ کے فوراً بعد ہی ہوا، یہ کارخانہ آسنسول کے قریب ہیراپور میں واقع ہے، دھونکنے والی بھٹی نے سب سے پہلے نومبر ۱۹۲۲ء

میں کام شروع کیا، اصل تجویز میں فولاد کی پیدائش شامل تھی لیکن جنگ کے بعد فولادی صنعت کی حالت کے مدنظر یہی طے کیا گیا کہ فی الحال صرف خام لوہا ہی پیدا کیا جائے، اس کارخانے میں اوسطاً سال بھر میں ۳ ½ لاکھ ٹن خام لوہا پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ سب کا سب فروخت کیا جاتا ہے اور اس کا بڑا حصہ ہندوستان سے برآمد کیا جاتا ہے۔ اب ہندوستان میں لوہے کی صنعت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکی ہے، جنگ کے بعد والے دور میں خام لوہے کی پیدائش میں کافی اضافہ ہوا، درآمد میں تخفیف ہو کر اب وہ بالکل معمولی سطح پر آگئی ہے، ہندوستان میں نہ صرف اتنا خام لوہا پیدا ہوتا ہے جتنا کہ فولاد کی بھٹیوں کے واسطے ضروری ہے بلکہ اس کے پاس برآمد کے لیے کچھ ماحصل بھی بچ رہتا ہے، حالیہ سالوں میں تجارت برآمد میں اچھی خاصی ترقی ہوئی اور جاپان اس کا خاص خریدار ہے، لیکن ۱۹۳۰-۳۱ء کے درمیان تجارت کی حالت کچھ اچھی نہ رہی۔

ہندوستان کے فولادی کارخانوں میں صرف ٹاٹا کے لوہے و فولاد کا کارخانہ ہی اہمیت رکھتا ہے، مشکلات اور دقتوں کے باوجود ۱۹۲۳ء میں جب اس کاروبار کو تائین مل گئی تو اس نے اپنی حالت درست کرنا شروع کی، اگرچہ اس زمانے میں یہ کوئی خاص منافع تقسیم نہ کر سکا اور یہ اس وجہ سے ممکن نہ تھا کیونکہ تائین محض صنعت کے عبوری دور میں اس کی اقل ترین ضرورت کو پوری کرنے کے واسطے عطا کی جاتی ہے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں پانچویں بھٹی کا اضافہ ہوا اور اب خام لوہے کی سالانہ پیدائش کا اوسط ۹ لاکھ ٹن ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس میں کافی توسیع ہوئی، نئی دو رخی بھٹیوں کی وجہ سے فولاد کی پیدائشی صلاحیت کافی بڑھ گئی، ڈھلے ہوئے فولاد کی پیداوار ۱۹۲۳-۲۴ء میں ایک لاکھ ۶۳ ہزار ٹن، ۱۹۲۴-۲۵ء میں ۳ لاکھ بیس ہزار ٹن اور ۱۹۲۵-۲۶ء میں ۴ لاکھ بیس ہزار ٹن رہی، ۱۹۲۶ء میں ٹیرف بورڈ نے اندازہ لگایا کہ تائین کے دور میں

بہتر طریقوں کی ترویج ہوئی، اس کی بدولت نیز کاروبار میں اضافے اور کوئلے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے مصارف پیدائش میں تخفیف ہوگئی، لہٰذا بہتر طریقوں کے استعمال کے اثرات پوری طرح واضح نہ ہوسکے، اب پرانی مشینیں فرسودہ ہوچکی تھیں اور کاروبار جس طرح قائم تھا اس میں کوئی موزوں تناسب باقی نہ رہا تھا، لہٰذا ان دقتوں کو دور کرنے کے لیے کمپنی نے توسیع کا ایک نیا خاکہ تیار کیا جس کو بورڈ نے منظور کرلیا۔ اس کی بدولت چند سال میں ڈھلے ہوئے فولاد کی پیدائش کا اوسط ۶ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گا، اور مصارف پیدائش میں بھی کمی ہوجائیگی بورڈ کا خیال تھا کہ اگرچہ با مہارت بیرونی لوگوں کے بجائے کچھ ہندوستانیوں کا تقرر ہورہا ہے لیکن ابھی تک نیم ماہر اور غیر مہارت شدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، بورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ گو صنعت کی حالت رو بہ ترقی ہے مگر ابھی اس کو تامین کی ضرورت ہے۔ مگر اس کا معیار پہلے سے کم ہونا چاہئے، سات سال کے لیے تامین کی سفارش کی گئی، اور ٹاٹا والوں کا خیال تھا کہ ۱۹۳۳-۳۴ء تک صنعت اس قابل ہوجائے گی کہ وہ بلا کسی تامین کے سہارے کھڑی ہوسکے تامین کی حد کا اندازہ اسی طرح لگایا گیا جیسا کہ ۱۹۲۴ء میں کیا گیا تھا، امدادی رقومات کو منسوخ کرنے اور ادنیٰ شرح محاصل کے پیمانے کو رائج کرنے کی تجویز کی گئی، اگرچہ تامین کی سفارش صرف جمشید پور کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کی گئی تھی، لیکن یہ بھی یقین تھا کہ اگر ہندوستان میں فولاد کا کوئی اور کارخانہ کھلا تب بھی یہ کافی ہوگی بورڈ نے اس امر پر بھی زور دیا کہ ہندوستان میں تامین کی کوئی تجویز اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ ریلوں کا تعاون حاصل نہ ہو، کیونکہ ہندوستان میں فولاد کی سب سے بڑی خریدار وہی ہے۔ بورڈ کی اصل تجویز کو حکومت نے منظور کرلیا ۱۹۲۷ء میں فولاد کو تامین عطا کرنے والا قانون نافذ ہوگیا، اگرچہ مجلس مقننہ میں بورڈ کی اس سفارش کی بڑی مخالفت ہوئی کہ اس نے برطانوی

اور غیر برطانوی فولاد میں امتیاز کیا۔[1] ۲۷-۱۹۲۶ء جدید تامین کا پہلا سال تھا اور اس سال ٹاٹا نے مزید توسیع وغیرہ پر ۸۰ لاکھ روپیہ صرف کیا۔ ان کاموں کی مجموعی لاگت کا اندازہ تین کروڑ روپے ہے اور پانچ چھ سال کے اندر ان کی تکمیل ہو سکے گی توسیع کی خاص مدیں نرکول، خام لوہے اور فولاد کی پیدائش کے اضافے پر مشتمل ہوں گی اور ان کی وجہ سے ڈھلنے والی گرنیوں اور کارخانے کے دوسرے شعبوں میں حسب ضرورت اضافہ کیا جائے گا۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں کمپنی کی پیداوار (ہزار ٹنوں میں) حسب ذیل تھی[2] نرکول ۸۴۰، تارکول ۲۵، ایمونیا سلفیٹ ۹، گندھک کا تیزاب ۱۵، خام لوہا ۶۴۴، فولادی اینٹیں ۶۰۰ اور فولاد کا سامان ۴۰۸۔

اب ہندوستان میں لوہے و فولاد کی صنعت ایک جما ہوا کاروبار سمجھا جا سکتا ہے اور معقول اندازوں کے مطابق چند سال میں اس کو تامین کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ سنگ بھوم اور بہار و اڑیسہ کے دوسرے حصوں میں ہندوستان کے پاس خام لوہے کے ایسے ذخیرے موجود ہیں جن کا کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے دنیا کے کسی ملک سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ہندوستانی فولادی صنعت جس قیمت پر خام لوہا پیدا کر سکتی ہے، اس حیثیت سے اس کو دوسرے ملکوں کی تمام مصنوعات پر تفوق حاصل ہے، چونا اور انعطافی مسالے قریب ہیں اور ارزاں ہیں، لیکن نرکول کی تیاری میں صورت حال اس قدر اچھی نہیں ہے، ہندوستان میں جو کوئلہ دستیاب ہوتا ہے وہ دوسرے فولاد پیدا کرنے والے ملکوں کی بہ نسبت ادنیٰ قسم کا ہے

---

[1] ۳۰-۱۹۲۹ء میں قلعی دار چادروں کی قیمت اس قدر ادنیٰ سطح پر آگئی کہ ٹاٹا کمپنی مجبور ہوئی کہ اس صنعت کی پیداوار کے واسطے تامین کی درخواست کرے، ٹیرف بورڈ کی تحقیقات کے بعد ۱۹۳۱ء میں حکومت نے قلعی دار چادروں کی درآمد پر ایک مزید محصول عائد کیا۔

[2] کمپنی کی سالانہ رپورٹ بابت ۲۷-۱۹۲۶ء۔

اور اس کی مقدار بھی محدود ہے، ٹیرف بورڈ نے یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان میں نرکول بنانے کے فلزاتی ذرائع کو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے، لیکن موجودہ صورت حال سے صنعت کو کوئی نقصان اس لیے نہیں پہنچتا کیونکہ کوئلہ گو ادنیٰ ہے لیکن نسبتاً ارزاں ہے، پھر یہ کہ لوہا ڈھالنے والے تینوں کارخانوں کے پاس چونے اور ڈولومیٹ (Dolomite) کی اپنی کانیں اور کول سالیں ہیں، اور کہیں بھی خام مال کے واسطے دو سو یا ڈھائی سو میل سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا بلکہ فاصلہ عموماً اس سے کم ہی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں محنت اس وجہ سے گراں رہی کیونکہ ماہر مزدوروں کو باہر سے درآمد کرنا پڑتا تھا، لیکن اب ہندوستانیوں کو تربیت دینے کا کام قابل اطمینان طریقے پر جاری ہے، تمام حالات اس بات کی طرف اشارا کر رہے ہیں کہ آخر کار ہندوستان میں فولاد کی خود کفیل صنعت قائم ہو جائے گی اور ۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ نے یہ پیشین گوئی کی اگر اس صنعت کے نگراں ترقی یافتہ مسلک پر قائم رہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ ۲۶۷

۱۹۲۲ء تک ٹاٹا کے لوہے و فولاد کا کارخانہ صرف ہلکی اور بھاری ریل کی پٹریاں توے، جوڑ، اور سلاخیں بنانے کا کام کرتا رہا لیکن اب وہ پلیٹ، ٹین کی سلاخیں، سیاہ چادریں، قلعی دار چادریں، اور ریل کی پٹریوں کے فولادی کنارے بھی تیار کرنے لگا ہے کیونکہ خام لوہے کی پیدائش کے مقابل کارخانے کی فولاد سازی کی صلاحیت کم ہے اس وجہ سے ۱۹۲۰ء کے بعد کارخانے میں خام لوہے کی بڑی مقدار فروخت کے واسطے بچنے لگی، لیکن اس کی مقدار میں بتدریج کمی ہوتی رہی، اور اب جتنا خام لوہا پیدا ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ خود کارخانے کے اندر صرف ہو جاتا ہے، کمپنی کو کول تار اور امونیا سلفیٹ کی بڑی مقدار بھی فروخت کے واسطے دستیاب ہو جاتی ہے جو نرکول کی ذیلی پیداواریں ہیں، اس صنعت کی موجودہ مشکلات بہت زیادہ ہیں، فولاد کی قیمتیں

بہت ہی ادنیٰ معیار پر آگئی ہیں اور کساد بازاری کی وجہ سے ہندوستانی ریلیں جو طلب کا ایک اہم ذریعہ تھیں متاثر ہوئیں ٹیرف بورڈ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی تجاویز کی کامیابی کا بڑا دارومدار ہندوستانی ریلوں کے اشتراک پر ہے، چند سال سے ریلوں کی جانب سے حسب توقع فرمائشات نہیں آرہی تھیں اور اس وجہ سے ٹاٹا والے مجبور ہوئے کہ اپنی فولادی صنعت کے واسطے بیرونی بازار تلاش کریں، حال ہی میں اٹاوا کانفرنس کے ذریعے برطانوی فولادی صنعت سے معاہدہ کر لینے کی وجہ سے ان کو ایک جزوی بازار مل گیا، ریلوں کی فرمائشات میں جو کمی ہوئی اس کی جزوی تلافی اس طرح کی گئی کہ ریلیں ٹاٹا کے کارخانے سے جو پٹریاں خریدتی ہیں ان پر معاہدے کے حساب سے ۲۰ روپے فی ٹن زائد ادا کریں، یہ معاوضہ ٹیرف بورڈ کے اشارے پر عمل میں آیا۔

کمپنی صرف خام فولاد پیدا کرتی ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جمشید پور ان تمام صنعتوں کا ایک مرکز بن جائے گا جن میں خام فولاد ایک اہم خام مال کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے، جنگ کے بعد والے دور خوش حالی میں جبکہ تمام صنعتوں میں ترقی کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں تو اس وقت یہ تجویز تھی کہ جمشید پور اور اس کے گرد و نواح میں کم سے کم سترہ ذیلی صنعتیں قائم کی جائیں۔ لیکن ان میں سے اکثر تو ابتدائی مراحل ہی میں ختم ہو گئیں جن مجوزہ صنعتوں کا خیال ترک کیا گیا ان میں سب سے زیادہ اہم برما کارپوریشن کی خام جست کو پگھلانے کی تجویز تھی اور تنہا اسی پر ہندوستان میں گندھک کے تیزاب بنانے کا انحصار تھا۔ بعض اور تجاویز تھیں جنھوں نے عملی صورت اختیار کر لی ان میں ریلوں کے ڈبے، انجن، زرعی آلات، تار کی مصنوعات، ٹین کی چادریں، لوہے کا قلعی دار سامان اور تار وغیرہ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے، ان میں سے اکثر مثلاً اسٹیل وائرس پروڈکٹس محدود، اینملیڈ آیرن

ویرس محدود، انڈین ٹن پلیٹ کمپنی کو ٹاٹا کمپنی نے فولاد مہیا کرنے کے خاص انتظامات کیے، ان میں سے بعض صنعتیں کساد بازاری کے زمانے میں پریشان رہیں اور انھوں نے ٹیرف بورڈ کے سامنے تامین کے واسطے اپنے دعاوی پیش کیے۔

ہندوستان میں ریل کے ڈبے بنانے کا آغاز جنگ سے پہلے نہیں ہوا، دراصل اس کا محرک حکومت کو قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے ۱۹۱۸ء میں اس بات کی ضمانت لی کہ وہ ہر سال ایک مقررہ تعداد میں ڈبے خریدا کرے گی۔ بشرطیکہ ان کی قیمت ان ڈبوں سے زیادہ نہ ہو جو درآمد کیے جاتے ہیں۔ اس اعلان کے فوراً بعد ہی "دی انڈین اسٹینڈرڈ ویگن کمپنی" قائم ہوئی، لیکن ۱۹۲۴ء تک بیرونی مسابقت کی وجہ سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، ۱۹۲۴ء میں ٹیرف بورڈ نے اس صنعت کے تحفظ کے واسطے امداد کی سفارش کی، حکومت نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک تین سال کے لیے اس صنعت کی امداد منظور کر لی، لیکن اپنی پچھلی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کر لی کیونکہ اب صنعت کو تامین مل چکی تھی، تامین کی بدولت ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں مسابقتی قیمت پر ڈبے تیار کرنا ممکن ہوا، بشرطیکہ فرمائشات کافی ملتی رہیں اور ہندوستانی ریلوں کی کثیر طلب کا بڑا حصہ مقامی طور پر پورا کیا جائے، لیکن اس صنعت کو برقرار رکھنے کے واسطے جتنی فرمائشات کی ضرورت تھی وہ برابر نہ آ رہی تھیں۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان اکثر اوقات اس بات کی شکایت کی گئی کہ ہندوستانی ریلوں نے اپنی فرمائشیں باہر بھیجدی ہیں، لیکن سب سے زیادہ دقت یہ ہوئی کہ ریلوے بورڈ نے ۱۹۲۷ء میں یہ محسوس کیا کہ اس کے پاس ضرورت سے زائد ڈبے موجود ہیں، اور اس نے فوراً ہی اپنی فرمائشات میں کمی کر دی، ۱۹۲۷ء میں جب یہ مسئلہ ٹیرف بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے بتایا کہ صنعت کو تامین کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ تمام فرمائشات

ہندوستان ہی سے پوری کی جائیں، ان سفارشات کو منظور کر لینے کے باوجود یہ شکایت کی گئی کہ فرمائشیں بہت کم ہیں اور حکومت کے ریلوں کے ورکشاپ (مثلاً جمشید پور میں انجن سازی کا کارخانہ) کی وجہ سے فرمائشوں میں اور کمی ہوگئی۔ لہذا اس وقت صنعت کی حالت بڑی خراب ہے ہندوستان میں انجن بنانے کی کوشش صرف ایک کمپنی نے کی، لیکن یہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی، اور بعد میں اس کے کارخانے کو حکومت نے لے لیا۔ ۱۹۲۴ء میں ٹیرف بورڈ نے تار اور کیل کی صنعت کے واسطے اس بنا پر تامین کی سفارش کی کیونکہ یہ فولاد کی ایک ضمنی صنعت ہو جائے گی۔ لیکن ٹاٹا کمپنی تار کی سلاخوں کی مطلوبہ مقدار فراہم کرنے سے قاصر رہی اور صنعت کو اپنے کام کے واسطے خام مال درآمد کرنا پڑا، یہ بات غیر نفع بخش رہی اور باوجود تامین اور حکومت بہار و اڑیسہ کی کافی امداد کے یہ کمپنی معاشی طور پر ناکام رہی، آخر کار ۱۹۲۷ء میں کارخانہ بند کرنا پڑا۔ اور اس وجہ سے ۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ نے خاص محاصل اٹھا لینے کی سفارش کی، اس کمپنی کو پھر دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی اور ۱۹۳۱ء میں تامین کے واسطے تازہ درخواست پیش ہوئی یہ ٹیرف بورڈ کے سامنے آئی اور اس کی سفارش پر حکومت نے مارچ ۱۹۳۲ء میں تار اور کیل پر تامینی محاصل عائد کر دیے۔

۲۶۹

ہندوستان میں ٹین کی پلیٹوں کی صنعت کی تاریخ اس سے بالکل متضاد ہے، ٹاٹا کے لوہے و فولاد کے کارخانے اور برما کی تیل کی کمپنی کے باہمی اشتراک سے "انڈین ٹن پلیٹ کمپنی" کی بنیاد پڑی دسمبر ۱۹۲۲ء سے کام شروع ہوا، یہ صنعت ایک عرصے سے جنوبی ویلز کے ساتھ مخصوص ہو گئی تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ موسمی حالات اور با مہارت محنت کی قلت کی وجہ سے ہندوستان میں یہ صنعت ترقی نہ کر سکے گی مگر دوسری طرف ملک میں اس کی کثیر طلب موجود تھی، اور یہ ایک فائدہ تھا، ۱۹۲۴ء میں صنعت کے واسطے تامین کی سفارش کی گئی اور اس کے اثر سے آیندہ

تین سال میں اس صنعت نے تیزی سے ترقی کی، مقدار پیدایش میں اضافہ اور مصارف میں تخفیف ہو گئی، ۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ کی رائے تھی کہ یہ ایسی صنعتی ترقی کی بڑی اچھی مثال ہے جس نے امتیازی تامین کی بدولت نسبتاً بہت ہی قلیل عرصے میں ترقی کی، اس صنعت کی ترقی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی مزدوروں کو آسانی سے تربیت دی جا سکتی ہے اور اس کی وجہ سے چھ سال کے اندر درآمدی مزدوروں کی تعداد نصف کے قریب رہ گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ نے اس کے واسطے تخفیف شدہ پیمانے پر سات سال کے واسطے تامین کی سفارش کی، اور رولنگز کے کارخانہ داروں کا یہ اعتراض مسترد کر دیا کہ ہندوستان میں یہ صنعت کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو سکے گی۔

ہندوستان میں انجینیری کی صنعت نسبتاً ایک پرانی صنعت ہے اگرچہ اس کو خام مال کا بڑا حصہ باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے، اس میں گوناگوں اقسام کی چیزیں مثلاً ڈھبری اور پیچ سے لیکر ریلوں کے پل تک تیار ہوتے ہیں، پھر یہ سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے ۱۹۲۴ء میں ٹیرف بورڈ نے ہندوستان میں تمام ڈھلے ہوئے فولاد پر ۲۵ فی صدی محصول بحساب قیمت عائد کرنے کی سفارش کی تاکہ اس طرح صنعت کی وہ دشواری دور ہو جائے جو کہ خام فولاد پر بڑھے ہوئے محصول کی وجہ سے پیش آتی ہے، ۱۹۲۷ء تک یہ صنعت کافی ترقی کر چکی تھی اس لیے محصول ۱۰ فی صدی کر دیا گیا، اگرچہ وہ تمام توقعات جو ۱۹۲۰ء میں وابستہ کی گئی تھیں پوری نہ ہوئیں لیکن جنگ کے بعد والے دور میں ہندوستان میں نہ صرف فولاد کی صنعت قائم ہو گئی بلکہ مختلف اقسام کی ایسی متعدد صنعتیں قائم ہو گئیں جو ٹاٹا کا تیار کردہ فولاد بطور خام مال استعمال کرتی تھیں۔

جنگ اور جنگ کے بعد ساری دنیا میں پٹرول کی صنعت اہمیت اور وسعت دونوں لحاظ سے بہت بڑھ گئی، اس زمانے میں

دنیا کی کل پیدائش تقریباً تگنی ہوگئی اور پٹرول کی مصنوعات کے استعمال کے بہت سے نئے طریقے وجود میں آگئے، مگر ہندوستان کی صنعت نے اس عرصے میں کچھ زیادہ ترقی نہیں کی[1]۔ برما ہی معدنی تیلوں کی پیداوار کا ایک اہم ذریعہ ہے، برما کی کانوں کی پیداوار جنگ کے زمانے میں بڑھی رہی لیکن ۱۹۲۱ء کے بعد سے ان میں برابر تخفیف ہو رہی ہے، برما میں تیل کی پیدائش کے متعلق ٹیرف بورڈ کی رائے ہے کہ یہاں سوائے سنگو اور انڈا کی کانوں کے دوسری تمام کانیں بیشترین حد پر پہنچ گئی ہیں، اور ان میں آیندہ مزید تخفیف کا امکان ہے[2]۔ البتہ آسام اور اٹک کی نئی کانوں میں وسعت کے کافی امکانات موجود ہیں، ۱۹۲۱ء سے آسام کی کانوں میں کافی ترقی ہو رہی ہے اور اب آیندہ کے لیے اٹک کی کانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں، ۱۹۲۴ء کے بعد سے برما کی مقدار پیدائش میں برابر کمی ہو رہی ہے، اس کے برخلاف آسام اور اٹک دونوں کی پیدائش بڑھ رہی ہے، ۱۹۲۴ء میں ۳۰۶۰ لاکھ گیلن کی کل مقدار میں سے برما نے ۲۵۳۴ لاکھ، آسام نے ۳۳۵ اور پنجاب نے ۱۹۲ لاکھ گیلن پٹرول پیدا کیا۔ پٹرول کی صنعت کی حالت اس کی بازار کی وجہ سے بہت ہی مستحکم ہے، ہندوستان میں مٹی کے تیل کی طلب برابر بڑھ رہی ہے اور درآمد جو جنگ کے زمانے میں بہت کم رہی وہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں بہت ہی ادنیٰ حد پر آگئی لیکن اس میں پھر اضافہ ہونے لگا اور یہ قبل از جنگ والے دور سے بڑھ گئی، یہ اندازہ لگایا گیا کہ اس وقت مٹی کے تیل کی اندرونی رسد کل مقدار رسد سے ۳۰، ۴۰ فی صدی کے درمیان کم ہے[3]۔ حالیہ سالوں

۲۷۱

[1] ۱۹۱۳ء میں ہندوستان نے ساری دنیا کی پیدائش کا ۲ فی صدی حصہ فراہم کیا لیکن ۱۹۲۳ء میں یہ مقدار صرف ۰۳ء ۱ فی صدی رہ گئی، اس کے بعد سے تناسب برابر کم ہوتا جارہا ہے۔

[2] تیل کی صنعت کو تامین عطا کرنے کی بابت رپورٹ ص ۲۔

[3] حوالہ جات گزشتہ۔

میں پٹرول کی دوسری مصنوعات کی طلب بھی برابر بڑھ رہی ہے، سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے مقابلے میں سنہ ۱۹۲۶ء میں پٹرول کی طلب میں ۲۶۱ فی صدی کا اضافہ ہوا[۱]۔ لیکن چونکہ برما کی پیداوار بھی بڑھ گئی اس لیے سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء تک عملی طور پر ہندوستان اپنے پٹرول کے معاملے میں بیرونی ذرائع کا محتاج نہ تھا۔ اگرچہ درآمد میں اضافہ ہو رہا ہے مگر بحیثیت مجموعی اس کی مقدار قلیل ہے۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں صرف ۱۳۰ لاکھ گیلن درآمد رہی، اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ جنگ کے بعد والے دور میں ذرائع نقل و حمل میں موٹروں کا دائرہ بڑھ رہا تھا۔ ایندھن کے واسطے تیل کی طلب میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے، اس کی مقامی پیداوار بہت ہی مختصر ہے اور استعمال ہونے والے تیلوں کی بڑی مقدار درآمد کرنا پڑتی ہے، جنگ سے پہلے ان کی درآمد صرف ۸۰ لاکھ گیلن کے قریب تھی لیکن اس وقت کوئلے کی گرانی کی وجہ سے ریلوں، جہازوں اور دوسرے کاروباری اداروں کو تحریص ہوئی کہ وہ تیل بطور ایندھن استعمال کرنا شروع کر دیں، اس لیے جنگ کے زمانے میں بھی درآمد میں کچھ اضافہ ہوا، لیکن سب سے پہلی مرتبہ اضافہ سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں ہوا جب درآمد ۲۷۶ لاکھ گیلن ہوئی، اس کے بعد سے صرف میں اضافہ ہوتا رہا اور درآمد جو صرف کے بڑے حصے پر مشتمل ہوتی تھی سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد کبھی ۱۰ کروڑ گیلن سالانہ سے کم نہیں رہی، اس صنعت کی تمام مصنوعات کی ملکی طلب کثیر ہے اور صنعت کو اس پر پورا اقتدار بھی حاصل ہے، سنہ ۱۹۲۷ء کے درمیان ہندوستانی صنعت کو بیرونی حریفوں کی وجہ سے قیمتوں کے شدید مسابقتی دور سے گزرنا پڑا لیکن یہ ایک اتفاقی صورت تھی اور ٹیرف بورڈ کی رائے میں اس صنعت میں اس مشکل پر غالب آنے کی کافی صلاحیت تھی

---

[۱] حوالہ جات گزشتہ۔

پٹرول کی صنعت (مجموعی پیداوار)

	سنہ ۱۹۱۶ء	سنہ ۱۹۱۹ء	سنہ ۱۹۲۶ء	سنہ ۱۹۲۹ء
تیل گیلنوں میں	۲۹،۷۱،۸۹،۷۸۷	۳۰،۵۶،۵۱،۸۱۶	۲۸،۰۳،۶۹،۳۴۶	۳۰،۶۱،۴۸،۰۹۳

خام مغنیسہ ہندوستان کی اُن معدنی پیداواروں میں شامل ہے جو خام شکل میں برآمد کی جاتی ہیں، جنگ کے ابتدائی سالوں میں اس صنعت کو بعض دشواریاں پیش آئیں لیکن سنہ ۱۹۱۶ء کے بعد جب تمام اتحادی ملکوں میں ذخائر حرب کی کثیر طلب محسوس کی جانے لگی تو یہ صنعت تیزی سے بحال ہوگئی، خام مغنیسیہ کی طلب وافر تھی اور قیمتیں بہت اعلیٰ ہوگئیں، لیکن مقدار پیدائش میں جہازوں کی غیر معمولی دشواری کی وجہ سے اضافہ نہ ہوسکا، اگرچہ کسی حد تک اس دشواری کو خاص انتظامات کی بدولت رفع کرنے کی کوشش کی گئی، جنگ کے فوراً بعد ہی سنہ ۱۹۲۰ء میں پیداوار ایک یادگاری حد پر پہنچ گئی اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں پھر اس میں کمی ہوگئی، بعد میں پھر اس نے اپنی حیثیت بحال کرلی اور اس کی ترقی برابر قائم رہی، جنگ کے بعد والے دور میں ہندوستان کا خاص حریف روس میدان سے الگ رہا، اور نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے برازیل کی مسابقت کے اثرات بھی محسوس نہ ہوئے، مگر حال میں اس نے اپنی حالت سنبھال لی نیز فولاد کی پیدائش میں تخفیف کی وجہ سے یہ صنعت بڑی سرد ہوگئی۔ ہندوستانی صنعتی ارتقا کے لحاظ سے اس صنعت کی کوئی فوری اہمیت نہیں ہے، اگرچہ ملک کے خام مغنیسیہ کے مخزنوں سے آئندہ فولاد کی اعلیٰ اقسام کی تیاری کی ترقی میں کافی مدد ملے گی۔ جنگ کے آخری سال میں یہ چیز منافع بخش معلوم ہوئی کہ مقناطیس بنا کر درآمد کیا جائے، یہ کام خاص طور پر بنگال آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے کیا۔ اور سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں تقریباً ۱۱ ہزار ٹن برآمد کیا گیا،

۲۷۲

یورپ اور امریکا میں جس قسم کے مقناطیس کی طلب تھی اس کی پیدائش میں دشواری کی وجہ سے بعد میں یہ کاروبار پھر سرد پڑ گیا۔ اور حالیہ سالوں میں اس کی برآمد ۲ ہزار سے ۵ ہزار ٹن کے درمیان متغیر ہوتی رہتی ہے، اور ۱۹۳۰-۳۱ء کے بعد سے یہ برآمد تقریباً بالکل ختم ہو گئی ہے۔

ہندوستان ابرک پیدا کرنے والے ملکوں میں ابھی تک ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، ابرک کی پیداوار کا خاص خطہ بہار و اڑیسہ ہے، ہندوستان میں اس کی کان کنی بہت ہی فرسودہ طریقوں پر ہوتی ہے اور ابرک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے زیادہ تر سلطنت متحدہ کو براہ راست برآمد کیے جاتے ہیں، آغاز جنگ پر ابرک کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچا کیونکہ جنگ سے پہلے اس میں جرمن مفادات کو بڑا دخل تھا اور ہمتی صنعت پر نگرانی تھی جو اس کی خاص خریدار تھی۔ طلب میں بڑی تخفیف ہو گئی اور حکومت کی نگرانی نے اس کی حالت اور خستہ کر دی، چونکہ یہ ذخائر حرب میں استعمال ہوتی تھی اس لیے ۱۹۱۶ء سے حکومت نے ابرک کی بڑی مقدار خریدنا شروع کر دی، اور قیمتوں کے اضافے کی وجہ سے اس صنعت میں خوش حالی کا ایک دور پیدا ہو گیا، جو اختتام جنگ تک جاری رہا۔ خوش حالی میں سب برابر کے شریک تھے کیونکہ ادنیٰ و اعلیٰ دونوں قسموں کی عام طلب موجود تھی، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان اگرچہ ابرک کی اعلیٰ قسم کی طلب برقرار رہی مگر ادنیٰ اقسام کی مانگ زیادہ نہ رہی، اس وجہ سے پیداوار میں تخفیف ہو گئی، آیندہ دو سال یعنی ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء ابرک کی صنعت کے واسطے شدید کساد بازاری کے تھے لیکن ۱۹۲۳ء کے بعد سے طلب اور پیداوار دونوں میں خصوصاً اس وجہ سے بھی اضافہ ہوا کہ ابرک کی قسم اچھی کر دی گئی تھی۔ ہندوستان میں ابرک بہت ہی کم صرف ہوتی ہے اور اس کی زیادہ مقدار برآمد ہی کی جاتی ہے کساد بازاری نے قدرتی طور پر ابرک کی پیدائش اور برآمد دونوں کو متاثر کیا، اور مزید براں یہ اندیشہ بھی ہے کہ روڈیشیا ایک نئے

۲۷۳

مسابقت کنندے کی حیثیت سے عالمی بازار میں ہندوستان کی اس حیثیت کو بھی متاثر کردے گا جو اس کو اب تک حاصل ہے۔

ہندوستان میں نائٹریٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ ملے ہوئے شورے کی پیدائش کا عمل بہت قدیم زمانے سے جاری ہے ۱۸۶۰ء تک ہندوستان کو شورے کا اجارہ حاصل تھا، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے چلی کے نائٹریٹ کے انکشاف کے بعد اس صنعت کی اہمیت میں بڑی کمی ہوگئی، شورے کی پرانی طلب زیادہ تر آلات حرب کے واسطے تھی مگر انیسویں صدی کے آخری اعشروں میں اس میں بڑی کمی آگئی، البتہ چین میں آتشبازی کے واسطے اور لنکا اور ماریشس میں کھاد کے واسطے اس کی طلب برابر باقی تھی، بہار واڑیسہ صوبۂ متحدہ اور پنجاب کے بعض اضلاع میں شورہ جمع کرنا یا فرسودہ طریقوں پر شورہ سازی کرنا بعض مزارعین کی ذیلی آمدنی کا قابل لحاظ حصہ تھا، ان اضلاع میں شورہ صاف کرنے والے چند کارخانے بھی تھے، جنگ کی وجہ سے آلات حرب کے واسطے شورے کی مانگ بڑھی اور جنگ کے زمانے میں یہ صنعت خوش حال رہی، شورے کی قیمتیں بڑھ گئیں اور حکومت نے شورہ سازی کو ترقی دینے کی کوششیں شروع کیں۔ خوشحالی چند روزہ تھی اور لڑائی کے ختم ہوتے ہی اس صنعت میں زوال شروع ہوگیا، جنگ سے پہلے شورے کی برآمد کا اوسط ۳۰۵ ہزار ہنڈرڈ ویٹ تھا، جنگ کے زمانے میں یہ ۴۴۰ ہزار ہنڈرڈ ویٹ ہوگیا، آلات حرب کے لیے طلب ختم ہوگئی اور چلی کے نائٹریٹ اور فرانس کے پوٹاش نمکوں کی وجہ سے کھادوں کے واسطے بیرونی طلب میں بھی کمی آگئی جنگ کے بعد برآمد کا اوسط قبل از جنگ والے اوسط سے بھی کم رہ گیا، اور ۱۹۲۵ء کے بعد سے برآمد کا اوسط تقریباً ایک لاکھ ہنڈرڈ ویٹ کے قریب رہا۔ شورے کی ملکی طلب میں صرف آسام کے چائے کے باغات قابل لحاظ ہیں جو کھاد کے واسطے شورہ خریدتے ہیں

۲۷۴

ہندوستان کی معدنی پیداواروں میں قیمت کے لحاظ سے سونے کی ابھی تک اہمیت ہے، ورنہ ویسے یہ ایک غیراہم صنعت ہے، ہندوستان میں کل دنیا کی مقدار پیدائش کا صرف ۲ فی صدی کے قریب سونا پیدا ہوتا ہے اور اہم کانوں میں صرف کولار کی کانیں ہیں، ۱۹۰۵ء کے بعد سے کولار کی کانوں کی حالت بڑی خراب ہوگئی ہے اور سونے کی قیمتوں میں تخفیف کی وجہ سے زیر تبصرہ دور میں سونے کی پیدائش میں برابر تخفیف ہوتی رہی۔

ہندوستان میں سیسے کی پیدائش ایک نئی معدنی صنعت ہے، اس کا آغاز شمالی برما میں باؤڈن کی کانوں سے ہوا، جو اب دنیا میں سیسہ، چاندی اور جست کی ایک بڑی کان بن گئی ہے[1]۔ ہندوستان کی طلب بہت زیادہ ہے، اور مزید ترقی کے بعد یہ ساری طلب ملکی پیدائش سے پوری ہو جایا کریگی، ۱۹۱۹ء کے بعد سے پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں مقدار پیدائش ۱۹,۰۹۰ ٹن سے بڑھ کر پانچ سال یعنی ۱۹۲۳ء میں ۴۶,۰۶۰ ٹن ہوگئی۔ اس کے ساتھ ان کانوں سے جست اور چاندی بھی کافی مقداریں حاصل کی گئیں۔ ۱۹۳۰ء پیدائش کا ایک یادگاری سال تھا جس میں ۵۲۹,۸۱۴ ٹن خام چاندی اور سیسہ نکالا گیا۔ جس میں ۸۰,۰۳۰ ٹن صاف شدہ ۰۰,۷۱ ٹن سرمے دار سیسہ، ۷,۰۵۴,۲۰۶ اونس صاف شدہ چاندی، ۱۷,۱۴۶ ٹن گندھکی تانبہ، ۳,۱۵۰ ٹن نکل کے مرکبات اور ۵۷,۶۲۰ ٹن جست کے ٹکڑے تھے[2]۔

زیر تبصرہ دور کے بیشتر حصے میں چائے کی صنعت خوش حالی کے اچھے دور سے گزرتی رہی، یہ صنعت اپنے آغاز سے تقریباً مسلسل اور

---

[1] ہندوستان کی معدنی پیداواروں کی پنجسالہ رپورٹ ۱۹۱۹-۲۳ء۔

[2] ہندوستانی معدنیات کے صدر ناظر کی رپورٹ بابت ۱۹۳۰ء۔

برابر ترقی کرتی چلی آرہی ہے اور جب ـ لڑائی شروع ہوئی تھی اس وقت
اس کی حالت غیر معمولی طور پر اچھی تھی ـ لڑائی چھڑتے ہی فوراً قیمتیں بڑھنا
شروع ہوئیں، لہذا کاشت عمیق کی ترغیب شروع ہوئی، پیدائش
اور برآمد دونوں لحاظ سے مقدار گزشتہ اعداد سے آگے نکل گئی ـ
جنگ کے آخری سالوں میں جہازوں کی قلت کی دشواریوں کا سامنا
رہا، اور قیمتوں کا وہ معیار قائم نہ رہا جو سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء میں پہنچ گیا تھا،
دوسری اشیائے برآمد کی طرح چائے کی برآمد پر بھی جنگ کے آخری
سالوں میں حکومت کی نگرانی قائم ہوگئی اور سلطنت متحدہ کی وزارت
خورو نوش کے ذریعے چائے کثیر مقدار میں خریدی جانے لگی، اور اس وجہ
سے ان سالوں میں ہندوستانی صنعت کی حالت بہت بہتر ہوگئی،
سنہ ۱۹۱۴ تا ۱۹ء کے سال نخل بندوں کے لیے بڑے اچھے تھے، سنہ ۱۹۱۴-۱۷ء
تک قیمتیں قبل از جنگ والے معیار سے اونچی رہیں، دوسری طرف
مزدوروں کی اجرتیں یکساں رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زمانہ اعلیٰ
منافعوں کا دور رہا، جدید باغ اور نئی توسیعیں شروع ہوئیں اور پرانے باغوں
نے اپنی پیداوار بڑھانا شروع کی، سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کی راہ میں دشواری
پیدا ہوگئی اور آیندہ دو سال سخت کساد بازاری کے رہے، ان دو
سالوں کی مالی دشواریوں کے دو اسباب تھے، پہلا تو شرح مبادلہ
میں اضافہ اور دوسرا چائے کی قیمتوں میں تخفیف، قیمتوں میں تخفیف عام کساد بازاری
کی وجہ سے ہوئی، طلب کی کمی کے ساتھ افراطی پیدائش اور کچی کونپلوں
کا توڑ لینا ٹل گیا، سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء چائے کی کمپنیوں کے لیے بہت ہی خطرناک
سال تھا، لیکن دوسری صنعتوں کے برخلاف بحالی بہت تیزی سے
پیدا ہوگئی ـ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء کے بعد سے دوسرا دور شروع ہوا جس میں
قیمتوں اور پیدائش دونوں میں اضافہ شروع ہوا اور مقدار جنگ
کے زمانے سے آگے نکل گئی ـ ۱۹۲۵ء میں قیمتیں پھر گر گئیں لیکن مقدار
پیدائش کو محدود کر دینے کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۰ء کی خستہ حالی دوبارہ پیدا

۲۸۵

نہ ہو سکی سنہ ۱۹۳۰ء کی عالمی کساد بازاری نے چائے کی صنعت کو متاثر نہیں کیا، کیونکہ چائے کے عالمی پیدا کنندوں میں مقدار کی تحدید کر دینے کے مکمل معاہدے ہو گئے تھے، دوسرے سال معاہدے کی تجدید نہ ہو سکی، اور چائے کی قیمتیں سنہ ۱۹۳۱ء کے بعد تیزی سے گرنے لگیں، اس تخفیف کی وجہ یہ تھی کہ جاوا اور سماترا میں مقدار پیدائش بہت بڑھ گئی تھی، ہندوستانی چائے کا بازار زیادہ تر بیرونی ہے اور کل پیداوار کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ برآمد کیا جاتا ہے، گزشتہ عشرے میں ہندوستانی صنعت نے اپنے قبل از جنگ والے ایک اہم خریدار یعنی روس کو کھو دیا، اس نقصان کی تلافی اس طرح کی گئی کہ سلطنت متحدہ، کناڈا، اور ریاستہائے متحدہ کو برآمد ہونے والی مقدار میں اضافہ کر دیا گیا۔

مزدوروں کے مسئلے میں ہمیشہ مختلف دشواریاں حائل رہیں، بالخصوص آسام کے چائے کے باغوں میں حالت بڑی خراب تھی، مزدوروں کی بھرتی کے طریقے اور مختل بندیوں میں جو حالات مروج تھے ان پر ہمیشہ نکتہ چینی ہوتی رہی، قیمتوں میں اضافہ ہو گیا، مگر اس کے معاوضے میں اجرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا اور اس کے مضر اثرات سارے ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگوں پر پڑ رہے تھے، چائے کے باغات میں صورت حال خاص طور پر ابتر تھی، یہاں مزدور بمشکل آزاد حیثیت رکھتے تھے، بیشتر صورتوں میں طویل مدت کے معاہدے ہوتے تھے اور آجروں کو اپنے مزدوروں پر غیر معمولی قانونی اختیارات حاصل تھے، اور اکثر صورتوں میں وہ غیر قانونی سختیاں بھی برتتے تھے[1]، سنہ ۱۹۲۲ء میں جس کمیٹی نے آسام کے مزدوروں کے حالات کی تحقیقات کی تو اس کو معلوم ہوا کہ بعض باغوں میں مزدوروں کی اجرت میں تقریباً ربع صدی سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

[1] آسام کے مزدوروں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ باب پنجم (سنہ ۱۹۲۱ء)۔

حتیٰ کہ خود نخل بندوں نے ۱۹۱۸ء میں یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ان کی اجرتوں میں اضافہ ضروری ہے مگر اس کے باوجود ۱۹۲۲ء تک یہ نہیں دیا گیا، کپڑے اور اشیائے خوردنی کی اعلیٰ قیمتوں نے مزدوروں کی حالت بہت ہی نازک کر دی، اور جہاں ان کو دھان کے لیے الاونس دیے جاتے تھے وہاں بھی وہ عام طور پر ناکافی تھے، اور ان کو خراب چاول ملتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نخل بند کاروبار کے مزدوروں کا معیارِ زندگی بہت ہی پست ہو گیا۔ مزدوروں کو بھرتی کرنے والے باغ کے سردار ہوتے تھے، جو صوبہ متحدہ، بہار و اڑیسہ کے گنجان اضلاع سے مزدور بھرتی کیا کرتے تھے، اعلیٰ اجرت ہی مزدوروں کو ترکِ وطن کی ترغیب کا باعث ہو سکتی ہے اور یہاں ۲۲-۱۹۲۱ء تک چائے کے باغات کا یہ عالم تھا کہ بہت سے چائے کے باغوں کے وہ قلی، جنھوں نے وہاں کے حالات سے تنگ آکر ملازمت چھوڑ دی اپنے آبائی وطن کے اضلاع میں بہت آسانی سے اعلیٰ اجرت پر کھپ گئے۔ بعض حصوں میں صورتِ حال اس قدر خراب رہی کہ وہاں مسلسل ہڑتالیں اور جھگڑے ہوتے رہے اور ایک مقام کو تو تقریباً بالکل خالی کر دیا گیا ۱۸۵۹ء سے قلیوں اور نخل بندوں کے تعلقات قانونی طور پر منضبط کر دیے گئے تھے لیکن انھوں نے آجروں کو اپنے مزدوروں پر نامناسب اختیارات عطا کر دیے تھے، ۱۹۰۱ء کا قانون جس نے طویل مدت کے معاہدوں کو کچھ منضبط کیا ۱۹۱۵ء میں منسوخ کر دیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں ۱۸۵۹ء کے قانون میں مزید ترمیمات ہوئیں، ۱۹۲۰ء میں جس دفعہ کی سب سے اہم ترمیم ہوئی وہ یہ تھی کہ ایک سال سے زائد مدت کے معاہدوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ چائے کی انجمنوں کی جانب سے اس نئی دفعہ کی بڑی سخت مخالفت ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ اکثر صورتوں میں اس کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے

بہرحال معاہدہ ۱۹۲۳ء کے قانون تک قابل تعزیر رہا اور ۱۹۲۶ء سے منسوخ قرار دیا گیا۔[1] صوبۂ مدراس میں آجروں اور مزدوروں کے درمیان اس قسم کے تعلقات ۱۹۲۹ء تک جاری رہے، ۱۹۲۲ء کی کمیٹی کی اکثریت کی رائے تھی کہ "دوُاروں" میں آزاد مزدوروں کا جو طریقہ ہے اس کے مقابلے میں آسام میں مزدور بھرتی کرنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا طریقہ بہت ہی خراب ہے، کمیشن مزدوران نے بھی اسی پر زور دیا۔[2] کمیشن نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ بھرتی کی نگرانی کے قاعدے میں کوئی فوری تغیر نہیں کیا جا سکتا، یہ سفارش کی کہ ۱۹۰۱ء کا قانون منسوخ کر دیا جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا قانون نافذ کیا جائے جو کم تحدید کرنے والا ہو، اور اس میں ایسی دفعات ہوں تاکہ معاہدہ کچھ مدت میں خود بخود ختم ہو جائے، انھوں نے آسام کی مجلس مزدوران کو توڑنے اور اس کے بجائے تارکان وطن کے واسطے ایک محافظ کے تقرر کی سفارش کی، کمیشن نے سب سے زیادہ اہم مشورہ یہ دیا کہ تمام نقل وطن کرنے والے مزدوروں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ تین سال کی ملازمت کے بعد آجروں کے خرچ سے اپنے گھر واپس لوٹ سکیں۔

ہندوستان میں جدید نخل بند کاروبار میں ربر کا اور اضافہ ہوا، ۱۹۰۱ء سے قبل یہ صنعت بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور مقدار برآمد بہت ہی کم تھی، ۱۹۱۳ء میں ربر کے تحت مجموعی رقبہ تقریباً ۴۶ ہزار ایکڑ تھا، جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد ربر کے بازار اور اس کے استعمال دونوں میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور ساری دنیا میں اس کی پیدائش دن دونی اور رات چوگنی بڑھنے لگی۔ ہندوستان میں بھی اوسط

[1] کمیشن مزدوران کو معلوم ہوا کہ اس ترمیم سے مزدور کمیشن کے دورے کے وقت تک بے خبر تھے ہندوستان میں مزدوروں کے متعلق شاہی کمیشن کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) صفحات ۷۸-۳۷۷۔

[2] حوالۂ مندرجۂ بالا، ابواب ۱۹، ۲۰۔

بڑھ گیا اور ۱۹۱۹ء میں ۱۰۱۸۵۰۰ ایکڑ اور ۱۹۲۷ء میں ۱۵۱۵۰۰ ایکڑ رقبہ زیرِ کاشت رہا۔ ربر کی پیدائش کے سلسلے میں ہندوستان کی حیثیت بہت ہی معمولی ہے اور یہاں دنیا کی کل پیداوار کا تقریباً تین فی صدی ربر پیدا ہوتا ہے، اور خام ربر کا بازار دوسرے کاروبار کرنے والوں کی نگرانی میں ہے، ۱۹۲۷ء میں کل رقبے کا ۵۱ فی صدی برما میں، ۳۱ فی صدی ٹراونکور میں، ۹ فی صدی مدراس میں اور ۶ فی صدی کوچین میں تھا، اور اس صنعت میں اوسطاً روزآنہ ۵۲۸۹۹ آدمی کام کرتے تھے۔

ہندوستان میں بھاری کیمیاوی اشیا کی عدم موجودگی کو صنعتی کمیشن نے سب سے اہم صنعتی نقص بتلایا ہے، جنگ کے زمانے میں جب آلاتِ حرب کے واسطے مختلف کیمیاوی اشیا کی طلب بڑھی تو اس وقت اس صنعت کی قومی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اور یہ توقع کی گئی تھی کہ جنگ کے زمانے میں چونکہ ان کو خاص مواقع اور ترغیبات حاصل رہیں گی لہٰذا ہندوستان میں کیمیاوی صنعتیں مستحکم طور پر قائم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ فی الوقت ہندوستان میں کیمیاوی اشیا کی طلب مختصر ہے کیونکہ ملک میں ایسی صنعتیں موجود نہیں جو کیمیاوی اشیا مثلاً شیشہ، صابن یا رنگ اور دواؤں کو بڑی مقدار میں استعمال کرتی ہوں، مثال کے طور پر گندھک کا تیزاب کیمیاوی صنعت میں استعمال ہونے والی ایک خاص شے ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اگر گندھک کے تیزاب کی طلب کو ہندوستان کی کیمیاوی صنعتوں کی پیمائش کا آلہ قرار دیا جائے تو ہندوستان میں صنعتی ترقی بالکل ابتدائی حالت میں ہے[1]۔ توقع یہ تھی کہ جمشید پور میں جست کو صاف کرنے والے کارخانوں میں گندھک کے تیزاب کی کافی مانگ ہوگی لیکن یہ تجویز

۲۷۸

[1] فاکس، گندھک کا تیزاب، ہندوستانی صنعتوں اور مزدوروں کا بلیٹن نمبر ۲۸۔

عملی صورت اختیار نہ کر سکی ' اس وقت ہندوستان میں جو تیزاب بنایا جاتا ہے وہ باہر سے آئی ہوئی گندھک سے تیار ہوتا ہے ' لہذا اس کی قیمت لازمی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور دراصل جن کی ضرورت ہے وہ ارزاں قسم کے تیزاب اور القلی ہیں ' ہندوستان میں درآمد ہونے والی کیمیاوی اشیا میں سوڈے کے مرکبات ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ' اور مقامی طور پر ان کی ارزاں طریقے پر عدم فراہمی ایک بڑی دشواری ہے۔ چند سال پہلے یہ خیال کیا گیا تھا کہ صوبۂ متحدہ کی ریہ زمینوں یا ہندوستان کے دوسرے حصوں سے ارزاں قلوی مرکبات حاصل ہوسکیں گے[1] لیکن یہ توقعات پوری نہ ہوئیں۔

جنگ کے زمانے سے ہندوستان میں کیمیادی اشیا کی طلب میں قابل لحاظ اضافہ ہوگیا ہے اور خصوصاً اس صنعت کے اس شعبے میں اضافہ ہوا جس کی بنیاد گندھک کے تیزاب پر ہے ' پیدائشی اکائیاں ہر صورت میں بہت مختصر ہیں ' اور ان کے کارخانے بڑے بڑے صنعتی مرکزوں کے قریب مقامی طلب پوری کرنے کے واسطے قائم ہوگئے ہیں ٹیرف بورڈ کے سامنے جب اس صنعت کو تامین دینے کی درخواست پیش ہوئی تو اس نے بتایا کہ بھاری کرایوں کی وجہ سے ہندوستان میں تیزابوں کی تیاری کا کام نفع بخش طریقے پر کیا جاسکتا ہے ' لیکن اس قسم کی قدرتی تامین کی عدم موجودگی کی وجہ سے گندھک کے تیزاب سے جو مختلف نمک حاصل کئے جاسکتے ہیں ' ان کی پیدائش کسی بڑے پیمانے پر نہ ہوسکی ' بورڈ کی رائے تھی کہ مقامی طور پر گندھک کی فراہمی کوئی ایسی بڑی دشواری نہیں ہے ' اور اس کا خیال تھا کہ قومی اہمیت کے لحاظ سے یہ صنعت تامین کی مستحق ہے ' ٹیرف بورڈ کو اپنی حقیقی تجاویز پیش کرنے

[1] واٹسن و مکرجی " و مخازن ریہ کی تجارتی افادیت " جرنل آف انڈین انڈسٹریز اینڈ لیبر (مئی ۱۹۲۲ء)۔

میں جس خاص دشواری کا سامنا ہوا وہ یہ تھی کہ کوئی مخصوص کارخانہ ایسا نہ تھا جس کی بنیاد پر مصارف پیدائش کا یقین کیا جا سکے، کیونکہ تحقیقات کے وقت جتنے بھی کارخانے موجود تھے وہ سب کے سب بہت ہی چھوٹے پیمانے پر کام کر رہے تھے، ہندوستان میں ان کیمیاوی اشیا کی طلب کا سب سے بڑا بازار بمبئی ہی تھا، لہٰذا ٹیرف بورڈ نے اپنی تجاویز کو محض ایسی ایک کارخانے پر منحصر کر دیا جو بمبئی کی طلب پوری کر رہا تھا۔ بورڈ کی یہ رائے بھی تھی کہ مناسب ہوگا کہ اس کاروبار کی تجدید اس بنیاد پر کی جائے کہ سارے ہندوستان کی طلب ایک ہی واحد اکائی سے پوری ہو سکتی ہے، بہرحال اس نے کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی جس سے اس میں یا دوسرے کاروبار میں کوئی انضمام ہو جائے، حکومت نے بھی اپنی تحریک (ستمبر ۱۹۳۱ء) میں اس بات کو تسلیم کر لیا کہ محاصل کا تعین صنعت کو دوامی استحکام عطا کرنے کے بجائے محض اس میں کچھ تغیر کر دے گا۔ تاہم اس نے جو محصول ٹیرف بورڈ نے تجویز کئے تھے ان کو مناسب خیال کیا اور ان میں سے بیشتر کو مصنوعات کی مختلف اقسام پر عائد کر دیا۔ ۲۷۹

۱۹۲۴-۲۵ء کے بعد سے ساری دنیا میں بحیثیت مجموعی شکر کی مقدار پیدائش میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتیں مسلسل گھٹنے لگیں، ہندوستان میں اعلیٰ محاصل مال کے باوجود ملک میں کھانڈ اور جدید کارخانوں کی پیدا شدہ شکر دونوں کی قیمتیں غیر منافع بخش تھیں، اور اس کا اثر ہندوستان کے کثیر نیشکر کی کاشت کرنے والے صوبوں یعنی صوبۂ متحدہ، بہار و اڑیسہ، اور پنجاب پر پڑا۔ اور یہاں کی صوبہ واری حکومتوں نے شاہی تحقیقاتی زرعی کونسل کے حالیہ قائم شدہ ادارے کے توسط سے شکر کو تامین عطا کرنے کی درخواست کی، اس مسئلے کی تحقیقات کے سلسلے میں ٹیرف بورڈ کو عجیب و غریب حالات سے سابقہ پڑا شکر کی صنعت کو تامین عطا کرنے کا مسئلہ مختلف

اقسام کے پیدا کنندوں پر مشتمل تھا، سب سے پہلا کاشتکار تھا اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں نیشکر اس کی معیشت میں بڑا اہم درجہ رکھتی تھی، پھر گڑ پیدا کرنے والا تھا، اگرچہ ٹیرف بورڈ کی رائے میں یہ نیشکر کی قیمتوں سے براہ راست متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد مختلف اقسام کی شکر مثلاً دیسی کھانڈ، یا لال شکر یا دیسی طریقوں پر سفید شکر بنانے والے یا گڑ صاف کرنے والے کارخانے تھے اور سب کے بعد میں نیشکر سے براہ راست شکر تیار کرنے والے جدید کارخانے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب زرعی مفادات کو تامین عطا کرنے کا مسئلہ پہلی مرتبہ ٹیرف بورڈ کے سامنے آیا۔ اور بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ نیشکر کی کاشت کی اہمیت کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ نیشکر کے کاشتکاروں کے مفاد کی حفاظت بھی کی جائے، بورڈ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ قومی مفاد کے تحت نیشکر کے رقبۂ کاشت میں تخفیف کرنا ضروری ہے اور نیشکر کے واسطے ایک نئی راہ اس طرح تلاش کی جائے کہ سفید شکر کی صنعت میں توسیع کی جائے لیکن جب تک سفید شکر کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش ہو تو امکان ہے کہ گڑ کے بازار میں سرد بازاری پیدا ہو جائے جو طبقۂ مزارعین کو بری طرح متاثر کرے گی، اور زرعی طریق میں گڑ بڑ پیدا کر دے گی، اس کی وجہ سے گنّے کی کاشت بڑے رقبوں پر ختم ہو جائے گی۔

۲۸۰

اگرچہ ٹیرف بورڈ کا خیال تھا کہ سفید شکر کی درآمد نے اب تک شکر کی قیمتوں کو متاثر نہیں کیا تاہم اُسے اندیشہ تھا کہ جاوا کے گڑ اور درآمد شدہ شکر سے مصنوعی گڑ کی تیاری کہیں شکر کی صنعت کو نقصان نہ پہنچا دے، لہذا انھوں نے شکر کی درآمد پر محصول عائد کرنے کی سفارش کی۔ سفید شکر کی صورت میں انھوں نے محصول کے ایسے پیمانے کی سفارش کی جس سے جدید کارخانوں اور دیسی طریقوں پر شکر بنانے والوں دونوں کی ضروریات پوری ہو جائیں، اس لحاظ سے پندرہ سال کے واسطے تامین

کی سفارش کی گئی اور بورڈ کا یہ خیال تھا کہ اس مدت کے اختتام پر گو ہندوستانی شکر کی قیمتیں جاوا اور کیوبا کا مقابلہ نہ کرسکیں گی تاہم یہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے پیچھے نہ ہوں گی، ستمبر ۱۹۳۱ء میں حکومت نے ان سفارشات کو منظور کرلیا، اس کا اور ساتھ ہی ساتھ ساری دنیا میں شکر کی پیدائشی تحدید کا نتیجہ یہ ہوا کہ گڑ اور دیسی کارخانے والی دونوں قسم کی شکر کی مقدار پیدائش بڑھ گئی اور دوسرے سال ملک میں شکر کے متعدد نئے کارخانے کھل گئے۔

جنگ کے زمانے میں چمڑے اور دباغت کی صنعت کو کافی تقویت پہنچی کیونکہ فوجی جوتوں کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، اس وقت یہ صنعت تقریباً اسی حالت میں ہے جیسی کہ ۱۹۱۴ء میں تھی، جنوبی ہند اور صوبۂ بمبئی میں متعدد کارخانے ہیں جو گایوں کی کھالوں سے نیم پختہ چمڑے تیار کرکے زیادہ تر برآمد کرتے ہیں، اس صنعت میں مشینوں کا استعمال بہت کم ہے، جدید قسم کے چمڑے کا کام کرنے والے چند کارخانے بھی ہیں، یہ جنگ سے قبل خاص طور پر کانپور میں تھے، جنگ کے اختتام پر کلکتے کے گرد و نواح اور دوسرے مقامات پر چمڑے کے کارخانے کھولے گئے، لیکن ان میں سے بیشتر نے صرف معمولی ترقی کی اور زیر تبصرہ دور میں اس صنعت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔

سمنٹ اور دیاسلائی دو ایسی جدید صنعتیں تھیں جن کا آغاز اس دور میں ہوا جنگ سے قبل ہندوستان میں سمنٹ کا صرف ایک کارخانہ تھا، لیکن جنگ شروع ہونے کے بعد تین نئے کارخانوں کا اضافہ ہوا، جنھوں نے جنگ کے زمانے میں پیدائش کا کام شروع کردیا، یہ پوربندر، کٹنی اور بوندی کے کارخانے تھے، یہ کارخانے حکومت کے لیے بہت ہی باموقع ثابت ہوئے، لہذا جنگ کے آخری سالوں میں یہ سرکاری نگرانی میں رہے، جو ۱۹۱۹ء کے وسط تک جاری رہی جنگ کی وجہ سے ان کو اچھا خاصا آغاز مل گیا اور خوش حالی کے دور میں تعمیراتی

۲۸۱

کاموں میں اضافے کی وجہ سے ان کو مزید مدد مل گئی، پورٹ لینڈ سمنٹ نے حالیہ زمانے میں غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اس کا صرف تیزی سے بڑھ رہا ہے، ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے چونے کی بہتات ہے اور یہ سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے، جنگ اور بعد از جنگ والے دور کی خوش حالی سے اس صنعت کو کافی امداد ملی۔ ۲۵-۱۹۲۲ء کے درمیان ملک کے مختلف حصوں میں سات نئی کمپنیاں قائم ہوئیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراطی پیدائش اور قیمتوں میں شدید مسابقت شروع ہوگئی ۲۵-۱۹۲۳ء کے سال خاص طور پر اس صنعت کے لیے خراب تھے اور اس نے حکومت سے تامین کی استدعا کی، ٹیرف بورڈ کی رائے تھی کہ اندرونی بازار میں اس صنعت کی تباہی کی ذمہ داری باہمی مسابقت پر تھی، اور صنعت کو بمبئی اور کلکتے کی بندرگاہوں میں بڑی دشواری تھی کیونکہ ہندوستان میں پورٹ لینڈ سمنٹ کے خاص خریدار یہی تھے اور یہاں برآمدی سمنٹ ہندوستانی سمنٹ سے کافی ارزاں تھا، بورڈ نے تامین کی جو سفارش کی وہ یہ تھی کہ ہندوستانی سمنٹ کو ان دونوں بندرگاہوں پر امدادی رقم دی جائے مگر حکومت نے یہ تجویز قبول نہ کی، بہر حال صنعت کساد بازاری سے جلد ہی نکل گئی اور حالیہ سالوں میں ہندوستانی مقدار پیدائش بڑھ رہی ہے۔

ہندوستان میں دیاسلائی کی صنعت کو محصول مال سے ایک عجیب قسم کی تامین ملنے کی صورت نظر آتی ہے ۱۹۲۲ء میں حکومت نے مالی اغراض کے واسطے دیاسلائی کی درآمد پر ڈیڑھ روپیہ فی گروس کے حساب سے محصول عائد کیا، اس سال سے قبل ہندوستان میں دیاسلائی کی صنعت کوئی خاص حیثیت نہ رکھتی تھی، لیکن اس اعلیٰ شرح محصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں چند ہی سال میں یہ صنعت کامیاب طریقے سے بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی، دیاسلائی کی صنعت میں تقریباً تمام کام

یا تو ہاتھ سے کیے جاتے ہیں یا مشین سے، اور اس میں پیدائش کے مختلف مدارج نظر آتے ہیں، مثلاً وہ کارخانے جن میں مشین استعمال ہوتی ہے اور جن کی پیدائش پیمانۂ کبیر پر ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ گھریلو صنعتیں ہیں جن میں کسی قسم کی مشین کا استعمال نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں مقامی طور پر اس کی طلب کا بڑا بازار موجود ہے، لیکن دیا سلائی کے لیے موزوں قسم کی لکڑی بڑی مقدار میں دستیاب نہیں ہو رہی ہے، لہٰذا جزءً یا کلیۃً درآمدی لکڑی استعمال کی جاتی ہے، اندرونی صنعت کی ترقی سے درآمد اور محصول مال دونوں میں تخفیف ہونے لگی اور سنہ ۱۹۲۶ء میں حکومت نے ٹیرف بورڈ کو اس نئی صورت حال پر غور کرنے کے لیے مامور کیا، اور بورڈ نے سفارش کی کہ محصول مال کو اسی مقدار سے تامینی محصول میں تبدیل کر دیا جائے، اور یہ رائے بھی ظاہر کی کہ آگے چل کر اس صنعت کو تامین کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے اس صنعت کی ترقی کا حال معلوم ہو سکے گا۔ قبل از جنگ درآمد کا اوسط ۱۴۶ لاکھ گروس تھا اور جنگ کے بعد ۱۲۷ لاکھ گروس رہا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں یہ گھٹ کر ۴۳ لاکھ گروس رہ گیا، اور سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں اس کا اوسط صرف ایک لاکھ گروس رہا۔ اس صنعت کو تامین عطا کرنے کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کس طرح بیرونی سرمایہ داروں کو تامین کے فوائد سے محروم کیا جانا چاہیے کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اس صنعت کا بڑا حصہ اسکینڈی نیویا سنڈیکیٹ پر مشتمل ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دور میں ہندوستانی صنعتوں میں قابل لحاظ ترقی ہوئی، لیکن اصلی صورت حال میں بہت کم تبدیلی ہوئی، قومی معیشت میں منظم صنعتوں کا حصہ بہت ہی کم ہے اور صنعتی آبادی کا بڑا حصہ معمولی موسمی یا متفرق صنعتوں یا مرمت کے کاموں میں لگا ہوا ہے، روئی دابنے اور صاف کرنے، جوٹ دبانے والے، چاول اور چوبینے کی گرنیاں، انجینیری کے کارخانے، اور ڈھالنے والے کارخانے ہی ایسے ہیں جن میں ہندوستان کی

۲۸۲

جدید صنعتوں کی آبادی کا بڑا حصہ مصروف ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے صنعتی اعداد کی جو خصوصیت تھی وہی صورت ۱۹۲۱ء کے صنعتی اعداد و شمار میں بھی نظر آتی ہے جیسا کہ مندرجۂ ذیل اعداد سے ظاہر ہوگا۔ ۱۹۲۱ء میں تعریف کو وسیع کر دیا گیا اور اس میں وہ کاروبار آ گئے جہاں دس سے زائد اجرتی مزدور کام کرتے ہوں، لہٰذا ۱۹۱۱ء کے اعداد سے ان کا تقابل نہیں کیا جا سکتا۔[1] درج ہونے والے کارخانوں کی تعداد ۱۵،۶۰۶ تھی، جن میں ۲۶،۸۱،۱۲۵ آدمی (۱۹،۹۴،۳۱۴ مرد اور ۶،۸۶،۸۱۱ عورتیں) کام کرتے تھے۔ ۸،۰۱۵ کارخانوں میں کسی قسم کی قوت متحرکہ کا استعمال ہوتا تھا۔ ۵،۲۹۳ کارخانے بھاپ سے، ۱،۳۳۵ تیل سے، ۱۰۱۳۷ بجلی سے ۱۶۵ گیس سے اور ۸۰۵ پانی سے چلتے تھے، صنعتوں کی اہم اقسام حسب ذیل تھیں:-

صنعت	کام کرنے والے مزدور	صنعت	کام کرنے والے مزدور
چائے کے باغات	۷،۴۷،۶۶۱	آٹے اور چاول کی گرنیاں	۴۹،۹۹۱
روئی کاتنے اور بننے والی گرنیاں	۳،۵۰،۶۷۹	چھاپے خانے	۴۹،۴۷۸
جوٹ کی گرنیاں	۲،۸۷،۳۳۶	کافی کے باغات	۴۰،۳۰۴
کول سالیں	۱،۸۱،۵۹۴	لوہے و فولاد کے کارخانے	۳۹،۴۴۹
ریلوں کے کارخانے	۱،۱۲،۵۳۲	پیٹرول صاف کرنے والے کارخانے	۳۳،۵۳۴
روئی اوٹنے اور دبانے والی گرنیاں	۸۳،۰۵۵	پتھر اور مرمر کی کانیں	۲۵،۴۷۰
دھات اور انجنیری کے کارخانے	۸۲،۱۸۲	شکر کے کارخانے	۴۲،۳۶۹
اینٹ اور کویلو کے کارخانے	۷۵،۰۲۰	معدن ہائے طلا	۲۲،۱۸۶

چونکہ ۱۹۲۱ء میں صنعت کی تعریف میں وسعت پیدا کر دی گئی تھی

[1] ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے نتائج ابھی مہیا نہیں ہوئے۔

لہٰذا آسانیِ تقابل کی خاطر سنہ ۱۹۱۱ء کے نمونے پر بھی ایک جدول تیار کی گئی اس میں بعض اعداد دلچسپ ہیں، مثلاً بجلی کی اہمیت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں گیس اور بجلی کے کارخانوں کی تعداد ۱۴ تھی جس میں ۶۸۰ ر ۲ آدمی مصروف تھے، اور سنہ ۱۹۲۱ء میں ان کی تعداد ۸۱ تھی جن میں ۸۲۵ ر ۵ ر ۱ مزدور کام کرتے تھے، اینٹوں کے کاروبار اور چونے کی بھٹیوں میں کثیر اضافے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد تعمیراتی کاموں میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، اس کے برخلاف دوسری صورتوں میں یا تو اضافہ بالکل نہیں ہوا یا بہت کم ہوا لیکن یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ سنہ ۱۹۲۱ء اکثر صنعتوں کے واسطے شدید کساد بازاری کا سال تھا۔

صنعتی مردم شماری میں جو اعداد پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ہندوستان میں کتنے آدمی جدید صنعتوں میں مصروف ہیں، کیونکہ اکثر صورتوں مثلاً چائے اور کافی کے باغات میں جو آدمیوں کی ایک کثیر تعداد مصروف ہے وہ دراصل ایک زرعی پیشے میں لگی ہوئی ہے، ہندوستان کے بڑے صنعتی کاروبار کے جو اعداد کبھی کبھی حکومت کی جانب سے شایع کئے جاتے ہیں ان سے تصویر کے صحیح رخ کا زیادہ اندازہ ہو سکتا ہے، اس وقت تازہ ترین اعداد سنہ ۱۹۲۹ء کے ہیں، ان سے کل کارخانوں کی تعداد ۵۸۷ ر ۹ اور کام کرنے والوں کی تعداد ۹۳۷ ر ۵۵ ر ۱۷ معلوم ہوتی ہے، مندرجۂ ذیل صنعتوں میں اوسطاً دس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے ہیں :-

۲۸۴

صنعت کا نام	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد	صنعت کا نام	کارخانوں کی تعداد	مزدوروں کی تعداد
روئی کے کارخانے	۹،۵۸۷	۳،۸۷،۳۰۱	جہاز سازی اور انجینیری	۱۹	۲۴،۴۴۴
جوٹ کی گرنیاں	۹۶	۳،۴۸،۹۸۲	ذخائر حرب کے کارخانے	۲۴	۲۲،۱۹۳
روئی اوٹنے اور دبانے والی گرنیاں۔	۲،۹۵۶	۱،۹۰،۱۰۲	آرا کشی کے کارخانے	۲۱۴	۱۷،۸۰۶
ریلوں کے کارخانے	۱۵۴	۱،۴۲،۳۴۷	دیا سلائی	۴۴	۱۶،۸۴۱
چاول کی گرنیاں	۱،۶۸۱	۷۸،۹۶۶	شکر کے کارخانے	۴۵	۱۵،۰۷۶
چائے کے کارخانے	۹۳۵	۶۳،۰۸۶	اینٹ اور کویلو	۱۲۹	۱۴،۷۹۶
عام انجینیری کے کارخانے	۳۰۶	۴۹،۹۶۴	رسن سازی	۴۰	۱۸،۵۱۰
چھاپے خانے و جلد سازی	۳۸۹	۴۱،۰۰۲	تیل کی گرنیاں	۲۷۹	۱۴،۲۷۹
لوہا و فولاد	۶	۳۶،۵۹۰	پٹرول صاف کرنے والے	۱۳	۱۲،۰۷۸
جوٹ دبانے والے کارخانے۔	۱۱۵	۳۷،۳۰۰	سمنٹ اور چونا وغیرہ	۳۲	۱۱،۳۷۸
مٹی کے تیل کے پیپے بنانا اور بند کرنا	۲۹	۱۰،۹۹۱	تمباکو	۱۸	۱۰،۳۹۷

بعض موسمی صنعتوں مثلاً روئی اوٹنے اور چاول کی گرنیوں کے اعداد اور مردم شماری کے نقشے میں جو اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مردم شماری سے صرف سال میں ایک دن کے حالات کا پتا چلتا ہے دوسرے جو تقسیم اختیار کی گئی ہے وہ مختلف ہے مثلاً چائے کی صنعت میں صرف اس آبادی کو شامل کیا گیا ہے جو صنعتی کام میں مصروف ہے، ان اعداد میں معدنیاتی صنعتیں شامل نہیں، بڑی صنعتیں جو اس نقشے میں شامل کی گئی ہیں ان کی تفصیل علیحدہ علیحدہ دکھائی گئی ہے اس نقشے سے ہندوستان میں ضمنی، موسمی اور مرمت کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، نیز کارخانوں میں جو قلیل آبادی مصروف ہے وہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے، قریب قریب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت

ہندوستان میں تقریباً بیس لاکھ آدمی جدید صنعتوں میں مصروف ہیں، اور ان میں سے بھی وہ بڑا حصہ جو موسمی صنعتوں میں مصروف ہے اس کا خاص پیشہ زراعت ہی ہے۔

فصل سوم

مزدور

سنہ ۱۹۰۸ء کے کمیشن مزدوران کی رپورٹ پر حکومت نے ڈاکٹر نائر کے خاص نقاط نظر کو تسلیم کر لیا اور سنہ ۱۹۰۹ء میں ایک مسودہ پیش کیا جو سنہ ۱۹۱۱ء میں قطعی طور پر منظور ہو گیا۔ سوتی اور غیر سوتی کارخانوں کا پچھلا فرق اب بھی باقی رکھا گیا، اس قانون کی رو سے بچوں اور عورتوں کے اوقات کار علی الترتیب سات اور گیارہ گھنٹے مقرر ہوئے اور تمام کارخانوں میں دوپہر میں نصف گھنٹے کا وقفہ لازمی قرار پایا بچوں کے لیے کام کرنے کی عمر حسب سابق ۹ سے ۱۴ سال تک برقرار رہی لیکن عمر کا صداقت نامہ پیش کرنے پر زور دیا گیا، سوتی کارخانوں میں بچوں کے واسطے چھ اور بڑوں کے لیے ۱۲ گھنٹے مقرر ہوئے اور ان کو روزانہ ۱۲ گھنٹے سے زائد میکانی یا برقی طاقت استعمال کرنے کی ممانعت کر دی گئی مزدوروں کی صحت اور ان کی حفاظت کے متعلق چند نئی دفعات کا اضافہ کیا گیا، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے سنہ ۱۸۹۲ء کا قانون بڑی حد تک بیکار محض تھا کیونکہ مشینوں کی دیکھ بھال کے انتظامات نہ تھے، نئے حالات کے تحت اس کا علاج تجویز کیا گیا اور نگرانی کے واسطے اچھے انتظامات کیے گئے، لیکن سنہ ۱۹۱۲ء کے قانون سے جو ایک نئی خرابی پیدا ہو گئی

۲۸۵

وہ یہ تھی کہ بچے اب دو مختلف کارخانوں میں کام کرنے لگے، اور نیم وقتی مزدور پورے وقت کام کرنے والوں میں تبدیل ہو گئے۔

کارخانوں کے مزدوروں کے حالات کے متعلق ۱۹۰۵ء میں جس تحقیقات کا آغاز ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی کی گرنیوں میں برقی روشنی کی ترویج کی بدولت بعض خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر صورتوں میں حتیٰ کہ خود ۱۹۱۲ء کے قانون میں لنکا شائر اور ڈنڈی کے کارخانہ داروں کے اثرات کو بڑی حد تک دخل تھا۔ اور کسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خود مزدوروں نے اپنے حالات کو بہتر بنانے کے واسطے کوئی آواز بلند کی ہو، لیکن جنگ کی وجہ سے صورت حال میں تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی، اور اب ہندوستان میں سب سے پہلے وہ چیز پیدا ہوئی جس کو صحیح معنوں میں مزدور تحریک کہا جا سکتا ہے، عام بیداری جنگ کا ایک عالمی نتیجہ تھی۔ اور اسی کے ساتھ اعلیٰ قیمتوں اور جمودی اجرتوں نے رہنے سہنے کے حالات کو اور بدتر کر دیا، یہ سب باتیں اس کی ذمہ دار ہیں۔ جنگ کے آخری دور میں ہندوستان کی تمام صنعتیں بہت اچھی طرح چل رہی تھیں، تیار شدہ اشیا کی قیمتیں بہت زائد بڑھ گئیں، اور اس کے ساتھ اجرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ہندوستان میں سب سے پہلی مزدور سبھا کے قیام کا سہرا مدراس کی مزدور سبھا کے سر ہے، جو ۱۹۱۸ء میں مسٹر بی، پی واڈیا کی کوششوں سے قایم ہوئی، اس قسم کی جماعتیں تیزی سے دوسرے صنعتی مرکزوں میں بھی قائم ہونے لگیں، اس کے بعد اجرت میں اضافے کے مطالبے کے واسطے ہڑتالیں شروع ہوئیں، ظاہر ہے کہ یہ ابتدائی صورتیں کچھ زیادہ منظم نہ تھیں، لیکن مزدوروں نے جنگ کے بعد والے دور میں تنظیم کے فوائد اور ہڑتال کے کارگر حربے کو محسوس کر لیا تھا، ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء کے سال ہندوستان میں نئی مزدور تحریک کے لیے بڑے اچھے رہے، اس زمانے میں صنعتوں کی عام حالت اچھی تھی اور آجر یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ خوش حالی کے زمانے میں

۲۸۶

کام کے دنوں کا حرج کریں، سطح اجرت، عام قیمتوں کے اضافے سے بہت پیچھے تھی، اس لیے اضافے کی اچھی خاصی حد موجود تھی، لہٰذا اس زمانے میں مختصر اور کامیاب ہڑتالیں ہوتی رہیں، ہڑتالوں کی کامیابی سے تحریک میں جان پڑ گئی اور یہ سارے ہندوستان میں تیزی سے پھیلنے لگی مخصوصاً سنہ ۱۹۲۰ء میں چھوٹی چھوٹی کامیاب ہڑتالوں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ کلکتے کی جوٹ کی گرنیوں جمشید پور، کوئلے کی کانوں اور بمبئی و احمد آباد کی سوت کی گرنیوں میں ہڑتالیں ہوتی رہیں، اس کے علاوہ ریلوں، گودیوں اور محکمۂ ٹیلیفون وغیرہ میں بھی ہڑتالیں ہوئیں، اکثر صورتوں میں ان کا نتیجہ اضافۂ اجرت کی صورت میں نمودار ہوا، بمبئی اور احمد آباد کے مزدوروں نے اپنے آجروں سے دس گھنٹے کا دن منوا لیا۔ لیکن یہ چیزیں جاری رہنے والی نہ تھیں اکثر صنعتوں میں خوش حالی کا دور سنہ ۱۹۲۰ء میں ختم ہو گیا اور سنہ ۱۹۲۱ء کے ربع اول میں تو یہ تقریباً بالکل ختم ہو گیا اور اسی کے ساتھ ہڑتالوں میں کمی ہو گئی لگر اس دور میں طویل اور ناکام ہڑتالوں کا ایک رجحان نظر آتا تھا۔ یہ رجحانات سوائے روئی کی صنعت کے ہر جگہ عام تھے کیونکہ یہ صنعت ابھی تک خوش حال تھی اور یہیں سنہ ۱۹۲۱ء کے ربع آخر میں بونس کے سلسلے میں بعض کامیاب ہڑتالیں ہوئیں، سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد سے کامیاب ہڑتالوں کا سلسلہ حتیٰ کہ روئی کی صنعت میں بھی بالکل ختم ہو گیا اور مزدور تحریک کو صنعت کی کساد بازاری کی وجہ سے دشواریوں کے ایک شدید دور سے گزرنا پڑا، سنہ ۱۹۲۳ء میں شدید قسم کی ہڑتال صرف ایسٹ انڈیا ریل میں ہوئی۔ اور سنہ ۱۹۲۳ء میں احمد آباد کی گرنی کی ہڑتال سے اس جدوجہد کا آغاز ہوا جو اجرتوں میں تخفیف کے خلاف ہو رہی تھی۔ چند سال تک ہڑتال کا حربہ کم سے کم استعمال کیا جاتا رہا۔ اور جب کساد بازاری کے پورے اثرات اچھی طرح محسوس ہونے لگے تو سنہ ۱۹۲۵ء

لہ جرنل آف انڈین انڈسٹریز اینڈ لیبر (مئی سنہ ۱۹۲۱ء)۔

سے پھر ہڑتالوں کا آغاز ہوا[1]۔ ان میں ۱۹۲۸ء میں جمشید پور کا شدید جھگڑا اور ۱۹۲۹ء میں بمبئی کی سوتی صنعت کی طویل کشمکش خاص خصوصیت رکھتی ہے، ۱۹۲۹ء کے بعد مزدوروں کے جھگڑوں کی تعداد اور شدت دونوں میں کمی آگئی کیونکہ مزدور طبقوں کی عام بے روزگاری کی وجہ سے ان کی حیثیت بہت ہی خراب ہوگئی تھی[2]۔

ہندوستان میں مزدور سبھا تحریک ابھی بمشکل دس سالہ ہے اور اس لیے یہ بات کچھ تعجب خیز نہیں کہ وہ ابتدائی منازل میں ہے، شروع میں جو سبھائیں قایم ہوئیں ان کی حیثیت ہڑتالی کمیٹیوں سے کچھ زیادہ نہ تھی اگرچہ وفاقی اور اتحادی کمیٹیاں اس تحریک میں بہت جلد قایم ہوگئیں لیکن ان کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش بہت ہی مختصر ہے، گزشتہ عشرے کی تاریخ ہی دراصل مزدور سبھا تحریک کی ساری تاریخ ہے، تحریک کا آغاز ان طویل ہڑتالوں کے ایک سلسلے سے شروع ہوا جو تجارتی دور کے عروجی زمانے میں ہوئیں اور اس وجہ سے ان کی تعداد اور طاقت دونوں میں اضافہ ہوا۔ لیکن مخالف دور کے آغاز کیساتھ ہی ان میں سے نمایشی سبھاؤں کا خاتمہ ہوگیا، اور اراکین کی تعداد اور ذخیروں کی کمی دونوں سبب سے یہ ساری تحریک بڑی پست سطح پر آگئی۔

ہندوستان میں ابتدا ہی سے مزدور سبھا تحریک کو جس دوسری دشواری کا سامنا کرنا پڑا وہ قانونی ذمہ داری تھی، اور سبھا کے جو عہدہ دار ہڑتالیں کراتے تھے ان پر دیوانی اور فوجداری کے مقدمات دائر ہوجاتے تھے، اس مسئلے پر حکومت نے سب سے پہلے توجہ کی اور ۱۹۲۶ء میں قانون مزدور سبھا کا نفاذ ہوا اور اس کے تحت رجسٹری شدہ

---

[1] شاہی کمیشن مزدوران کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) باب ۱۸۔
[2] حوالۂ گزشتہ، اور ۱۹۳۲ء کے مزدوروں کے تنازعات، لیبر گزٹ جنوری ۱۹۳۳ء۔

مزدور سبھاؤں کے واسطے اس ذمہ داری سے تحفظ کے چند طریقے اختیار کیے
گئے، کمیشن مزدوران نے مزدور سبھاؤں یا ان کے عہدہ داروں کی
جد و جہد پر جو پابندیاں عائد ہیں ان کے پیش نظر خصوصیت سے اس
قانون میں ترمیم کی سفارش کی۔

اس کے بعد ہی ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کی مزدور سبھاؤں کے
رہنماؤں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور آج کل یہ تحریک بہت ہی ادنی سطح پر
ہے، یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس تحریک میں کتنے لوگ شریک ہیں،
لیکن وٹلے کمیشن کے اندازے کے مطابق ۱۹۲۹ء میں ۸۷ سبھائیں تھیں
جو ۱۰۸۳ر۰۰۰ ارکان کی نمایندگی کا دعویٰ کرتی تھیں، اور جن کی قانون
مزدور سبھا کے تحت رجسٹری ہوچکی تھی، ان میں سے ۲۸ سبھائیں جن کے
ارکان کی تعداد نوے ہزار تھی صوبۂ بمبئی میں تھیں[1]۔ اس ملک میں سبھائی
تحریک کو جو غیر معمولی دشواری پیش آئی وہ اس کا عدم جواز تھا، نیز یہاں
بیرونی رہنماؤں کا مسئلہ بھی خاص تھا کیونکہ مزدوروں میں تعلیم کے بالکل
فقدان کی وجہ سے مزدور سبھا تحریک کو رہنمائی اور ہدایت کے واسطے
بیرونی رہنماؤں پر نظر ڈالنا پڑتی تھی، اور اس وجہ سے آجروں کو ان کے
جواز کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجاتا تھا، قانون مزدور سبھا نے
اس بات کی بھی تشریح کردی کہ ہر رجسٹری شدہ سبھا میں کم سے کم نصف
مزدور ہوں یا وہ لوگ ہوں جو حقیقتہً اس صنعت سے متعلق ہوں جس کی
سبھا نمایندگی کرتی ہے۔ کمیشن مزدوران نے یہ سفارش کی کہ یہ اقل ترین تعداد
دو تہائی کردی جائے۔ ہندوستانی مزدور سبھا تحریک میں دوسری دشواری
یہ ہے کہ یہاں کے مزدوروں میں نقل مقام کی صفت پائی جاتی ہے جب
بے روزگاری پھیلتی ہے تو لوگ بڑی تعداد میں اپنے قریوں میں واپس ہونا
شروع ہوجاتے ہیں اور اس سے سبھا کی رکنیت متاثر ہوتی ہے، یہ تحریک

۲۸۸

[1] رپورٹ ص ۳۲۔

صوبۂ بمبئی میں سب سے زیادہ اہم ہے اگرچہ کل ہند کے اعداد و شمار موجود نہیں مگر خوش قسمتی سے گزشتہ عشرے کی بابت اس صوبے کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی معلومات موجود ہیں، ان اعداد سے پتا چلتا ہے کہ جون ۱۹۲۲ء میں اس صوبے میں ۲۲ سبھائیں تھیں جن کے اراکین کی تعداد تقریباً ۵۸ ہزار تھی۔ اس کے بعد چار سال تک اگرچہ سبھاؤں کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن ان کی رکنیت یا تو یکساں رہی یا اس میں تخفیف ہوئی، ۱۹۲۶ء سے ان کی تعداد میں پھر اضافہ ہونا شروع ہوا اور مارچ ۱۹۲۹ء میں یہ پھر ایک اعلیٰ حد پر پہنچ گئی جب ۹۵ سبھائیں تھیں جن کے ارکان کی تعداد دو لاکھ تھی، مگر ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے سالوں میں پھر تخفیف ہو گئی، ستمبر ۱۹۳۲ء میں یہاں سو سبھائیں تھیں جن کے ارکان کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار تھی رکنیت کا بڑا تناسب غیر صنعتی کاموں پر مشتمل ہے جیسا کہ ذیل کے فی صدی اعداد سے ظاہر ہو گا۔ پارچہ بافی ۱ء۲۷، ملاح ۷ء۲۶، ریلیں ۳ء۲۳، تار و ڈاک ۰ء۸، میونسپل کے ملازم ۶ء۲، متفرق ۶ء۱۲۔

۱۹۱۹ء سے مزدوروں کی دنیا میں جو جوش پیدا ہوا اس نے ہندوستان میں بہت سے لوگوں کی توجہ کام کے حالات کی طرف مبذول کرائی، لیکن قانون کارخانہ جات میں جو مزید ترمیم ہوئی اس کی تحریک اس مرتبہ بھی باہر ہی سے ہوئی، ہندوستان مجلس اقوام کا ایک رکن تھا، مزدور کانفرنس منعقدۂ واشنگٹن نے جن تحریکات یا سفارشات کو منظور کیا ان کی وجہ سے قانون مزدوران پر نظر ثانی کرنا ضروری ہو گیا جن کو حکومت ہند نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں مجلس وضع قوانین نے کانفرنس کے دستور کو تسلیم کرنے کی ایک تحریک منظور کی اور دوسرے سال نیا قانون کارخانہ جات نافذ ہو گیا، نئے قانون میں کارخانے کی تعریف کو بہت وسیع کر دیا گیا اور اب اس سے مراد ایسی جگہ لی جانے لگی جہاں بیس آدمی سے کم کام نہ کر رہے ہوں اور میکانی طاقت کا استعمال ہو رہا ہو، سوتی اور غیر سوتی کی قدیم تقسیم جو اب تک تمام قوانین میں موجود تھی وہ بھی منسوخ

کردی گئی، بچوں کی ملازمت کی اقلترین عمر ۹ سال سے بڑھا کر ۱۲ سال کردی گئی
اور بیشترین عمر ۱۴ سے ۱۵ سال قرار پائی اور کسی بچے کو بغیر طبی صداقتنامے
کے ملازم نہیں رکھا جا سکتا تھا، مردوں کے کام کی مدت ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ
مقرر کی گئی اور دوپہر کے نصف گھنٹے کے وقفے کو ایک گھنٹے کا کردیا گیا،
نیز وقت مقررہ سے زائد کام کے لیے زائد معاوضے کے متعلق بھی ضابطے
بنائے گئے، خاص دفعات یہی تھیں، اس قانون میں تھوڑی سی تبدیلی
۱۹۲۳ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں ہوئی، ۱۹۲۶ء میں جو ترمیمات کی گئیں ان کا
مقصد یہ تھا کہ قانون اچھی طرح عمل کرسکے، اور یہ مختلف صوبوں کے
کارخانوں کے ناظران خصوصی کی کانفرنس کی سفارشات کا نتیجہ تھا، ان
میں جو سب سے زیادہ اہم ترمیم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ والدین یا سرپرست
جو اپنے بچے کو دو کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دیں گے سزا کے
مستوجب ہوں گے، اس دفعہ کا مقصد اس خرابی کو روکنا تھا جس کا
تذکرہ اوپر کیا جا چکا اور جو بعض صنعتی مرکزوں اور بالخصوص احمد آباد میں
۱۹۱۲ء کے بعد سے بہت عام ہوتی جا رہی تھی، پرانے قانون کے مقابلے
میں نئے قانون کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا اور اس کے تحت نگرانی کا
انتظام بھی کافی اچھا ہوگیا ہندوستان میں مزدوروں کے متعلق شاہی کمیشن
نے دوسری چیزوں کے ساتھ یہاں کے قوانین مزدوران کا بھی تفصیلی مشاہدہ
کیا اور موجودہ قانون میں مزید ترمیمات کی سفارش کی، جن میں سب سے
زیادہ اہم سفارش یہ تھی کہ ہفتہ واری گھنٹوں کی مقدار گھٹا کر ۵۴ کردی جائے
اور روزانہ دس گھنٹے کام ہو، تاکہ قانون کے نفاذ کے بعد اس بات کا
تحفظ ہوجائے کہ کسی ایک مزدور کو انفرادی حیثیت سے ایک دن میں
اوقات کار سے زیادہ کام نہ کرنا پڑے، اور وہ مناسب اور مسلسل آرام
سے بھی محروم نہ رہے، یہ سفارش اس لیے کی گئی تھی کہ کمیشن نے محسوس کیا کہ
یہ خرابی خصوصیت سے ان مقامات اور جوٹ کی گرنیوں میں موجود ہے
جہاں باری سے کام کرنے کا طریقہ رائج ہے، اس بات کی بھی سفارش کی گئی

کہ ۱۵ سے ۱۶ سال کے درمیانی لوگ اس وقت تک بڑے مزدور نہ سمجھے جائیں جب تک کہ اُن کے پاس طبی صداقت نامہ نہ ہو، نیز زائد از وقت کام کو بھی سختی سے منضبط کرنے کی کوشش کی اور سارے ہندوستان میں یکساں معیار اختیار کرنے کی سفارش کی۔ نئے اوقات کی سفارش موسمی کارخانوں کے لیے نہیں کی گئی ان کے واسطے ایک علیحدہ قانون پر زور دیا گیا تاکہ وہ بھی ایک سطح پر آجائیں، جہاں مصنوعی نمی سخت تکلیف کا باعث ہوتی ہے اس پر نگرانی کے واسطے خاص سفارش کی اور مزدوروں کے لیے آب رسانی، آرام گاہیں، بیت الخلا، ابتدائی طبی امداد وغیرہ کے لیے قانونی ضابطے بنانے کی سفارش کی، کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ وہ بعض کارخانے جو اس وقت غیر منظم ہیں، ان کو بھی قانون کے تحت لانے کی کوشش کی جائے، وہ چھوٹے کارخانے جو میکانی طاقت استعمال کر رہے ہیں ان کے واسطے یہ سفارش کی کہ مقامی حکومت کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ قانون کارخانہ کی بعض دفعات کا اطلاق ان مقامات پر کر سکے جہاں صورت حال بہت خطرناک ہے وہ کارخانے جو طاقت استعمال نہیں کر رہے ہیں اور اس وقت بالکل بے ضابطہ ہیں ان کے واسطے کمیشن نے ایک علیحدہ مختصر سے قانون کی سفارش کی، کمیشن بیڑی اور قالین کے کارخانوں میں بچوں کی حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوا، اور اُن حالات سے بھی اثر قبول کیا جو اُون صاف کرنے والے اور لاکھ و دباغت کے کارخانوں میں رائج تھے، اور مزدوروں کی صحت کے لیے بہت مُضر تھے اور جہاں صفائی کے حالات بڑے گندہ تھے، لہٰذا انھوں نے بچوں کی عمر کے تعین، کام کرنے والے بچوں کے اوقات کار، اور مزدوروں کی صحت اور صفائی کی تدابیر کے متعلق بھی قانون سازی کی سفارش کی۔ ۲۹۰

کارخانوں اور بالخصوص پارچہ بافی کی گرنیوں میں مزدوروں کی حالت قبل از جنگ والے دور کے مقابل سنبھل گئی تھی اس کے برخلاف

معدنیات میں صورت حال بے حد خراب اور بے ضابطہ تھی، سنہ ۱۹۰۱ء کا قانون معدنیات ایک غیر کارآمد قانون تھا، اور اس خرابی کا علاج سنہ ۱۹۲۳ء کے قانون معدنیات سے ہوا، اس قانون کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اس کی تعریف میں اتھلی سطح پر کام کرنے والے بھی آگئے، اس کی رو سے ۱۳ سال سے کم عمر کے بچوں کو کام کرنے کی قطعی ممانعت ہوگئی۔ سطح زمین پر کام کرنے والے مزدوروں کے اوقات کار ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ اور زیر زمین کام کرنے والوں کے لیے ۵۴ گھنٹے مقرر ہوئے ہفتے میں ایک دن کی تعطیل لازمی قرار دی گئی، معدنیات کے مالک مزدوروں کے متعلق قانونی شرائط کی تکمیل بہت کم کرتے تھے اور نہ وہ فوراً ہی اس قانون پر عمل پیرا ہونا چاہتے تھے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں صدر ناظر معدنیات نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اگرچہ قانون کا نفاذ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء سے ہوچکا تھا لیکن معدنیات میں بچوں کی ملازمت کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوا، کمیشن مزدوران نے سفارش کی کہ سطح زمین پر کام کے اوقات ۵۴ گھنٹے فی ہفتہ مقرر کئے جائیں اور ۱۴ سال سے کم عمر کا کوئی بچہ سطح زمین یا کانوں کے اندر کام کرنے کے واسطے ملازم نہ رکھا جائے۔ انھوں نے یہ سفارش بھی کی کہ زیر زمین کام کرنے والوں کے اوقات کار پر نظر ثانی کی جائے اور معدنی مجالس میں مزدوروں کی نمایندگی زیادہ ہو، نیز معدنی علاقوں میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کی طرف زیادہ توجہ کی جائے، سنہ ۱۹۲۳ء کے قانون میں جو تبدیلیاں کی گئیں وہ کافی وسیع تھیں لیکن پھر بھی یہ قانون ایک چیز کے متعلق بالکل خاموش تھا اور یہ عورتوں کا زیرزمین کام کرنے کا سوال تھا اور ہندوستان میں جس وجہ سے اس مسئلے پر مسلسل زور دیا جاتا رہا وہ معدنیات میں خاندانی طریق پر محنت کرنے کا رواج تھا عورتوں کے کام کرنے کی قطعی ممانعت کی بار بار حمایت کی جارہی تھی لیکن صنعت کی جانب سے اس کی شدت سے مخالفت ہوتی تھی کیونکہ

۲۹۱

انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں اس طرح ان کی کفایت محنت کا سارا مسئلہ الٹ نہ جائے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے قانون معدنیات نے گورنر جنرل کو اس بات کا اختیار دیا تھا کہ وہ عورتوں کو زیرِ زمین کام کرنے کی ممانعت کردے، لیکن اس اختیار کو کبھی استعمال نہیں کیا گیا، سنہ ۱۹۲۲ء میں جب یہ مسئلہ دوبارہ چھڑا اور اس پر رائے طلب کی گئی تو بنگال و بہار کی کوئلے کی کانوں کی جانب سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور ان میں یا پنجاب کی نمک کی کانوں میں سب سے زیادہ عورتیں ملازم تھیں، اور امتناع کے خلاف یہ دلیل پیش کی گئی کہ چونکہ مزدوروں کا بڑا حصہ عورتوں پر مشتمل ہے لہٰذا اگر اس طریقے کی فوری ممانعت کردی گئی تو محنت کی قلت ہوجائے گی، نیز زیرِ زمین کام کرنے کے حالات عورتوں کے لیے نہ تو جسمانی نقطۂ نظر سے مضر ہیں اور نہ ان میں کوئی اخلاقی برائی ہے کیونکہ کام خاندان کے ساتھ کیا جاتا ہے[1] آخر الذکر سلسلے میں صدر ناظر معدنیات کی رائے کافی وقیع ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ وہ خاندانی طریق ہمیشہ ایسا نہ ہوتا تھا جیسا کہ وہ نظر آتا ہے، چنانچہ یہ کچھ غیر معمولی بات نہ تھی کہ ڈھونے والی عورت دوسرے کی بیوی ہوا کرتی تھی[2] اب یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد عورتوں کے کام کرنے کی قطعی ممانعت ہوجائے۔ لیکن حکومت نے جس نقطۂ نظر کو منتخب کیا وہ یہ تھا کہ فوری ممانعت کوئلے کی پیداوار کو متاثر کردے گی۔ البتہ حال میں ایسے ضابطے بنائے جن سے کوئلے کی خاص کانوں اور پنجاب کی نمک کی کانوں کے علاوہ صوبوں کی دوسری تمام کانوں میں عورتوں کو زیرِ زمین کام کرنے کی فوری ممانعت کردی گئی اور ان دونوں مقاموں پر بھی آہستہ آہستہ عورتوں کی تعداد گھٹائی جارہی

---

[1] معدنیات میں عورتوں کی ملازمت، ہندوستانی صنعتوں اور مزدوروں کا بلیٹن نمبر ۳۵ (سنہ ۱۹۲۶ء)

[2] رپورٹ بابت سنہ ۱۹۲۳ء۔

ہے اور ۱۹۳۹ء تک عورتیں زیر زمین کام سے بالکل مستثنیٰ ہو جائیں گی۔[1] کمیشن مزدوران نے برما کی بہت اور پٹرول کی کانوں کے متعلق بھی خاص سفارشات کیں، اس نے یہ سفارش بھی کی کہ سلطنت متحدہ کے قانون معدنیات ۱۹۲۶ء کا اس غرض سے مطالعہ کیا جائے کہ ہندوستان میں پٹے دینے کے سلسلے میں اس قسم کی دفعات کس حد تک مفید ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلۂ قوانین کا دوسرا اہم جزو قانون معاوضۂ مزدوران تھا جو ۱۹۲۳ء میں نافذ ہوا، اس کا انطباق ریلوں اور ٹریموں کے ملازموں، کارخانوں، معدنیات، جہاز اور گودیوں کے مزدوروں تعمیراتی کاموں، تار و ٹیلیفون کے لائن محافظوں، زیر زمین صفائی کرنے والوں اور فائر بریگیڈ کے ملازموں پر ہوتا ہے۔ حکومت ہند نے مخصوص اعلان کے ذریعے اس قانون کا انطباق ان تمام کاموں پر کر دیا جو خطرناک ہیں۔ قانون میں مزدوروں کو دیے جانے والے معاوضے کا تعین کر دیا گیا اور اختلافی صورتوں کے واسطے ثالثی مجالس کی تشکیل عمل میں آئی۔ کمیشن مزدوران کی سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو اس قانون کا اطلاق تمام منظم صنعتوں پر ہونا چاہئے، خواہ اُن کے کام خطرناک ہوں یا نہ ہوں، آغاز ان کاموں سے ہو جو بہت زیادہ خطرناک ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ اس کی توسیع ان کاروبار تک ہو جائے جو غیر منظم ہیں، انھوں نے مزدوروں کے نقطۂ نظر سے اس قانون کو زیادہ وسیع کرنے کے واسطے بعض چھوٹی چھوٹی ترمیمات کا مشورہ بھی دیا۔ ۲۹۲

مسلسل اور جامع اعداد و شمار کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ زیر تبصرہ دور میں مزدوروں کی اجرت کا کیا حال رہا۔ لیکن عام طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے اجرتوں

[1] یکم جولائی ۱۹۳۷ء کے قانون سے عورتوں کو زیر زمین کام کرنے کی قطعی ممانعت کر دی گئی مگر جنگ کی وجہ سے ۱۹۴۳ء میں پھر اس میں کچھ ترمیم ہو گئی۔ (مترجم)

میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد ۱۹۲۱ء تک صنعتی مرکزوں کی اجرتوں میں تدریجی اضافہ ہوتا رہا۔ اضافے کا تناسب مختلف صنعتوں میں مختلف تھا، ۱۹۲۷ء میں کمیشن زر کے روبرو ایک شہادت میں جو اعداد پیش کیے گئے ان کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ بنگال کی جوٹ کی گرنیوں میں ۱۹۱۹ء میں پہلی مرتبہ قابل لحاظ اضافہ ہوا، یہ ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں کوئی ۵۰ فی صدی بڑھ گئیں اور ۱۹۲۵ء میں بھی یہ معیار قائم رہا۔ بمبئی کی سوتی صنعت میں سب سے پہلا اضافہ جولائی ۱۹۱۷ء میں ہوا جب دس فی صدی بونس منظور کیا گیا جنوری ۱۹۱۸ء میں اس کی مقدار ۱۵ فی صدی کر دی گئی، اور جنوری ۱۹۱۹ء میں ۳۵ فی صدی ہو گئی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں اس کی مقدار ۵۵ سے ۷۰ فی صدی کے درمیان رہی جنوری ۱۹۲۰ء میں اوقات کار بھی ۱۲ گھنٹے سے گھٹا کر دس گھنٹے کر دیے گئے، نومبر ۱۹۲۰ء میں اجرتوں میں مزید اضافہ ہوا اور ایک اندازے کے مطابق ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں جو اجرتیں ملتی تھیں وہ ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں ۱۳۱ فی صدی زائد تھیں، ان کی کچھ زیادہ تفصیلات بمبئی کے مزدوروں کے اخبار[۱] میں دی گئی ہیں۔ اور اس میں ۱۹۱۴ء، ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۳ء میں صوبہ بمبئی کی صنعت پارچہ بافی کا تقابل کیا گیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس صنعت میں کام کرنے والے تمام مزدوروں کی حقیقی اجرت مئی ۱۹۱۴ء کے مقابل مئی ۱۹۲۱ء میں بمبئی اور شولاپور میں دوگنی سے کم ہے اور احمد آباد اور دوسرے چھوٹے مرکزوں میں دوگنی سے زائد ہو گئی ہے۔ اس کے برخلاف مئی ۱۹۲۱ء سے اگست ۱۹۲۳ء کے اعداد سے پتا چلتا ہے کہ بمبئی میں اجرتیں قائم تھیں، احمد آباد میں قدرے تخفیف ہوئی اور شولاپور اور دوسرے مرکزوں میں بہت زیادہ کمی ہو گئی۔ بتایا گیا ہے کہ کوئلے کی کانوں

۲۹۳

[۱] لیبر گزٹ مئی ۱۹۲۵ء۔

میں اجرتیں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان بڑھیں اور ۱۹۲۵ء سے ان میں پھر تخفیف شروع ہوگئی[1]۔ لیکن ان رجحانات کی حد کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کمیشن مزدوران کی رائے تھی کہ قبل از جنگ والے دور کے مقابلے میں ۱۹۲۳ء میں مزدوروں کی حالت بہتر تھی[2]۔ اس دلیل کے جواز میں رپورٹ میں کوئی اعداد پیش نہیں کیے گئے، بہر حال یہ بہت زیادہ اساسی معلوم ہوتے ہیں، غالباً یہ مضامین کے اس مسلسل سالانہ سلسلے پر مبنی ہیں جو صوبۂ بمبئی کے مزدوروں اور اجرتوں کے متعلق مزدوروں کے اخبار میں شایع ہوئے[3]۔ لیکن جو اعداد پیش کیے گئے ہیں اور خصوصاً قبل از جنگ والے ان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ موجودہ کساد بازاری میں اجرتوں میں اس قدر تخفیف نہیں ہوئی جتنی کہ قیمتوں میں ہوئی ہے مگر یہ کوئی فائدہ بخش چیز اس لیے نہیں کہ اس زمانے میں بے روزگاروں کی تعداد زائد رہی۔

کمیشن مزدوران نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مزدوروں کی آمدنی اور ان کے مصارف کے متعلق قابل وثوق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن جو مواد فراہم ہو سکا اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ مختلف صوبوں کی شرح اجرت میں قابل ذکر اختلاف پایا جاتا ہے، سارے ہندوستان کے مقابلے میں برما میں اجرتیں سب سے زیادہ اعلیٰ ہیں، پھر خود صوبوں میں بھی اختلاف موجود ہے مثلاً صوبۂ متحدہ، مدراس، صوبۂ متوسط اور بہار و اڑیسہ کی بیشتر صورتوں میں جو اجرت درج کی گئی ہے وہ ۱/۲ ۷ روپے ماہانہ سے کم تھی اور بمبئی میں ان پیشوں کی اجرت

---

[1] صدر ناظر معدنیات کی رپورٹیں بابت ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء۔

[2] رپورٹ صفحہ ۱۹۶۔

[3] مثال کے لیے ملاحظہ ہو لیبر گزٹ دسمبر ۱۹۳۲ء۔

۱۵ روپے سے کم تھی، پنجاب اور بنگال میں اجرت کا اوسط مندرجۂ بالا چاروں صوبوں سے زائد تھا۔ اگرچہ کمیشن مزدوران ہندوستانی مزدوروں کی قلیل اجرت سے متاثر ضرور ہوا تاہم وہ چائے کے باغات کے مزدوروں کے علاوہ عام قانونی اقل ترین اجرت معین کرنے سے قاصر رہا۔ اور آخر الذکر صورت میں بھی یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ مزدور کی مخصوص علحدگی کی صورت، مستحکم تنظیم تحلل ہندوں کے مروجہ اجرتی معاہدے اور مختلف رعایات وغیرہ ایسی تھیں جن سے حقیقی اجرت متعین ہوتی تھی لہٰذا کمیشن نے سفارش کی کہ یہ مناسب ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو اس نظم کو چلانے کے واسطے قانونی اجرت مقرر کر دی جائے۔

صنعتی مزدوروں کا معیار زندگی بڑھانے کے واسطے کمیشن نے جو چند دوسری سفارشات کیں وہ یہ تھیں کہ جہاں تک ممکن ہو ہنگامی مزدوروں کو مستقل مزدوروں میں تبدیل کیا جائے، اجرتوں کا ایک معیار ہو اور بالخصوص بمبئی کی روئی اور کلکتے کی جوٹ کی صنعتوں میں یکسانیت ہونا چاہئے، نیز اس قسم کا قانون بھی بنایا جائے جس کی رو سے مزدوروں کے جرمانوں اور ان کی اجرتوں میں جو منہائیاں کی جاتی ہیں ان کی مقدار معین کر دی جائے، کمیشن نے متاثر ہو کر اس بات کی سفارش بھی کی کہ بڑے صنعتی شہروں میں شراب کی فروخت پر قیود عائد کی جائیں نیز انھوں نے مزدور کی مزمن قرضداری پر بھی زور دیا جو اس کے معیار زندگی کو متاثر کرتی ہے[1]۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد سفارشات کیں، مثلاً

[1] اگرچہ قطعی اعداد موجود ہیں تاہم کمیشن مزدوران کا اندازہ تھا کہ بیشتر صنعتی مرکزوں میں مقروض خاندانوں یا افراد کا تناسب کل تعداد سے کسی طرح دو تہائی سے کم نہ تھا۔ اکثر صورتوں میں قرضے کی تعداد تین ماہ کی اجرت سے زیادہ تھی اور بعض وقت اس سے بہت زائد تھی، انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ عام طور پر مزدوروں کو اپنے قرضے پر ۷۵، فی صدی سالانہ سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ رپورٹ

یہ کہ وہ تمام مزدور جو ۳۰۰ روپے ماہوار سے کم اجرت یا تنخواہ پاتے ہیں ان کو قرقی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، اور خصوصاً وہ لوگ جن کی آمدنی سو روپے ماہوار سے کم ہے ان کو قرضے کے سلسلے میں گرفتار یا قید نہ کیا جائے اجروں کو ہفتہ وار اجرت ادا کرنی چاہئے اور مزدوروں کے غیر محفوظ قرضوں کی بے باقی کے واسطے ایک مختصر قانون بنایا جائے اور قرضوں کی واپسی کے لیے کسی صنعتی ادارے کے قیام کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔

سب سے آخر میں ہندوستان میں مزدوروں کی فراہمی کے سوال پر غور کرنا ہے، ہر صنعت میں مزدوروں کی فراہمی کی نوعیت مختلف ہے، ان کی خاص خصوصیات کا تذکرہ ہم اوپر کرچکے ہیں ہندوستانی مزدور کا ابھی تک زمین سے کچھ تعلق باقی ہے جو ہر جگہ صحیح ہے لیکن اب اس کا حال اگلا سا نہ رہا۔ آسام کے چائے کے باغوں میں اس کا انحصار نخل بند کے رحم و کرم پر ہے اور نخل بندوں کے لیے اس میں سہولت ہے کہ وہ اپنے مزدوروں کو چاول کی زمینیں یا کاشت کے واسطے باغات کے چند ٹکڑے دے کر ان کو روک لیں، اور اس طرح یہ لوگ جزو وقتی کاشتکار میں تبدیل ہو جاتے ہیں، بنگال اور بہار و اڑیسہ کی کوئلے کی کانوں میں مزدوروں کا بڑا حصہ محض ہنگامی حیثیت رکھتا ہے اور زرعی موسم کے لحاظ سے مزدوروں کی رسد میں اختلاف ہوتا رہتا ہے، دوسرے صنعتی مرکزوں میں زراعت سے تعلق مختلف مدارج کا ہے حتیٰ کہ بمبئی جیسے شہر میں پہنچ کر یہ قریب قریب بالکل ختم ہو جاتا ہے، لیکن آخر الذکر کا یہ مطلب ہے کہ ان کی اکثریت اپنے دیہی وطن لوٹنے کی عادی ہے، مزدوروں میں اس قسم کی تبدیلی مکمل طور پر نہ ہونے کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں صنعتیں بڑے پیمانے پر قائم ہیں وہاں مستقل صنعتی آبادی پیدا نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ حالات اتنے خوشگوار

۲۹۵

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ صفحات ۲۵-۲۲۴-

نہیں ہیں، اجرتیں ادنیٰ ہیں، کام سخت ہے اور مکانات وغیرہ کی حالت
بڑی خراب ہے، کلکتے کی جوٹ کی گرنیوں میں اجرتیں اتنی کافی تو ضرور
ہیں کہ وہ صوبۂ متحدہ کے مزدوروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں مگر وہ مقامی
مزدوروں کے لیے باعث ترغیب نہیں[1] تاوقتیکہ کسی مقام پر زرعی
مزدوروں کے مقابلے میں صنعتی مزدوروں کے حالات زندگی بہتر نہ ہوں
اس وقت تک کسی دائمی صنعتی آبادی کا وجود ممکن نہیں، کوئلے کی خاص
کانوں میں اجرتوں کا معیار ہندوستان کے دوسرے حصوں کی کانوں
کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہے[2] لہٰذا مزدوروں کی بڑی تعداد کو ترغیب
نہیں ہوتی اور اس کو مقامی جنگلی قبائل کے مزدوروں پر اکتفا کرنا پڑتا
ہے، صوبۂ مدراس میں مزدور زیادہ تر نقل مقام کرنے والے نہیں ہیں
اور یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیسے ہی کوئی منظم صنعت مستقل طور پر قائم
ہوجاتی تو چند سال کے اندر مزدوروں کی ایک ایسی جماعت پیدا
ہوجاتی ہے جس کا انحصار زرعی روزگار کے بجائے اس صنعت پر
ہوتا ہے[3] معقول اجرت ادا نہ کرنے کی خواہش اور صنعتی شہروں میں
زندگی کا غیر خوشگوار ہونا ہی دراصل وہ خاص اسباب ہیں، جن کی بدولت
ایسی صورتوں میں مزدوروں کی قلت پیدا ہوتی ہے، ہم اوپر ڈاکٹر
نائر کی رائے درج کرچکے ہیں کہ بمبئی کی سوتی صنعت کا کام انسان کو
بہت جلد ناکارہ کردیتا تھا غیر حاضری کی سب سے بڑی خرابی دراصل
کام کے حالات کا نتیجہ تھی، حال ہی میں ایک مشاہدہ کرنے والے کا بیان
ہے کہ "ہندوستان میں یقیناً وقت کا سوال بہت ہی اہم ہے اور بعض
صورتوں میں اس سے اس تکان کا پتا چلتا ہے جو کام سے ہوجاتی ہے،

۲۹۶

۱؎ بروٹن، ہندوستانی صنعتوں کے مزدور، باب پنجم (۱۹۲۴ء)۔
۲؎ کارخانوں کے صدر ناظر کی رپورٹ (۱۹۲۳ء)۔
۳؎ لوکی ناتھن، مدراس کے صنعتی مزدور، مقالہ جو ساتویں معاشی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ (۱۹۲۴ء)۔

جب اجرتیں معقول ہوں تو لوگ معمولی وجوہ کی بنا پر کام سے غیر حاضر نہیں رہتے، اور جہاں وہ ایسا کرتے ہیں وہاں وہ دراصل اپنی صرف شدہ طاقت کو بحال کرنا چاہتے ہیں[1]۔ مثلاً کوئلہ کاٹنے کے کام میں مزدوروں کی قلت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کام بہت ہی سخت ہے، ہندوستان میں رہائش کے دوسرے حالات بھی مستقل قسم کی صنعتی آبادی کو بڑھنے سے روکتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہم مکانات کی حالت ہے۔ اکثر مشاہدہ کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ اس وقت بیشتر صنعتی مرکزوں میں مکانات کی جو حالت ہے اس کی وجہ سے خاندانی زندگی کے تسلسل کا کوئی امکان نہیں ہے[2]۔ اور بیشتر صنعتوں میں صورت حال بڑی ابتر ہے، کلکتے میں چند ہی جوٹ کی گرنیاں ایسی ہیں جو اپنے قلیوں کے واسطے مکانات مہیا کرتی ہیں ورنہ باقی لوگوں کو خراب حال بستیوں میں رہنا پڑتا ہے، کوئلے کی کانوں میں بھی جہاں اچھے مکانات کا انتظام ہے مثلاً گری ڈیہہ میں وہاں مزدوروں میں تغیر نظر نہیں آتا ۱۹۱۷ء میں بہار و اڑیسہ کی کمیٹی نے کام کرنے والوں کے مسئلۂ رہائش پر غور کیا اور بتایا کہ نومبر سے مئی تک جو کام کا مصروف ترین زمانہ ہے اس میں بیشتر معدنیات میں مکانوں کی قلت رہتی ہے اور مزدوروں کی بڑی تعداد کو گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں رہنا پڑتا تھا۔ بہار و اڑیسہ کی حکومت نے کمیٹی مذکور کی سفارشات کو قبول کر لیا لیکن انھوں نے مکانات کی قلت دور کرنے کا جو پروگرام بنایا اس پر کوئلے کی صنعت کی مالی دشواریوں کی وجہ سے عمل نہ ہو سکا ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں کچھ تفصیلی تحقیقات کی گئی اور اعداد و شمار کے لحاظ سے

---

[1] بروح ٹن، حوالہ گزشتہ صفحہ ۱۸۱۔

[2] بروح ٹن، حوالہ بالا باب پنجم اور ڈی، ایف، کرجیل، بنگال کی صنعتوں کی مزدور عورتیں، آئی ایل او لیبر بلیٹن نمبر ۳۱ باب سوم اور شاہی کمیشن مزدوران کی رپورٹ صفحہ ۲۴۵۔

ہندوستان کے بعض گنجان مرکزوں میں مروجہ حالات کی تفصیلات معلوم ہوئیں، بمبئی کی کل آبادی کا ۷۰ فی صدی حصہ ایک کمرے والے مکان میں رہتا ہے اور کم و بیش ایک کمرے میں اوسطاً چار آدمی رہتے ہیں، شہر کے ایک حصے میں آبادی کا ۹۶ فی صدی حصہ ایک کمرے میں رہتا ہے اور فی کمرہ پانچ آدمیوں کا اوسط آتا ہے کراچی میں صورت حال اس سے بھی بدتر ہے، شمالی ہند کے شہروں مثلاً کانپور (جو صنعتی لحاظ سے بہت ہی اہم ہے) میں کل آبادی کا ۶۴ فی صدی حصہ ایک کمرے میں رہتا ہے[1]۔ ان اعداد سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر صنعتی شہروں میں گنجانیت کا کیا عالم تھا اور جب اس کے ساتھ آب رسانی کے نقص اور صفائی کے انتظامات کے قطعی فقدان کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں رہتی اگر صنعتی مرکزوں میں مستقل سکونت پذیر آبادی نہیں بڑھتی، اور ہندوستانی مزدور کے تعلقات اپنے گاؤں سے وابستہ رہتے تھے، حالانکہ بہت عرصہ ہوا اس کا تعلق زراعت سے ختم ہو چکا تھا تاہم جب بھی اسے موقع ملتا تو وہ اپنے گاؤں واپس لوٹ جایا کرتا تھا[2]۔

۲۹۷

---

[1] ذیل کے اقتباس سے رنگون میں مکانوں کی جو حالت تھی اس کا اندازہ ہو جائے گا " یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ½ ۱۲ فٹ لمبے اور ۴۰ فٹ چوڑے کمرے میں ۴۰ سے ۵۰ کے درمیان آدمی رہتے ہوں بعض کمروں میں دو گروہ رہتے ہیں، ایک دن میں رہتا ہے اور دوسرا رات میں، بعض اوقات ان مکانوں میں خاندان بھی رہتے ہیں، اور پردے کے واسطے ٹاٹ کے پردے ڈال کر مکان کے حصے کر لیے جاتے ہیں، لیبر گزٹ (دسمبر ۱۹۲۲ء) اس سارے مسئلے کے لیے ملاحظہ ہو شاہی کمیشن مزدوران کی رپورٹ ابواب چہاردہم اور پانزدہم۔

[2] کمیشن مزدوران کا بھی یہی خیال تھا کہ موجودہ حالات میں کارخانوں کے مزدوروں کا دیہات سے تعلق برقرار رکھنا ضروری تھا اور جہاں تک ممکن تھا وہ اس کو استوار کرتے رہنا چاہتے تھے رپورٹ، باب دوم۔

فصل چہارم

قصباتی اور دیہاتی صناع

ہندوستان کی شہری دستکاریوں کے عبوری دور کی جو عام خصوصیات اوپر بیان کی گئیں[1]. ان میں سے ایک چیز قدیم ہندوستانی دستکاریوں کا تنزل تھا اور ان کے بجائے چھوٹی نئی دستکاریوں کا قیام یا پرانی دستکاریوں کی نئی صورتوں کا رواج تھا جو نسبتہً ایک وسیع بازار کے لیے اشیا تیار کیا کرتی تھیں، ان صنعتوں کی خاص تنظیم یہ تھی کہ یا تو صناع درمیانی آدمی کے لیے کام کرتے تھے یا پھر چھوٹے سے کارخانے کی شکل ہوتی تھی۔ خاص شہری صنعتوں میں اعلیٰ قسم کے کپڑے کی بنائی تانبے اور پیتل کے برتن، چھری چاقو، مختلف قسم کا لکڑی کا کام، یا چند متفرق صنعتیں مثلاً صابن سازی وغیرہ شامل تھیں، قدیم دستکاریوں کا زوال تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک ختم ہو چکا تھا فراہم شدہ مواد سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ زیر تبصرہ دور میں اس قسم کی صنعتوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی اگرچہ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد معلومات نہیں ہیں تاہم

[1] دیکھئے ابواب سوم و سیزدہم۔

جنگ کے بعد صوبۂ متحدہ کے مختلف اضلاع میں جو صنعتی تحقیقات کی گئیں ان سے اسی امر کا پتا چلتا ہے، تحقیقات کی بعض مثالیں ہندوستان کی شہری دستکاریوں کی نمایاں خصوصیات کو مجملاً ظاہر کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ زردوزی کا کام ہر جگہ ایک قسم کی خانگی بیگاری صنعت بن گیا تھا۔ بریلی کے فرنیچر کی صنعت صناعی طریقے کی ترقی کی بڑی اچھی مثال ہے، اس مقام پر حکومت کے مدرسۂ نجاری کی بدولت اچھے نجاروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا اور یہاں خاص طور پر مغربی طرز کا فرنیچر تیار ہونے لگا تھا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے خریداروں سے تعلق نہ رکھتے تھے اور انھیں سرمایے کی مستقل ضرورت رہتی تھی، لہذا یہ صنعت درمیانی آدمیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور صناع لازمی طور پر خوش حال نہ تھے، فرنیچر کے کارخانے کے واسطے امداد باہمی کے تجربے کے باوجود اس صنعت میں پیشگیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ دھات اور چھری چاقو کی صنعتوں مثلاً میرٹھ کی قینچیوں کی صنعت یا علی گڑھ کی قفل سازی میں چھوٹے کام گھر نظر آتے تھے، دستی بنائی کی صنعت میں تنظیمی دائرہ ایک آزاد صناع سے لے کر ایک بڑے کارخانے تک پہنچ جاتا تھا، چنانچہ الہ آباد کی تحقیق میں ۱۲۵ کرگھے والے ایک کارخانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہتر قسم کی مشینیں بہت استعمال کی جاتی تھیں، مثلاً علی گڑھ کی صنعت قفل سازی کی بہت کافی مانگ تھی مگر یہاں سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا، تنظیم کے فقدان اور بہتر طریقوں کو اختیار نہ کرنے کی وجہ سے اکثر اوقات صنعت بالکل مٹ جاتی تھی جیسا کہ اکثر مرکزوں پر سونے اور چاندی کی تارکشی کا حشر ہوا۔

ہندوستانی دستکاریوں کو جن تغیرات سے دوچار ہونا پڑا اس کی بڑی اچھی مثال سونے اور چاندی کی تارکشی کی صنعت ہے، یہ صنعت ہندوستان کے تمام اہم شہروں میں بہت عرصے سے قائم تھی درباروں

[illegible] کے بعد اعلیٰ قسم کے سونے اور چاندی کے [illegible]

کی طلب ختم ہوگئی لیکن زردوزی کی معمولی صنعت ہمیشہ خوش حال رہی۔
کیونکہ ارزاں تار اور گوٹے کی طلب ہمیشہ کثیر مقدار میں موجود رہی، لیکن
بیسویں صدی کے پہلے عشرے سے یہ صنعت تیزی سے اپنی حیثیت
کھونے لگی۔ مثلاً بنگال کے گوٹے اور تار کی صنعت کے رسالے میں کلکتے کی
صنعت کے زوال کی تاریخ ۱۸۷۵ء بتائی گئی ہے، لیکن پھر بھی وہاں کی
صنعت کی حیثیت ۱۸۹۷ء تک مضبوط رہی کیونکہ مشین کا بنا ہوا جو
سامان درآمد ہوتا تھا وہ ادنیٰ قسم کا ہوا کرتا تھا، لیکن اس کے بعد
درآمدی سامان نے اپنی حیثیت سنبھال لی اور دیسی صنعت کا قریب قریب
خاتمہ ہوگیا۔ دہلی میں سب سے پہلے نگرانی کرنے والی پنچایتوں کے خاتمے
کی وجہ سے آمیزش شروع ہوئی اور اس کے بعد بیرونی مسابقت نے اس
صنعت کو بہت زیادہ سرد کردیا۔ صوبۂ بمبئی میں سوائے سورت کے
جہاں مشینوں کا استعمال شروع ہوچکا تھا ہر جگہ اس کی حالت خراب
تھی، صوبۂ متحدہ کے ضلع بریلی میں جہاں بعض میکانی اصلاحیں عمل میں
لائی گئیں اور معمولی مقامی طلب کے واسطے بہت زیادہ خراب سامان
کا مصنوعی مال تیار ہوتا تھا وہاں اس صنعت کی حالت کچھ
اچھی تھی، اور بعد میں بھی اچھی رہی، اس صنعت کا سب سے زیادہ
ترقی یافتہ مرکز سورت تھا جہاں جنگ سے پہلے ہی بعض میکانی قسم کی
اصلاحوں کی ترویج ہوچکی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء میں سورت میں بھی یہ صنعت
کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہ تھی، جنگ کے بعد والے دور میں اس میں
خاص طور پر بحالی ہوئی کیونکہ ۱۹۲۲ء میں سونے کے درآمدی تار پر ۳۰
فی صدی محصول مال عائد کردیا گیا اور چونکہ جنگ کے بعد سونے کے تار
کی قیمتوں میں تخفیف ہوگئی تھی، لہٰذا ہندوستان میں اس کا صرف بڑھ گیا
سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ٹیرف بورڈ نے اس صنعت کی تحقیق کی تو پتا چلا کہ
ہندوستانی صنعت کے دو خاص مرکز یعنی سورت اور بنارس (جن میں
آخرالذکر خاص اہمیت رکھتا ہے) نے شمالی اور مغربی ہند کے سارے بازار

۲۹۹

پر قبضہ کر لیا تھا، صوبۂ مدراس کی دستی بنائی کی صنعت درآمدی دھاگے سے اچھی قسم کا کپڑا تیار کیا کرتی تھی۔ ٹیرف بورڈ نے محصول کو ۵۰ فی صدی بڑھانے کی سفارش کی تاکہ ایک طرف تو چاندی پر جو محصول عائد ہے اس کی تلافی ہو جائے، دوسری طرف اس تاجین میں اضافہ ہو جائے جو محصول مال کی صورت میں اس کو حاصل ہو گئی تھی۔ یہ صنعت زیادہ تر تعیشاتی صنعت ہے اور خاص طور پر موجودہ زمانے میں اس کی حالت بڑی خراب ہے۔

ہندوستان کے صناعوں کا بیشتر حصہ چھوٹے چھوٹے صناعوں ہی پر مشتمل ہے اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک حصے میں اس قسم کے صناع ہیں جیسے نجار، لوہار جو زیادہ تر مرمتی کاموں میں مصروف ہیں، اور دوسرے میں دستی پارچہ باف، کمہار وغیرہ شامل ہیں، دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی طور پر گھریلو صنعتوں کے بڑے حصے پر مشتمل ہیں، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ گھریلو صنعتوں میں کتنے آدمی مصروف ہیں، اور نہ ہمارے پاس ایسے اعداد ہیں جن سے ان صنعتوں کے تغیرات کا پتا چل سکے، مردم شماری کے جو اعداد موجود ہیں وہ قابل اعتماد نہیں کیونکہ مردم شماری کے وقت خاص اور ضمنی پیشے میں امتیاز کرنا دشوار ہے[1] اور گھریلو صنعتوں کا بڑا حصہ زراعت کے ایک ذیلی پیشے کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا مردم شماری کے اعداد ان افراد کے سلسلے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے جو ان صنعتوں میں مصروف ہیں[2] دیہی صناعوں کے بعض طبقوں پر جو چند اہم اسباب اثر انداز

۳۰۰

[1] سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں یہ امتیاز کیا گیا ہے لیکن اس کے اعداد شائع نہیں ہوئے (مترجم)۔

[2] ہندوستان کی رپورٹ مردم شماری میں کرگھوں کے اندراجات کی فصل سے مقابلہ کیجئے، صفحات ۲۷۰ و مابعد (سنہ ۱۹۲۱ء)۔

ہو رہے تھے ان کا تذکرہ کسی دوسرے باب میں کیا جا چکا ہے[1]۔ اور زیر تبصرہ دور میں ان حالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی "دیہی صناع" والے باب میں اس قسم کے دیہی صناعوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان بڑے طبقوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، اور جن میں کام ذیلی حیثیت کے بجائے کل وقتی حیثیت رکھتا ہے اور ان متذکرہ طبقوں میں نجار اور لوہار خود ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا زیادہ تر کام مرمت کرنا ہوتا ہے اور زرعی معیشت سے ان کا بہت ہی قریبی تعلق ہے اور ان کی حیثیت ان دیہی صناعوں کے مقابلے میں جن کو ادائیاں کی جاتی ہیں زیادہ مستحکم ہے، دیہی دباغ مسلسل تنزل کر رہا ہے اور چونکہ سماجی نقطۂ نظر سے یہ کام حقیر سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ کام کبھی ایک عام گھریلو صنعت نہیں بن سکتا۔ اس کے برخلاف رنگائی اور دستی پارچہ بافی خاص گھریلو صنعتیں ہیں اور یہ سارے ہندوستان میں عام ہیں۔ رنگائی جس کے ساتھ چھپائی بھی ملی ہوئی رہے، اس کو ارزاں مصنوعی رنگوں کی مسابقت سے کافی نقصان پہنچا اور پھر یہ صنعت کچھ سنبھل نہ سکی۔ لیکن دستی پارچہ بافی کا حال مختلف ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا اس میں اس وقت زوال شروع ہوا جبکہ پہلی مرتبہ اس کو مشین کے بنے ہوئے سامان سے مسابقت کرنا پڑی اور اس میں ہر جگہ تھوڑی سی تخفیف ہونے کے بعد اس کی حالت یکساں ہو گئی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ دور میں اس نے تھوڑی بہت ترقی کر لی۔

صنعتی کمیشن نے اپنی رپورٹ کے ایک علٰحدہ نوٹ میں[2] اس صنعت کی وسعت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو انھیں پتا چلا کہ

---

[1] دیکھئے باب دوازدہم۔

[2] ضمیمۂ اول۔

عام علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صنعت میں جتنا دھاگا صرف ہوتا ہے، اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور کم از کم اس صدی کے اوائل سے ہندوستان میں دستی پارچہ بافی کی صنعت نے کافی ترقی کر لی ہے اور یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ جنگ کے بعد سے دستی پارچے کی پیدائش جنگ سے پہلے والے دور کے مقابلے میں بڑھ گئی ہے اور جیسا کہ حکومت بہار و اڑیسہ کے ماہر پارچہ مسٹر کے، ایس، راؤ کے تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے جنگ کے بعد والے دور میں دستی پارچہ کی پیدائش کا اوسط ۱۲۰ کروڑ گز سالانہ سے زائد ہے۔ جنگ کے زمانے میں درآمد اور ہندوستانی کرنیوں کے بنے ہوئے سامان کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے موٹے قسم کے کپڑے کا صرف بڑھ گیا، کپڑے کی اعلیٰ اقسام کا قیمتوں میں غیر معمولی زیادتی اور کسی حد تک کھادی کا پرچار بھی اس کے ذمہ دار ہیں، اکثر مقامات پر کام کرنے کے طریقوں کی اصلاح مثلاً خود بخود چلنے والی پھرکی اور اچھے قسم کے سوت کی تیاری وغیرہ کی وجہ سے بھی اس صنعت کو اپنی حیثیت مضبوط کرنے میں مدد ملی، اور بعض صورتوں میں یہ نئے بازاروں پر قابض ہو گئی جیسے کہ برما کی ہاتھ کی بنی ہوئی لنگیوں کی تجارت برآمد شمالی سرکاروں میں پھیل گئی[1] لیکن اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ دستی پارچے کی صنعت اس وجہ سے بھی قائم ہے کہ اس میں شرح معاوضہ بہت ہی ادنیٰ ہے اور سخت محنت کرنے کے باوجود پارچہ باف اس پر قانع ہے سوائے سہ پہر کو دو یا تین گھنٹوں کے وقفے کے علاوہ اوقات کار تقریباً سارے دن پر مشتمل ہیں پورا خاندان کام کرتا ہے، مرد بنتے ہیں اور عورتیں اور بچے یا تو دھاگا تیار کرتے ہیں یا تاگا لپیٹتے ہیں، آمدنی میں اختلاف ہے، ایک حالیہ تحقیق میں حسب ذیل اندازہ لگایا گیا ہے" اپنی قابلیت اور کرگھوں کی نوعیت کے لحاظ

۳۰۱

[1] راؤ، حوالۂ بالا، نیز مدراس کے محکمۂ صنعت و حرفت کی رپورٹ بابت ۳۱-۱۹۳۰ء۔

سے ایک پارچہ باف ۷۰ روپے کے اصل سے ۱۵ سے ۲۰ روپے ماہانہ تک کما سکتا ہے[1]۔ اس سے آزاد صناع کی متوسط آمدنی کا اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن اس سرمائے کے ساتھ بھی کام کرنے والے خود مختار صناعوں کی بہتات نہ تھی۔ سوت کی فراہمی اور ساتھ ہی اپنی پیداوار کی فروخت کے واسطے ان میں سے بیشتر جولاہوں کا دارومدار درمیانی آدمیوں پر ہوتا تھا، بہتر قسم کے کرگھے مثلاً خود بخود چلنے والے پھر کی دار کرگھے تمام حصوں میں عام نہ تھے[2] کوئمبتور کی صنعت کے علاوہ بازاری حالات بھی غیر منظم تھے، ملک کے بعض حصوں مثلاً مالابار یا جنوبی کنڑا میں چھوٹے چھوٹے کارخانے وجود میں آگئے تھے جو اچھے خاصے چل رہے تھے لیکن ان کے دوش بدوش جولاہوں کے ایسے بڑے طبقے بھی موجود تھے جو اپنا ذاتی سوت خریدتے اور اپنی پیداوار ضلعے کے اردگرد ہفتے واری بازاروں اور میلوں میں خود فروخت کیا کرتے تھے۔

۲۰۲ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں میں دستی پارچہ بافی کی صنعت بہت اہم ہے اس کے بعد چند اور صنعتیں ہیں جو اگرچہ اتنی عام نہیں ہیں تاہم ملک کے مختلف حصوں میں اہم ضرور ہیں، دھات کا کام عموماً دیہی صنعت میں شامل نہیں ہے، روغن دار سامان، گڑیوں یا مخصوص قسم کی ظروف سازی کے علاوہ برتن بنانا بھی ایک عام گھریلو صنعت ہے، اور ارزاں قسم کے معمولی سامان کی تیاری موروثی کمہاروں کے ذمے ہے، پیلہ پروری، ریشم اور ٹسر کی بنائی بھی بعض حصوں کی خاص صنعتیں

[1] بنگال میں گھریلو صنعتوں کی تحقیق (۱۹۲۴ء) ضلع میمن سنگھ۔

[2] ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں جو معلومات فراہم کی گئیں ان سے پتا چلتا ہے کہ صوبۂ مدراس کے اضلاع تامل اور مدراس اور حیدرآباد کے اضلاع تلنگانے میں خود بخود چلنے والی پھرکیوں کا زیادہ رواج تھا بنگال میں کل کرگھوں کے ایک تہائی حصے میں یہ استعمال ہوتی تھیں، آسام اور بہار واڑیسہ میں یہ تناسب اور کم تھا اور صوبجات متحدہ میں تو اس کا استعمال نسبتہً بہت ہی شاذ تھا۔

ہیں، پیلہ پروری میسور کے چند حصوں اور بنگال وکشمیر تک محدود ہے، اس کے برخلاف صوبہ متوسط بہار واڑیسہ اور آسام میں جنگلی ریشم تیار کیا جاتا ہے، ریشم کی بُنائی بھی کافی وسیع ہے مگر یہ زیادہ تر شہری صنعت ہے، پیلہ پروری ہر جگہ زراعت کا ایک ضمنی پیشہ ہے، کیڑے پالنے اور ساتھ ہی ریشم بنانے کے طریقے بہت ہی قدیم ہیں اور یہ صنعت تنزل کر رہی ہے، لاکھ سازی اور اس کی فراہمی بھی اس قسم کی ایک ضمنی صنعت ہے، ہندوستان میں اُون سازی بہت زیادہ عام نہیں اگرچہ اونی قسم کے کمبلوں کی بنائی ملک کے اکثر حصوں میں رائج ہے، پنجاب میں اون کی دستی بنائی کی صنعت کافی پھیلی ہوئی ہے، پانی پت اور اس کے گرد و نواح میں گھوڑے کے بالوں کے ارزاں کمبلوں کی تیاری دیہی صنعت کے لحاظ سے اچھی خاصی اہمیت رکھتی ہے[1] گھریلو صنعتوں کے دوسرے درجے میں سبد سازی، حصیر سازی، بید کا کام، رسن سازی ڈوریاں بنانا، اور ناریل کے ریشوں کی مصنوعات وغیرہ شامل ہیں، ان کا وجود مقامی طور پر خام مال کی فراہمی پر منحصر ہے، مختلف قسم کی ٹوکریاں بنانے کا کام قریب قریب زیادہ عام ہے، اگرچہ پیشے کے اعتبار سے یہ بہت ہی کم منافع بخش ہے، اس درجے کے واسطے ضروری خام مال، ریشے دار سن، سن، جوٹ اور ناریل کے ریشے ہیں، اور ملک کے مختلف حصوں میں یہ صنعتیں ضمنی پیشے کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہیں، جوٹ کی رسیاں اور ڈوریاں بنانے کا کام بنگال کے جوٹ کے اضلاع میں زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں، ناریل کے ریشے کا کام مالابار کی خاص گھریلو صنعت ہے اور یہاں اس کی اس قدر اہمیت ہے کہ بعض اوقات ساحل پر ایک حد تک ناریل کا ریشہ بطور زر استعمال ہوتا ہے[2] جو صنعتیں سیپ اور سینگ وغیرہ سے متعلق ہیں،

۳۰۳

[1] بدری نوتخ - پنجاب کی صنعتیں (۱۹۱۷ء)۔

[2] صوبہ مدراس کی رپورٹ مردم شماری (۱۹۲۱ء)۔

وہ بھی خام مال کے لحاظ سے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ اقسام کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، جنگلی اضلاع میں جنگلی پیداواروں کی بعض صنعتیں اور صوبۂ متحدہ وپنجاب کے بعض اضلاع میں شورہ سازی یا اسی قسم کے دوسرے کام بطور ضمنی پیشے کے مروج ہیں۔

عام طور پر ہندوستان کی شہری اور گھریلو صنعتیں، تنظیم کی کمی اور بہتر طریقوں کو اختیار نہ کرنے کی وجہ سے بڑے نقصان میں رہیں، انھوں نے صنعتی امکانات کے فوائد سے کوئی خاص استفادہ حاصل نہ کیا۔ چنانچہ سید سازی کی صنعت کے متعلق لکھا ہے کہ "ایک بالغ آدمی کی روزانہ آمدنی کا اوسط چار پانچ آنے کے قریب ہے، درمیانی مارواڑی ان کو بید فراہم کر دیتے ہیں اور آمدنی کے بڑے حصے پر قابض ہو جاتے ہیں[1] جہاں تک خام مال کی رسد کی فراہمی اور ان کی تیاری کا حال ہے وہ بہت ہی خراب ہے، مثلاً یہ بات معلوم ہو کر تعجب ہوتا ہے کہ ضلع میرٹھ کے کمبل سازوں کی بڑی تعداد خود ٹولیاں بنا کر خام اُون کی فراہمی کے لیے راجپوتانے اور پنجاب کا دورہ کرتی ہے[2] اگرچہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ۱۸۵۸ء کے بعد سے دیہی اور شہری صنعتوں کی حالت بہت بہتر ہو گئی اور اس کا اندازہ ہندوستانی صنعتی کمیشن کے اس قول سے ہو سکتا ہے وہ جولاہے گرنیوں کا بُنا ہوا سوت، انگریزی کیمیاوی رنگ، تانبے اور پیتل کا کام کرنے والے دھات کی چادریں اور لوہار اپنی بعض مصنوعات میں ڈھلا ہوا لوہا استعمال کرنے لگے ہیں، درزیوں کے پاس سلائی کی مشینیں ہیں اور قصبوں کے صناعوں نے یورپ اور امریکا کے بنے ہوئے بہتر قسم کے اوزار استعمال کرنا شروع کر دیے ہیں[3]، لیکن پھر بھی یہ

---

[1] بنگال کی گھریلو صنعتوں کی تحقیق (۱۹۲۲ء) ضلع نادیا
[2] اضلاع صوبجات متحدہ کی صنعتی تحقیق، میرٹھ۔
[3] حوالہ گزشتہ ص ۱۹۲ -

کہنا بالکل صحیح ہے کہ دیہاتی اور قصباتی صنعتوں کے بازار میں کوئی تنظیم موجود نہیں، مگر خام مال اور مصنوعات کی تیاری میں بہتر طریقوں کی ترویج کے امکانات موجود ہیں اور اس کے بعد ان صنعتوں کے کاریگروں کی معاشی حالت درست ہو سکتی ہے۔ بُنائی، رنگائی اور چھپائی کے سلسلے میں بعض صوبوں میں حکومت نے مظاہرہ کرنے والی جماعتوں اور سفری معلموں کے ذریعے اصلاح کی کچھ کوشش کی ہے، لیکن ابھی ان گھریلو صنعتوں کے لیے جو مخصوص مقامات کے واسطے موزوں ہیں اور موجودہ صنعتوں کی ترقی کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ۳۰۴

ریلیں

زیر تبصرہ دور میں ریلوں کے انتظام میں تقریباً انقلابی تبدیلیاں ہوئیں، جنگ کا زمانہ ریلوں کے نظم و نسق کے واسطے بڑی مشکلات کا دور تھا، فوج اور جنگی سامان کی نقل و حمل کی وجہ سے ریلوں پر بڑا بار پڑ رہا تھا، اور جنگ کے زمانے میں ریلوں کا کچھ کام اس وجہ سے بھی بڑھ گیا کہ کوئلے کا بڑا حصہ جہازوں کے بجائے ادھر ادھر ریلوں سے منتقل کیا جا رہا تھا۔ لہذا ریلوں کی خدمات بہت زائد بڑھ گئی تھیں، اور حکومت ریلوں کی مرمت یا توسیع وغیرہ کے واسطے روپیہ صرف کرنے سے قاصر رہی اور ریلوں کو اپنا سامان اور مال نہ مل سکا۔ دوسری طرف جنگ کے واسطے انجن، ڈبوں اور ریل کا دوسرا سامان عراق و عرب بھیج دیا گیا، اس وجہ سے ہندوستانی ریلوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہوگئی، میکائے کمیٹی کا اندازہ تھا کہ ۱۹۰۵ء کے بعد سے ریلیں اپنی طلب کو مناسب طور پر پورا کرنے سے قاصر رہیں، اور جنگ کے آغاز پر حالت بڑی ناقابل اطمینان تھی، جنگ کے زمانے میں یہ خرابی لازمی طور پر اور ابتر ہوگئی اور جنگ کے بعد والے دور میں مال اور مسافر گاڑیوں کی قلت ناقابل برداشت

ہوگئی۔ جنگی سامان کی نقل وحمل کی شدید دشواریوں کو دور کرنے کے واسطے حکومت نے ۱۹۱۷ء میں افسر نگرانی نقل وحمل اور اس کے بعد مرکزی افضلی کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ مختلف اشیا کی نقل وحمل کا انتظام ان کی اہمیت کے لحاظ سے کیا جائے، کوئلے کی خرید اور اس کی بار برداری کے مخصوص مسائل کے واسطے ناظم کول کا عہدہ قائم کیا گیا، اگرچہ ۱۹۱۹ء کے بعد نقل وحمل کی مذکورۂ بالا قیود میں سے بہت ساری پابندیاں اٹھالی گئیں لیکن اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک کوئلے کی نقل وحمل کے واسطے افسر نقل وحمل کول کا عہدہ قائم رہا۔

جنگ کے زمانے میں تجارت قدرتی طور پر شدید ضابطوں کے تابع ہوگئی لیکن جب جنگ کے بعد والے خوشحالی کے دور میں دشواریوں میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہوگیا تو ۱۹۱۹-۲۰ء ۳۰۵ میں اصلاحات کے واسطے رائے عامہ بڑھنے لگی۔ اس زمانے میں ریلوں کی سہولتیں کس حد تک عوام کی ضروریات کے واسطے کافی ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے جو اس سلسلے میں ایکورتھ کمیٹی نے اختصار کے ساتھ بیان کی ہے[1]۔ اور ۱۹۱۹ء ہی وہ سال تھا جب حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین انتظام کا معاہدہ ختم ہونے والا تھا، لہذا خصوصاً ہندوستانی ریلوں کے آیندہ نظم ونسق اور دوسرے متعلقہ مسائل پر غور کرنے کے متعلق عموماً ۱۹۲۰ء میں وزیر ہند نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں، بعد میں ان ہی کی بنیاد پر ریلوں کی پالیسی معین ہوئی، لہذا یہاں ان کی نوعیت کو مختصراً بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا کمیٹی نے ریلوں کی امداد کے مروجہ طریق کی متفقہ طور پر خدمت کی۔ اس کی رائے میں یہ طریقہ کہ مالی موازنہ جہاں تک اجازت دے سکے ریلوں کے صرف کے واسطے سالانہ ایک رقم معین کردی جائے اور ریلوں کے لیے

[1] باب دوم۔

کوئی ذخیرہ محفوظ نہ ہو، دراصل ریلوں کی ترقی میں رکاوٹ اور اخراجات میں فضول خرچی کا ذمہ دار ہے اس کی وجہ سے مصارف انتظام اور تجدید میں غیر مناسب اخراجات ہوتے ہیں، اس خرابی کو دور کرنے کے واسطے کمیٹی نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ریل کے موازنے کو عام موازنے سے فوراً الگ کردے حکومت کے نگراں ادارے کے دستور کے متعلق کمیٹی نے ریلوں کے واسطے چیف کمشنر کا نیا عہدہ قائم کرنے کی سفارش کی اور ریلوں کے بورڈ کے دستور اور فرایض میں بالکل تبدیلی کردی، ریلوں کے انتظام کو عوام سے قریب ترلانے اور ریلوں اور ان کے گاہکوں کے درمیاں تعلقات اچھے رکھنے کے واسطے کمیٹی نے کرایوں کی کمیٹی اور ریل کی نمائندہ مشاورتی کونسلیں قائم کرنے کی سفارش کی، انتظام کے مسئلے پر کمیٹی میں اختلاف رائے ہوگیا۔ کمیٹی اس بات پر تو متفق تھی کہ لندن سے ریلوں کا انتظام نہ ہونا چاہئے لیکن کمیٹی کے صدر اور چار دیگر ارکان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب ضمانتی کمپنیوں کے معاہدے ختم ہوجائیں تو حکومت براہ راست ان ریلوں کو اپنے انتظام میں لے لے، بقیہ پانچ اراکین نے کمپنی اور سرکاری دونوں انتظامات کو برقرار رکھنے کی رائے دی۔ اور انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ۳۰۶ انتظام لے لینے کے بعد ہندوستان میں رہنے والوں کی ایک کمیٹی بنانے کی سفارش کی۔

ہندوستانی رائے عامہ قطعی طور پر ریلوں کو براہ راست سرکاری انتظام میں لے لینے کی حامی تھی، اور ۱۹۲۳ء میں مجلس وضع قوانین نے ایسٹ انڈیا اور گریٹ انڈین پنسلا ریلوں کو سرکاری انتظام میں لے لینے کی تحریک منظور کی۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت نے یہ ریلیں لے لیں اور گویا اس طرح حکومت نے سرکاری انتظام کے مسئلے کو بالکل قبول کرلیا۔ ریل کے موازنے کے علحدہ کردینے کے سوال کو ۱۹۲۴ء میں مجلس مقننہ نے منظور کرلیا اور عام آمدنی کے واسطے ایک سالانہ رقم کا

تعین کر دیا گیا اور ریلوں کے مالیے کو عام سالانہ موازنے کے قیود سے بالکل آزاد کر دیا گیا، اب ذخیرے رکھے جا سکتے تھے اور نئی سال کی ترقی کے واسطے ایک وسیع پروگرام بنایا جا سکتا تھا، اور ان سالوں میں ایکورتھ کمیٹی کی مجوزہ سفارشات کے اصولوں پر تنظیم میں مناسب تبدیلیاں بھی کی گئیں۔

عرصۂ دراز سے ہندوستانی ریلوں کے کرائے کے متعلق عوام کی جانب سے شدید اعتراض کیا جاتا رہا اور الزام یہ تھا کہ خاص طور پر کرایے تجارت برآمد و درآمد کے واسطے مفید ہیں لیکن اندرونی تجارت اور صنعتوں کے مفاد کے خلاف ہیں، صنعتی کمیشن نے بھی بڑی حد تک اس رائے سے اتفاق کیا تھا، ابتدا ہی سے ریلوں کے کرایوں کی حکمت عملی کا منشا آمد و رفت بڑھانا نہیں، بلکہ اعلیٰ کرایے وصول کرنا تھا اور ضمانتی طریق کے تحت آمد و رفت بڑھانے کی جو کچھ بھی ترغیب تھی وہ بھی جاتی رہی، اور حکومت کرایوں کے مسلک پر کامیاب نگرانی کرنے یا ان پر اثر ڈالنے میں ناکام رہی[1]، کرایوں کے مسلک کی دوسری خرابی یہ تھی کہ مختلف کمپنیاں مخصوص ٹکڑوں کے مختلف کرایے لیتی تھیں تا کہ آمد و رفت ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں تبدیل نہ ہو سکے۔ بعض صورتوں میں یہ خرابی دیگر ذرایع نقل و حمل کو نقصان پہنچانے کے واسطے بڑی بے دردی سے استعمال کی گئی جیسا کہ بروچ کی جہاز رانی کی کمپنی کی صورت میں ہوا۔ بعض صورتوں میں دور دراز مقامات کے مقابلے میں چھوٹے فاصلوں کے کرایے زیادہ لیے جاتے تھے، مثلاً کمیٹی ذخائر نے مثال دی ہے کہ بمبئی سے لاہور تک کا کرایہ جل گانوں سے لاہور تک کے کرایے سے کم ہے۔ اور اس سے شکایت کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے[2]۔ مزید براں یہ کہ مخصوص کرایے بہت زیادہ تھے، اور کرایوں کی

---

[1] ین، بی، مہتا۔ ہندوستانی ریلیں باب چہارم و پنجم۔
[2] ایکورتھ کمیٹی کے خیال میں غیر معمولی ترجیحی کرایے کا الزام درست نہیں ہے، کیونکہ ہر ملک میں ہندرگاہوں

ساری حکمت عملی میں تبدیلی کی ضرورت تھی، دراصل بڑی حد تک ان ہی خرابیوں کو دور کرنے کے واسطے ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے کرایوں کی ایک مشاورتی کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ وہ عوام کی ان شکایات پر غور کر کے اپنی رائے پیش کرے جو ان کو مخصوص کرایوں کے متعلق ہیں۔

سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء کا سال ریلوں کے واسطے بڑی مصروفیت کا رہا، آمد و رفت میں کثیر اضافہ اور ان کو پورا کرنے کے واسطے ریلوں کی ناکافی صلاحیت دونوں سبب اس کے ذمہ دار تھے، جنگ کے فوراً بعد ہی ریلوں کی مرمت اور تجدید کا وہ کام جو کافی عرصے سے ملتوی تھا شروع کیا گیا۔ لیکن ذخائر کی فراہمی میں دشواریوں کی وجہ سے جلد قبل از جنگ والی سطح پر نہ پہنچا جا سکا، مگر اس مصروفیت کا خاتمہ اس کے بعد آنے والی کساد بازاری کی بدولت ہو گیا۔ کساد بازاری، ریلوں کی تجدید کی بڑی تجاویز وغیرہ اور لاگت کی زیادتی کے اثرات یہ ہوئے کہ ان سب نے مل کر سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں آمدنی کا اہم ذریعہ بنانے کے بجائے ریلوں کو دین دار بنا دیا۔ تجارت اور مسافروں کی آمد و رفت بہت جلد اس کساد بازاری سے بحال ہو گئی اور دو سال کے اندر ہی اندر ریلیں پھر کثیر منافع دینے لگیں، ساز و سامان کے نقائص کو تیزی سے دور کیا گیا اور انجنوں اور مال گاڑیوں میں اضافہ اور فنی اصلاحوں کا یہ اثر پڑا کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں ریلوے بورڈ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے پاس ڈبے ضرورت سے بہت زائد ہو گئے ہیں سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء تک ریلیں اچھی طرح چلتی رہیں لیکن اس کے بعد کساد بازاری نے ان کو پھر متاثر کیا اور موازنوں میں مسلسل خسارہ آنے لگا۔

ایکورتھ کمیٹی کی سفارشوں کو منظور کر لینے اور ریل کے موازنے کو علیحدہ کر دینے کی وجہ سے ریلوں کی توسیع میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کو آنے اور جانے والے دونوں کرایے مخصوص ہوتے ہیں۔

کثیر اخراجات کی بڑی تجاویز تیار کی گئیں اور یہ اندازہ کیا گیا کہ آیندہ چند سالوں میں ہندوستانی ریلوں کے طول میں ایک ہزار میل کا اضافہ ہوجائے گا اور ان تجاویز کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ نسبتۃً بڑی شاہراہیں تعمیر نہیں کی گئیں، ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر اُن بڑی شاہراہوں سے ہوئی جو ملک کے طول و عرض سے گزرتی تھیں اور بیشتر بڑی لائنیں تیار ہوچکی تھیں، اس کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ دو لائنوں (رائچور و زگاپٹم اور قاضی پیٹھ و بلہار شاہ اور وسط ہند میں کوئلے کی کانوں تک پہنچنے والی ریل) کے علاوہ جنھوں نے جنوبی اور وسط ہند کو شمالی ہند سے ملانے میں آسانی پیدا کردی تقریباً سو نئی لائنیں بنائی گئیں جن میں سے ہر ایک کا اوسط ۴۹ میل سے زائد نہ تھا، اب جس طریقے پر عمل کیا گیا وہ یہ تھا کہ شاہراہ لائنوں کے درمیان خالی جگہ میں کارآمد شاخیں اور معاونی لائنیں تعمیر کی جائیں کیونکہ ان کی عدم موجودگی کی بھی عرصے سے شکایت کی جارہی تھی، ۱۹۳۰ء میں نئے کاموں کی تعمیر ملتوی کردی گئی اور صرف زیر تعمیر کاموں ہی کی تکمیل کی گئی۔ تیسرے عشرے کے آخر میں جو کوشش ہوئی اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے بخوبی ہوجاتا ہے، ۱۴-۱۹۱۳ء میں آمد و رفت کے واسطے کل ریلوں کا طول ۳۴۶۵۶ میل تھا تو ۲۱-۱۹۲۰ء میں ۳۷،۰۲۹ میل ۲۶-۱۹۲۵ء میں ۳۸،۵۷۹ میل اور مارچ ۱۹۳۱ء کے اختتام تک ۴۲،۲۸۱ میل تک پہنچ گیا۔ مالی دشواریوں اور موٹروں کی بڑھتی ہوئی ترقی کی وجہ سے کوئی نئی تجویز زیر غور نہیں ہے بلکہ آخرالذکر سبب کی وجہ سے ریلوں کی تعمیر کے مسئلے پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ظاہر ہوجائے گا کہ گزشتہ چند سالوں میں ریلوں کے طریق کار میں کس قدر مکمل تبدیلی ہوئی ہندوستانی ریلوں کا بڑا حصہ

۳۰۸

اب سرکاری ملکیت ہے سنہ ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی ریلوں کا ۸ء ۱۷ فی صدی حصہ سرکاری ملک اور ۲ء ۴۰ فی صدی حصہ براہ راست اس کے زیر انتظام تھا اب بہت زیادہ اشتراک عمل ہے اور مختلف ریلوں کی کمپنیوں میں پچھلی سی بے معنی مسابقت باقی نہیں رہی۔ ریل کی پالیسی ایک منظم حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے اور اب رائے عامہ سے بھی کسی حد تک متاثر ہونے لگی ہے اور ملک کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔

چند سالوں سے موٹروں کی ترقی کی وجہ سے نقل وحمل بذریعۂ سڑک کا سوال بہت اہم ہوگیا ہے اور در اصل یہاں ہم ذرایع نقل وحمل میں انقلاب کی ایک ابتدائی منزل پر ہیں، موٹروں کے ابتدائی دور میں یہ ذریعہ ریلوں کی نقل وحمل میں مدد کرنے کے واسطے تھا مگر اب اس نے مسافروں کی آمد ورفت کے سلسلے میں ایک حریف کی صورت اختیار کرلی ہے، اس نے چھوٹی ریلوں کو بہت زیادہ متاثر کیا، لیکن جہاں ریلوں کے متوازی اچھی پختہ سڑکیں موجود ہیں اور خصوصاً جہاں کہ سڑکوں کی مسافت ریل کے مقابلے میں کم ہے وہاں نقل وحمل بذریعہ موٹر کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے ابھی موٹر کے ذریعے مال واسباب کی نقل وحمل کا طریقہ رائج نہیں ہوا لیکن یہ توقع ہے کہ تجارت کی تجدید اور سڑک کے ذریعے نقل وحمل کرنے والی ایجنسیوں کی بہتر تنظیم سے نقل وحمل کا یہ ذریعہ بھی متاثر ہونے لگے گا[1] اگر ریلوں کی مزید ترقی میں ریل اور سڑک کی سہولتوں کا مشترک خیال رکھا جائے اور ان دونوں اداروں میں مناسب تعاون پیدا کردیا جائے تو امکان ہے کہ غیر ضروری اور بے فائدہ مسابقت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

۳۰۹

[1] مچل وکرک نیس۔ ہندوستان میں ریل اور سڑک کی مسابقت پر رپورٹ (سنہ ۱۹۳۳ء)۔

اختتام

سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے ہندوستان کی شہری آبادی میں کسی خاص اضافے کے رجحان کا پتا نہیں چلتا، کل آبادی کا ۲ء۱۰ فی صدی حصہ شہری آبادی پر مشتمل تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء کے مقابلے میں اب صرف ۶ء فی صدی کا اضافہ ہوا، یہ کوئی بڑا فرق نہ تھا، قصبوں کے مجموعے کے تناسب میں بھی کوئی قابل لحاظ تغیر نہیں ہوا، سنہ ۱۹۲۱ء کے اعداد میں ناظم مردم شماری کو شہری آبادی میں یہ خصوصیت نظر آئی کہ اب وہ بڑے شہروں میں مجتمع ہونے لگی، لیکن محض ایک عشرے کی تبدیلی یہ بات فرض کر لینے کے لیے کافی نہیں کہ اس قسم کا کوئی مسلسل رجحان پیدا ہو گیا تھا، جیسا کہ صفحہ ۱۴۰ (انگریزی متن) کے نقشے سے ظاہر ہو گا سنہ ۱۹۰۱ء-۱۹۲۱ء تک ان درجوں میں کوئی خاص فرق نہ ہوا تھا اور مردم شماری کے گزشتہ عشرے میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ بھی قابل لحاظ نہیں، انفرادی قصبات کے اعداد سے بھی کسی خاص خصوصیت کا پتا نہیں چلتا، بڑے شہروں میں قابل لحاظ اضافہ بمبئی، کلکتہ، رنگون، دہلی، لاہور کراچی، احمد آباد اور شولاپور میں ہوا لیکن حیدرآباد (دکن) الہ آباد بنارس، لکھنو، پٹنہ، اور جے پور میں، تنزل ہوا، سب سے زیادہ

حیرت انگیز ترقی جمشید پور میں ہوئی جس کی آبادی سنہ ۱۹۱۱ء میں ۵،۶۷۲ تھی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں ۵۷،۳۸۵ ہوگئی۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں شہری آبادی بھی کم و بیش اسی حد کے اندر رہی جیسی کہ گزشتہ عشروں میں رہی تھی، ابتدائی شایع شدہ اعداد سے پتا چلتا ہے کہ مجموعی آبادی کے لحاظ سے شہری آبادی کا تناسب ۱۱ فی صدی کے قریب تھا، نیز اضافہ صرف ان بڑے شہروں میں ہوا جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زائد تھی۔ اکثر ایسے شہر جن کی آبادی گزشتہ مردم شماریوں میں تنزل پذیر رہی اب ان میں متوسط اضافہ ہو رہا تھا، بعض شہروں مثلاً دہلی، لاہور، امرتسر، ناگپور، سیلم کی آبادی میں کافی اضافہ ہوگیا۔ بڑے شہروں میں بنارس اور اجمیر جمودی حالت میں تھے اور مانڈلے اور سورت کی آبادی میں بہت کافی تخفیف ہوگئی۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ بمبئی جیسے شہر کی آبادی میں بھی تھوڑی سی کمی ہوگئی۔ تمام صوبوں کی رپورٹوں کی غیر موجودگی اور مختلف، قصبات کے مجموعے میں جو بیشی ہوئی اس کے اعداد کی عدم فراہمی کی وجہ سے ان پر کچھ زیادہ تبصرہ کرنا ممکن نہیں[1]۔

۳۱۰

زیرِ تبصرہ دور میں دو قابلِ ذکر واقعات پیش آئے، یعنی ایک تو صنعتوں کے متعلق حکومت کے طرزِ عمل میں تبدیلی ہوئی[2] اور دوسرے لوہے و فولاد کی صنعت قائم ہوگئی، پچھلے دور میں حکومت ہمیشہ عدم مداخلت کے سخت اصول پر عامل رہی، لارڈ مارلے نے صوبہ واری محکمۂ جات صنعت و حرفت کے قیام کو بھی مشتبہ سمجھتے تھے، محصول ہمیشہ انگریز صنعت گروں کی خواہشات کے مطابق عائد کیے جاتے تھے اور ابتدائی قوانین مزدوراں

---

[1] سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے اعداد اور شہروں کی آبادی کے تقابل کے لیے ملاحظہ ہو نقشۂ اختتام باب دہم (مترجم)۔

[2] نئی پالیسی کا قابلِ تعریف بیان، اے، جی، کلو کی کتاب حکومت اور صنعت میں ملتا ہے (سنہ ۱۹۲۷-۱۹۲۰ء)۔

کی تحریک بھی انھی کی جانب سے ہوئی۔ لیکن جنگ نے اس نظام کو تبدیل کر دیا، اگرچہ جنگ سے پہلے بھی بعض صوبہ واری حکومتیں صنعتوں کی امداد کی ضرورت کو تسلیم کر چکی تھیں مگر وہ بے بس تھیں، جنگ نے بہت ہی واضح طریقے پر ہندوستانی صنعتی غربت کو ظاہر کر دیا اور حکومت کو ہر جہتی صنعتی ترقی کی قومی اہمیت کا احساس ہوا، حکومت نے صنعتوں اور تجارت پر اپنی نگرانی تو ابتدا ہی میں قایم کر دی اور جیسے کہ جنگ بڑھتی رہی تو بعض صنعتوں کو جلد از جلد ترقی دینے کی ضرورت ناگزیر ہو گئی۔ ذخائرِ حرب کی ضرورت سب سے زیادہ شدید تھی اور فروری ۱۹۱۷ء میں سپہ سالارِ اعظم کے مشورے سے مجلس ذخائرِ حرب کا قیام عمل میں آیا، مجلس کو وسیع اختیارات دیے گیے، اس کا خاص مقصد ہندوستان کے صنعتی وسائل کو ترقی دے کر ان کو جنگ کے واسطے استعمال کرنا تھا۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ محض پیدائش کو ترقی دینے یا باضابطہ کر دینے سے کام نہیں چل سکتا چنانچہ بعض کاموں کو خود حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مرکب کاربن، فوجی وردیوں اور چرمی سامان کے کارخانے قایم کئے گئے۔

۲۱۱

ہندوستانی رائے عامہ ہمیشہ سے صنعتوں کی مالی امداد پر اصرار کرتی رہی اور آخرکار ۱۹۱۶ء میں حکومت نے صنعتی کمیشن مقرر کیا تاکہ اس بات کی تحقیق کی جا سکے کہ حکومت صنعتوں کی بالراست امداد کیسے کر سکتی ہے اصول تعین محصول کمیشن کے دائرۂ تحقیق میں شامل نہیں کیے گیے، کمیشن نے ۱۹۱۸ء میں رپورٹ پیش کی، اور اس نے حکومت کو صنعتی معاملات میں تیزی سے مداخلت کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے مرکزی اور صوبہ واری محکمہائے صنعت و حرفت کے قیام، سائینٹفک اور فنی خدمات کی تنظیم، بالخصوص ایک کل ہند کیمیکل سروس، صنعتی اور فنی تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی، اور ذخائرِ حرب کی خریداری کے سلسلے میں حکومت کے طریق عمل میں تبدیلی کی سفارش کی نیز مالی امداد

آزمائشی اور مظاہری کارخانے قایم کرکے صنعتوں کی براہ راست امداد پربھی زور دیا۔ ان تمام سفارشات کو مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں نے تسلیم کرلیا، لیکن اسی زمانے میں جنگی مالیہ نے حکومت کو اشیائے درآمد پر بھاری محصول عائد کرنے پر مجبور کیا اور آزاد تجارت کے نام نہاد مسلک کو عارضی طور پر خیرباد کہدیا گیا، اور روئی پر محصول جنگی عائد کیا گیا جنگ کے بعد جب اصلاحات عطا کی گئیں تو نئی مالی پالیسی کا آغاز بھی ہوا، سنہ ۱۹۲۱ئہ میں اس طریق عمل پر غور کرنے کے واسطے مالسیاتی کمیشن کا تقرر ہوا، کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی ہندوستان کی صنعتی ترقی مکمل نہیں ہے اور ہندوستانی صنعتوں کی مزید ترقی میں ہی ملک کا افادہ مضمر ہے، اس نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تامینی مسلک پر عمل کرنا ضروری ہے، اگرچہ اکثریت نے امتیازی تامین کی حمایت کی، لیکن اکثریت تامین کے اصول کو کسی طرح محدود یا قابل ترمیم بنانا نہیں چاہتی تھی، اکثریت نے اس بات کی سفارش کی کہ امتیازی تامین کے واسطے بعض صنعتوں کو منتخب کرلیا جائے اور تامین کے سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو عوام پر اس کا بار کم سے کم پڑے، اور تامین چاہنے والی صنعتوں کے حالات پر غور کرنے کے واسطے ٹیرف بورڈ مقرر کیا جائے، اور یہ بورڈ تامین کی سفارش کرتے وقت ان حالات کے متعلق اطمینان حاصل کرلے کہ آیا صنعت کو قدرتی فوائد حاصل ہیں، دوسرے یہ کہ کیا یہ صنعت بلا تامین کے اس قدر تیزی سے یا بالکل ترقی نہیں کرسکتی جیسی کہ ضرورت ہے، تیسرے یہ کہ بالآخر یہ صنعت بلا تامین کے مسابقت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائے گی۔ حکومت نے ان سفارشات کو منظور کرلیا اور جولائی سنہ ۱۹۲۳ئہ میں ٹیرف بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ ۳۱۲

اس طرح لڑائی شروع ہوجانے کی وجہ سے ایک عشرے کے اندر ہی صنعتوں کے متعلق حکومت ہند کے طریق عمل میں بالکل تبدیلی ہوگئی،

اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتیں صوبے واری حکومتوں کے تحت آگئیں اور مختلف صوبوں نے مختلف طریقوں سے صنعتی کمیشن کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، ابتدا میں ہر جگہ صنعت و حرفت کے صوبے واری محکمے قایم کیے گیے لیکن بعد میں مالی دشواریوں اور دوسرے اسباب کی بنا پر صوبے واری حکومتوں کے کام میں ہر جگہ یکساں ذوق شوق نظر نہیں آتا، کُل ہند کیمکل سروس کا خیال ابتدائی مدارج ہی میں ختم کر دیا گیا اور اس سلسلے میں صوبے واری حکومتوں نے اپنے طریق کار کو الگ الگ منتخب کر لیا۔ ڈیرہ دون کا جنگلاتی تحقیق کرنے والا ادارہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ صوبہ جات متحدہ کی حکومت نے کانپور میں ایک ادارۂ فنون قایم کر رکھا ہے اور کلکتے میں چرم سازی کی تحقیق کے واسطے ایک کارخانہ قایم ہے، مدراس میں چرمی تجارت اور سریش وغیرہ کے متعلق کچھ کام کیا گیا۔ وہاں صابن سازی کا ایک کارخانہ بھی قایم ہے" یہ حکومت محکمۂ سمکیات کو بھی چلاتی ہے، دوسری صوبے واری حکومتوں نے مخصوص صنعتی مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی، صوبے واری قوانین کی بدولت انفرادی صنعتیں اپنے اوپر محصول عائد کرنے اور اس رقم سے تجرباتی کام کرنے کے قابل ہوگئیں جیسا کہ نیل اور لاکھ کی صنعتوں میں ہوا، صنعتی تعلیم ہر جگہ پیش پیش رہی اور تقریباً ہر صوبے میں بُنائی کے چھوٹے مدرسے قایم کر دیے گئے، دستی پارچہ بافی کو مظاہرہ کرنے والی جماعتوں اور دورہ کرنے والے معلموں سے کافی امداد ملی، صوبۂ متحدہ میں تمام صنعتوں کا حال دریافت کیا گیا اور بنگال و مدراس میں گھریلو صنعتوں کی تحقیق عمل میں آئی اور بعض صوبے واری محکمے تجارتی معلومات فراہم کرتے ہیں اور کارخانے قایم کرنے کے بارے میں فنی مشورہ اور امداد بھی دیتے ہیں، براہ راست امداد کے سلسلے میں اکثر صوبوں میں نمائشی کارخانے قائم کیے گئے لیکن ان میں سے بیشتر ناکام رہے۔ اس طریقے سے مدراس میں روشنائی کی صنعت کامیابی سے قایم ہو گئی، لیکن دوسری صورتوں میں تجربات کامیاب

نہیں ہوئے، حکومت پنجاب کا کارخانۂ دباغت ناکام رہا اور صوبۂ متحدہ
کے ریل (گیٹی) بنانے والے سرکاری کارخانے کا بھی یہی حشر ہوا۔ اکثر ۲۱۴
صوبے واری حکومتوں کے ہاں ایسے قوانین ہیں جن کے تحت وہ صنعتوں
کی مالی امداد کرتی ہیں، بنگال میں عنقریب ایک قانون نافذ ہونے والا
ہے، صوبے واری حکومتوں نے اب تک جتنے بڑے کاروباروں کی مالی
امداد کی ان سب میں ناکامی ہوئی، چنانچہ کرناٹک کے کاغذی کارخانے
کو قرض دینے کی وجہ سے حکومت مدراس اور انڈین اسٹیل وائر پروڈکٹس
کمپنی کو قرض دینے کی بدولت حکومت بہار واڑیسہ کو کافی نقصان اٹھانا
پڑا، صوبے جات متحدہ کی حکومت نے جتنے بھی بڑے قرضے دیے ان
سب میں ناکامی ہوئی، لیکن چھوٹی صنعتوں کو چھوٹی رقمیں دینے کا طریقہ
ہر جگہ کامیاب ثابت ہوا اور حکومت بنگال نے بُنائی کے مدارس کے
سابق طلبا کو باقاعدہ طریقے پر امداد دینا شروع کی جو بہت کامیاب رہی۔
حکومت ہند نے اپنے خریدی ذخائر کے مسلک میں بھی بڑی تبدیلی
کردی اور کمیٹی خریدی ذخائر کی سفارش پر محکمۂ ذخائر قائم کردیا گیا۔ اور
یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ ملکی تیار شدہ اشیا اس وقت تک خاص ترجیح کی
مستحق ہیں جب تک کہ ان کی قیمت معقول ہو۔

لیکن سب سے زیادہ اہم امداد تأمینی محاصل یا مالی مدد کی
بدولت ہوئی، جولائی ۱۹۲۳ء میں ٹیرف بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور
جب سے اب تک وہ متعدد صنعتوں کی درخواست پر غور کرچکا ہے اور
اس کی سفارشات پر فولاد کی صنعت کو برابر امداد دی جاتی رہی، لہذا یہ
کہنا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں کہ ہندوستان میں لوہے و فولاد کی صنعت
کامیابی سے اسی وقت قائم ہوسکی جبکہ حکومت نے اپنی مالی مسلک
میں تبدیلی کردی۔ ہم اوپر یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح سوتی پارچوں، بھاری
کیمیاوی اشیا، شکر، دیا سلائی اور طلائی تار کو تأمین عطا کی گئی،
بانس سے بننے والے کاغذ کو تأمین دینے کے واسطے ۱۹۲۷ء میں ایک

قانون نافذ ہوا جس کی رو سے ارزاں کاغذ کے علاوہ ہر قسم کے کاغذ کو تامین مل گئی۔ اور چھاپنے کی سیاہی کے محصول میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف جست، گندھک، مشینوں، گرنیوں کے سامان وغیرہ پر جو محاصل عائد تھے وہ سب اٹھا دیے گئے تاکہ قلعی دار سامان، کیمیاوی اشیا اور سوتی پارچے کی صنعتیں ترقی کر سکیں، یہ کہنا کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں کہ حکومت کے طرزِ عمل میں تبدیلی کی وجہ سے ہندوستانی صنعتوں نے کافی ترقی کی اور مرکزی اور صوبے واری حکومتوں نے اس سلسلے میں جو نئی کوششیں کیں محض ان کو شمار کر لینے ہی سے تغیر کے رخ کا پتا چل جاتا ہے۔

۳۱۴ اختتام کے ذیل میں یہ ضروری نہیں کہ اسی قسم کے نتائج اخذ کیے جائیں جیسے کہ چودھویں باب میں پیش کیے گئے ہیں، یہاں ان نتائج کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو پچھلے دور میں بعض تحقیقاتوں سے ظاہر ہوئے، اگرچہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے درمیان ایک شدید قحط پڑا لیکن ملک کثرتِ اموات سے محفوظ رہا۔ گزشتہ مرتبہ جو کام قحط کیا کرتے تھے وہ اس مرتبے انفلوئنزا نے کیا اور غالباً یہ بیماری خوراک کی قلت اور کپڑوں کی قیمت کی گرانی کی وجہ سے پھیلی اور اسی وجہ سے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کی آبادی میں بہت کم اضافہ ہوا، ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں اس قسم کے غیر معمولی واقعات پیش نہ آئے اور اب آبادی بڑھ کر ۳۵ کروڑ ہو گئی۔ اشیائے خوردنی کی برآمد میں کمی، مویشی کی مسلسل ابتر حالت اور تقسیم اراضی میں اضافہ یہ سب چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ آبادی کا بار زمین پر برابر بڑھتا جا رہا تھا، البتہ پنجاب کی نہری نو آبادیوں نے اپنے علاقے میں کچھ مدد کی اور سکھر کے بند کی وجہ سے بھی یہ مسئلہ کچھ سنبھل گیا۔ لیکن ذرائع آب پاشی کے ترقی کے امکانات محدود ہیں، نیز کسی اور پہلو سے امداد کی کوئی مزید علامت نظر نہیں آتی۔

زیر تبصرہ دور میں ہندوستانی اصل بھی کچھ زیادہ جری ہوگیا اور شغل اصل کی زائد سہولتیں پیدا ہوجانے کی وجہ سے یہ صنعتی اغراض کے لیے زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔ بعض صنعتوں مثلاً چائے کی نخل بندیوں میں یہ رجحان بہت زیادہ نمایاں ہوگیا اور صنعت کے حصے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ منتقل ہونے لگے۔ ان کمپنیوں میں بھی جو غیر ہندوستانیوں کے انتظام میں ہیں اب ہندوستانیوں کے حصے بڑھ رہے ہیں، چنانچہ جوٹ کی یہی صورت رہی' اس رجحان کی فرید علامات یہ تھیں کہ بیرونی اصل کی کمیٹی نے بتایا کہ حکومت کے روپے والے قرضوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور ۱۹۱۴ء کے بعد سے حصص مشترک کی کمپنیوں کے سرمائے بھی بڑھ رہے ہیں' لیکن ابھی تک ہندوستانی صنعتوں کا بڑا حصہ بیرونی سرمائے پر مشتمل ہے اور تا ہینی مسلک اختیار کر لینے کے بعد خارجی اصل کا مسئلہ خصوصیت سے اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور کم از کم اب یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ تعلیم کے فوائد سے صرف انھی کاروبار کو مستفید ہونے کا موقع دیا جائے جن کی رجسٹری ہندوستان میں ہوئی ہو، جن کا سرمایہ روپیوں کی شکل میں ہو اور جن کے نظما میں ہندوستانیوں کی ایک خاص تعداد ہو' لیکن اس مسلک کو روبہ عمل لانے میں مختلف دقتوں کا سامنا ہے اور فی الوقت اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ تا ہینی مسلک سے صرف ہندوستانی ہی مستفید ہوں گے۔ ۲۱۵

صنعتوں میں ہندوستانی اصل کی تنظیم کے متعلق مرکزی اور صوبے واری بنک کاری کمیٹیوں نے تفصیل سے غور کیا۔ مرکزی کمیٹی نے سفارش کی کہ ہندوستان میں ایسے طریقے کو رائج کرنے کی کوشش کی جائے جس سے صنعتی کمپنیوں اور تجارتی بنکوں کے درمیان براہ راست دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں اور مینیجنگ ایجنسی طریق کا توسط کم ہو جائے' مرکزی کمیٹی اور اکثر صوبے واری کمیٹیوں نے صوبجاتی صنعتی بنک اور اگر ضرورت ہو تو

ان کی شاخیں قائم کرنے کی سفارش بھی کی تاکہ صنعتوں کو طویل مدت کے واسطے قرضے مل سکیں، مرکزی کمیٹی نے مدراس کے صنعتوں کو سرکاری امداد دینے والے قانون کے مماثل صوبے واری قانون بنانے کی سفارش بھی کی تاکہ نئی اور نوخیز یا نئی قائم شدہ اور گھریلو صنعتوں کو قرضے کی سہولتیں فراہم ہو جائیں۔

صنعتی کمیشن نے رائے ظاہر کی کہ ہندوستانی مزدور کی کارکردگی کم ہے اور محض اسی وجہ سے اصلاح کے امکانات کافی ہیں، گزشتہ عشرے کے واقعات نے اس چیز کو بڑی حد تک ثابت کر دیا۔ ٹیرف بورڈ نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ دیا سلائی کی صنعت کے مصارف پیدائش میں جو تخفیف ہوئی اس کی وجہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی کارکردگی تھی، ٹین کی پلیٹوں کی صنعت کی کامیابی ہندوستانی مزدور کی اچھی صلاحیت کی ایک دوسری مثال ہے، جنرل موٹرس کے "مشرقی خطے واری پیدائش کے منیجر" نے ایک حالیہ ملاقات میں کہا کہ ہندوستانی مزدور کی عام قابلیت اور صلاحیت اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ دوسرے ملک کے مزدوروں کی، اس کی مزید رائے تھی کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ مزدوروں کی تعلیم اور صحیح تربیت تھی تاکہ وہ ان کاموں کو سہولت سے انجام دے سکیں جن کے وہ عادی نہیں رہے[1]۔ صنعتی کمیشن نے اس دقت کی طرف بھی اشارہ کیا جو ہندوستانی صنعت کو بیرونی فورمین اور نگرانی کرنے والوں کی وجہ سے پیش آتی ہے، لیکن اس سلسلے میں مختلف صنعتوں میں جو کام ہو رہا تھا وہ قابل اطمینان ہے۔

ہندوستان کے مختلف صنعتی نقائص میں سب سے زیادہ ترقی فلزاتی اشیا کے درجے میں ہوئی لوہا و فولاد اب ہندوستانی مصنوعات بن گئی ہیں، اور آیندہ توقع ہے کہ لوہے و فولاد کی مصنوعات میں تیزی ۳۱۶

[1] پیبر گزٹ (جنوری ۱۹۲۹ء) نیز ملاحظہ ہو "ہندوستانی مزدور کی غیر کارکردگی ایک افسانہ ہے" انڈین ٹیکسٹائل جرنل (مارچ ۱۹۲۸ء)

سے ترقی ہو گی - امید ہے کہ اگر برما کی مختلف خام اشیا سے پورا پورا استفادہ کیا جائے تو ہندوستان میں فلزاتی اور کیمیاوی صنعتوں کا ایک اچھا خاصا خود کفالتی درجہ پیدا ہو سکتا ہے، بہرحال اس وقت ہندوستان میں کیمیاوی اشیا اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں بار آور نہیں ہیں اور اس سلسلے میں دشواریاں بدستور قائم رہیں۔

لیکن اس سے زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ ایندھن اور قوت متحرکہ کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے دراصل اس کی وجہ ہندوستانی کوئلے کی مقدار کی کمی نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت اور کانوں کا جائے وقوع ناقابل اطمینان ہے، مغربی ہند، مدراس اور پنجاب تک کوئلہ پہنچانے کے مصارف بہت زیادہ ہیں، لہذا ان خطوں کی صنعتوں کو زیادہ بار برداشت کرنا پڑتا ہے، ٹیرف بورڈ کی رائے تھی کہ کھار گھوڑا میں میگنیشیم کلورائڈ کی تیاری میں جہاں لکڑی بطور ایندھن استعمال کی جاتی ہے وہاں ایندھن کے مصارف بہت زائد ہو جاتے ہیں اور اس صنعت کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے۔ اس قسم کی دقتیں اکثر سیمنٹ کے کارخانوں کو بھی برداشت کرنا پڑیں، ہندوستان میں صنعت شیشہ کے موزون مقامات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر فاکس کہتے ہیں کہ مصارف کے لحاظ سے دو ہی چیزیں قابل لحاظ ہیں ایک القلی اور دوسرا کوئلہ، چونکہ ساری القلی درآمد کی جاتی ہے لہذا اس صنعت کو کسی بندرگاہ میں قائم ہونا چاہئے اور اگر کوئلے کے مصارف کو گھٹانا ہے تو یہ صنعت صرف کلکتے میں قائم کی جاسکتی ہے[1]۔ کلکتے کے گردونواح اور جمشید پور کے رقبے ہی میں مختلف صنعتوں کی ترقی کا امکان ہے۔

ایک زمانے میں ہندوستان میں جل بجلی کی ترقی کے امکانات کے متعلق مبالغہ آمیز امیدیں وابستہ کی گئی تھیں مگر تحقیقات سے معلوم

[1] سی، ایس، فاکس۔ شیشہ سازی پر نوٹ۔

ہوا کہ اگرچہ بعض علاقوں میں اس ذریعے سے کافی قوت پیدا کی جا سکتی ہے مگر یہ اتنی سستی نہ ہوگی جتنی کہ امید کی گئی تھی، ہندوستان میں موسمی بارش کی خصوصیت کی وجہ سے قوت متحرکہ کے واسطے سال بھر بہنے والا پانی صرف چند مستثنیاتی خطوں ہی میں پایا جاتا ہے، تقریباً ہر جگہ بارش کی کمی کی وجہ سے پانی کو ذخیرہ کرنے کی ضرورت لازمی ہے، مگر ان صورتوں میں مصارف بہت زیادہ ہوں گے اس لیے قوت متحرکہ ارزاں نہیں ہو سکتی، ہندوستان میں سب سے پہلا کارخانہ ٹاٹا جل برقی کمپنی تھی جس نے ۱۹۱۵ء سے بجلی مہیا کرنا شروع کی، یہ مغربی گھاٹ میں واقع ہے جہاں بارش کا پانی جمع کر لیا جاتا ہے اس رقبے میں دو اور کمپنیاں قائم ہیں جو ٹاٹا کی نگرانی میں کام کر رہی ہیں، انھی سے بمبئی کے تمام شہر اور بمبئی کے رقبے میں سوتی گرنیوں کو برقی قوت مہیا کی جاتی ہے۔ ٹاٹا جل برقی کارخانے نے ۱۹۱۵ء سے روئی کی گرنیوں کو بجلی دینا شروع کی، شرح نصف آنہ فی اکائی تھی۔ اور اسی شرح پر آیندہ دس سال تک بجلی دینے کا وعدہ کیا گیا، یہ بہت ارزاں تھی، اور خصوصاً جنگ کے بعد والے دور میں جبکہ کوئلے کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا لیکن ۱۹۲۵ء سے کمپنی نے اپنا نرخ ⅜ آنے فی اکائی کر دیا۔ اور اب یہ امر مشتبہ ہو گیا کہ آیا بمبئی میں کوئلے کے مقابلے میں بجلی ارزاں ہے[1] ہندوستانی صوبوں میں جل بجلی کا قابل ذکر سلسلہ پنجاب میں منڈی کی تجویز ہے، یہ ابھی ترقی کے ابتدائی مدارج میں ہے اور توقع ہے کہ اس سے پنجاب کے بیس قصبوں کو بجلی پہنچائی جا سکے گی، یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے تو اس سے بڑی مقدار میں قوت پیدا ہو سکتی ہے اور دہلی جیسے دور کے شہروں تک پہنچائی جا سکتی

۴۱۷

[1] لیکن چھوٹی صنعتوں نے اس ترقی سے استفادہ نہیں کیا کیونکہ ان صنعتوں کو بجلی نہیں دی گئی جن کا سالانہ خرچ ۵ لاکھ اکائیوں سے کم تھا۔

ہے۔ ابھی صرف اس کا پہلا حصہ منظور ہوا ہے اور اندازہ ہے کہ یہ کارخانہ ۳¼ آنے فی اکائی کے حساب سے بجلی مہیا کر سکے گا، جل بجلی کی حالیہ ترقی نے بمبئی اور اس کے گرد و نواح اور پنجاب کے بعض شہروں میں کم از کم قوت متحرکہ کی ایک متبادل صورت پیش کردی ہے لیکن ان مقامات پر بہرحال کوئلہ خصوصیت سے گراں ہے، اس لئے مصارف پیدائش میں کوئی خاص تخفیف نہیں کی۔ ہندوستان کے قوت متحرکہ کے وسائل میں اضافہ ضرور ہوا مگر قوت ارزاں نہیں ہے، صنعتی کمیشن نے امید ظاہر کی تھی کہ اگر ارزاں بجلی فراہم ہو جائے تو ہندوستان میں برق کیمیائی صنعتیں اچھی خاصی پیدا ہو سکتی ہیں، مثلاً کونکن کے بوزٹ (Bauxite) کی مخزنوں کی بدولت المونیم کی صنعت پیدا ہو سکتی ہے۔ برق کیمیاوی صنعتوں کے واسطے ارزان قوت متحرکہ کی ضرورت لازمی ہے اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ اس کو کم از کم پون آنہ فی اکائی کے حساب سے بجلی ملنا چاہئے[1]، مگر یہ شرح مروجہ شرح سے بہت کم ہے۔

اگرچہ جنگ کے زمانے کی بہت سی اُمیدیں پوری نہ ہوئیں لیکن بہت کچھ پوری ہو گئیں ملک میں لوہے و فولاد کی صنعت قائم ہو جانے اور حکومت کے مسلک میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے مستقبل کی توقعات ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں بہت اچھی ہیں۔ مقداری نقطۂ نظر سے ملک میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ بہت ہی کم ہے، پھر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ہندوستان علیحدہ علیحدہ قدرتی معاشی خطوں کا ایک وسیع ملک ہے اگرچہ بعض رقبوں میں قابل لحاظ ترقی ہو چکی ہے لیکن اس دور میں دوسرے حصوں میں بہت ہی کم ترقی ہوئی۔ اور مجموعی حیثیت سے مستقبل قریب میں ہندوستان میں کم از کم کسی صنعتی کایا پلٹ کی توقع نظر نہیں آتی۔

۳۱۸

[1] کیپیٹل ہندوستانی صنعتوں کا ضمیمہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

ہفتہ واری بازار پر ایک نوٹ[1]

ہندوستان کے قدیم معاشی نظام میں بھی میلے کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور عمدہ سڑکوں کی تعمیر کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت جب سڑکوں کی تعمیر تیزی سے شروع ہو گئی تھی، صوبجات متوسط کے ایک ضلع کے ہفتہ واری بازار کا مندرجۂ ذیل حال ان بعض امور کی وضاحت کر دے گا جن سے باب دوازدہم میں بحث کی گئی ہے۔

"چھنور کی تجارت میں ہفتہ واری میلے تک پہنچنے والی ایک اہم ترین شے موٹی قسم کا کپڑا ہوتی ہے جو کلیۃً ڈھیڑوں[2] کے ہاتھ بنی ہے، کپڑا موٹا اور مضبوط ہوتا ہے اور برار کے کُنبی کاشتکاروں میں بہت مقبول ہے، جن کو انگریزی خوش وضع لیکن نسبتاً کمزور کپڑے بالکل پسند نہیں، اس کی

---

[1] رپورٹ کرناک نے روئی کے محکمے کی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۹۵-۹۶ء میں اس میلے کی تفصیلات بیان کی ہیں، یہ اقتباس اور اعداد وہیں سے لیے گئے ہیں صفحات ۲۱-۲۸۔

[2] یہ جولاہوں کی کوئی ذات نہیں ہے بلکہ دیہی کمینوں کی ایک نیچ ذات ہے اور بمبئی دکن کے مہار سے ملتی جلتی ہے۔

تجارت خام روئی کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے اس لیے متاثر نہیں ہوئی کہ کپڑے کی قیمت میں خام مال کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوا لیکن اب اس میں کافی اضافہ ہو گیا تاہم خوشحال کنبیوں نے اس کو پہلے سے زیادہ مقدار میں خریدنا شروع کر دیا گا۔

مسٹر ریورٹ کرناک نے مختلف تجارتی دکانوں کے اعداد فراہم کیے ہیں، کل ۱۴۰۴ دکانیں تھیں جن میں اہم یہ تھیں۔

۵۲۱ کپڑا فروخت کرنے والے۔ (۱۰ اگوشتے دیسی عمدہ کپڑا بننے والے۔ ۳۵۰ ڈھیڑ جو خود اپنا بنایا ہوا موٹا کپڑا فروخت کر رہے تھے)۔

۱۲۹ اشیائے خورونوش فروخت کرنے والے (۵۰ راب اور گڑ ۳۰ نمک اور ۴۴ مچھلی کی دکانیں تھیں)۔

۱۶۰ ترکاری بیچنے والے۔

۹۶ گھاس فروخت کرنے والے۔

۷۵ لوہا فروخت کرنے والے (گاڑی کے دھرے، ہل کے پھل اور کلہاڑیاں وغیرہ زیادہ ہوتی تھیں)۔

۷۰ تیل اور کھلی بیچنے والے۔

۶۵ پنساری یا کرانا فروش۔

غلے کی صرف تین دکانیں تھیں، البتہ خام روئی کی ۲۵ گاڑیاں بھی تھیں جن کو وہ ڈھیڑ آیندہ ہفتے کی کتائی اور بنائی کے واسطے خرید لیا کرتے تھے جو اپنا کپڑا فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ۳۵۰ موٹی قسم کا کپڑا بننے والوں میں سے صرف ۴۴ باقاعدہ تاجر تھے، باقی سب غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں کمر پر لاد کر لاتے تھے اور ان کی بکری بھی معمولی ہوتی تھی۔ دیہی جماعتی نظام کے اثرات واضح تھے، کسی زائد مقدار میں لوہے کا

۳۲۰

سامان فروخت کرنے والوں کی تعداد ۵، تھی، یہ وہ تاجر تھے جو گاڑی کے پہیوں اور ہل کے پھلوں کے لیے سارے ملک میں لوہا مہیا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ۱۵ بڑھیوں کی دکانیں تھیں جن کے پاس گاڑیاں بنانے کے لیے غیر تیار شدہ لکڑی ہوتی تھی، جوتوں اور چرمی سامان کی ۱۴ دکانیں تھیں اور مٹی کے برتن فروخت کرنے والے صرف تین تھے۔

دیسی بنے ہوئے کپڑے کی مقبولیت کے متعلق مسٹر پورٹ کرناک لکھتے ہیں کہ اُس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ بیشتر مقامات پر کسان جس کپڑے پر زیادہ گر تے ہیں وہ ڈھیڑوں کا بنایا ہوا ہی ہوتا ہے۔"

تمت
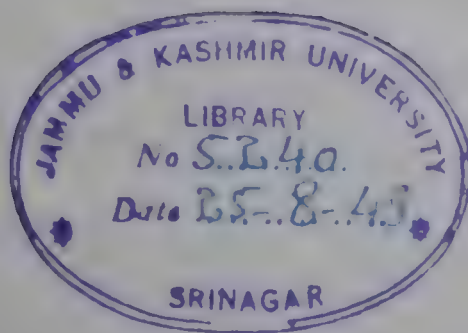
صحت نامہ

دورِ جدید میں ہندوستان کا صنعتی ارتقا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
دیباچہ ۱	۷	مغنیسہ	مغنیسیہ
"	۸	ونضرم	ولفرم
"	۹	البتہ	البتۃ
۲	۱۲	البتۃ	البتۃ
۵	۹	گرانہا	گرانبہا
دیباچہ طبع اول	۳	شایع	شایع
" ۷	۵	تعویر	تصویر
"	۱۹	ایک	یکسے
"	"	ذرایع	ذرائع
"	"	البتہ	البتہ
۸	۱	معینہ	معینہ
"	۶	تربیت	ترتیب
"	۱۳	لیس	ایس
باب اول تمہید دوم	۱۸	شہ	و
۳	۲۰	ماسکتا	جاسکتا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۲۴	جس	میں
۵	۱۰	سکا	سکے
۶	۱۹	فطل	فصل
۷	۲۰	بمشئی	بمبئی
۱۵	۱۲	نغفلی	نقلی
باب نہم ۱۹	۱۹	دندانسہ	دندانہ
۱۹	۲۵	رجے	بجے
۲۱	۸	سکیئے	سکیے
۲۷	۲	نسبتہً	نسبتاً
۳۱	۴	معرب	مغرب
۳۴	۴	ہوئے	ہوئے
۳۴	۱۶	لیبگنز	لیبکن
۳۵	۷	قحط کے	قحط کا
۳۷	۳	جارہے	جارہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷	۲۰	قیمتیں	قیمتیں	۹۸	(پیشانی)	چہارم	پنجم
۴۱	۵	رحجان	رجحان	״	۱۶	تجریہ	تجربہ
۴۲	۴	یہ	یۂ	۹۹	(پیشانی)	چہارم	پنجم
باب سوم ۴۳	۱۸	واٹسسن	واٹسن	۱۰۰	״	چہارم	پنجم
۴۵	۸	مدژاس	مدراس	۱۰۱	״	چہارم	پنجم
۴۶	۱۸	رایج	رائج	״	۱۶	طور	طور
״	۲۵	مدہ	مدد	״	۲۳	تھس	تھیں
۴۷	۱۷	دزگاپٹم	وزیگاپٹم	۱۰۲	(پیشانی)	چہارم	پنجم
״	״	ٹنجور	تنجور	״	۱۵	خاندیں	خاندیس
۴۸	۱۴	ضنائع	صنائع	״	۱۹	رحمان	رجحان
۴۹	۹	یرونی	بیرونی	״	۲۲	تخفیص	تخفیص
۵۸	۱۶	حاشہ	حاشیہ	۱۰۳	(پیشانی)	چہارم	پنجم
״	۲۱	سے	نے	״	۲۵	و	-
باب چہارم ۶۵	۲	انیسویں	انیسویں	باب ششم ۱۰۸	۱۷	حیز	چیز
״ ״ ۷۸	۲۰	ہیں	میں	۱۱۰	۲۴	مغرمی	مغربی
۸۱	(پیشانی)	ضنعتی	صنعتی	۱۱۲	۳	برہم ہتر	برہم پتر
۸۶	۲۳	پنجایت	پنچایت	۱۱۴	۴	دو اہنے	دبانے
״	۲۴	بیڈن	بیڈن	״	۱۴	انجنیری	انجینیری
باب پنجم ۹۲	۱۹	نیرا	نیرا	۱۱۷	۱۹	صوبہ بمبئی	صوبۂ بمبئی
۹۵	۲۵	سائنٹفک	سائنٹفک	۱۲۰	۵	بیان گیا	بیان کیا گیا
۹۶	۱۷	اگر	اگر	״	۱۹	خاندیش	خاندیس
۹۷	(پیشانی)	چہارم	پنجم	۱۲۱	۴	تھی	تھی کہ
				״	۱۱	خاندیش	خاندیس
״	۹	صر	سر	۱۲۳	۱۶	״	״

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲۸	۲۳	نتایج	نتائج	۱۶۵	۱۴	اسسطر	اوسط
باب ہفتم ۱۳۰	۲	ے	نے	۱۶۸	۱۳	متقداو	مقدار
"	"	اب	اپ	۱۶۹	حاشیہ سطر ۳	شہوں	شہروں
"	۴	جھوٹے	چھوٹے	۱۸۶	۱۴	ہوئی دو	ہوئی وہ
"	۱۸	پڑے	پڑا	۱۹۵	۱۱	خورد کلاں	خرد کلاں
۱۳۳	۶	معبولی	معمولی	"	۱۲	خورد	خرد
"	۶	مزوعہ	مزروعہ	۱۹۷	۵	کنتوں	کنٹوں
۱۳۴	۳	بیسیویں	بیسویں	"	۲۲	ہوجانے	ہوجانے سے
"	۴	انیسوں	انیسویں	"	حاشیہ سطر ۱	صوبہ بمبئی	صوبہ بمبئی
"	۹	نک	تک	۱۹۹	۵	کی نیشکر	کی نیشکر
۱۳۵	۱۱	مزوعہ	مزروعہ	۲۰۴	حاشیہ سطر ۱	دببر	دیبر
۱۴۲	۱۹	کاشت	کاشت	۲۰۵	۱۵	دیں	ریل
باب ہفتم ۱۴۷	۱	موٹے	موٹی	۲۰۷	۶	بھتے	جتھے
۱۴۹	۶	ذخیرے	ذخیرہ	۲۱۷	۲۱	متنزل	تنزل
۱۵۰	۹	پائدا	پائدار	۲۱۸	حاشیہ سطر ۲	دہریت	دہریت ہے
"	۲۳	خوب	خوب	۲۳۴	۶	وراخت	وراثت
۱۵۴	۱۲	کی	کا	باب دوازدہم ۲۴۱	۲۴	کمنیوں	کمینوں
"	۱۳	رہی	رہا	۲۴۳	۳	سندرجہ	مندرجہ
۱۵۵	۲۵	خاکا	خاکا	۲۴۴	۲۳	تحرگیک	تحریک
"	"	سنہ ۱۹۶ء	سنہ ۱۹ء	۲۴۸	۳	ششالوں	شالوں
۱۵۷	۱۳	اتنی	اتنا	"	۱۰	ھ	ہ
۱۵۸	۲۳	بالائی	بالائی	۲۴۹	۳	روعنی	روغنی
۱۶۳	۲	پرانی	پرانے	"	۱۰	ایمی	ابھی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۹	۱۲	رنگون	رنگوں	۳۶۹	۱۲	روک دیے	روک دے
۲۵۶	۶	ڈمیرول	ڈمیٹرول	۳۷۲	۶	کانی	کافی
۲۶۰	۲۵	بوچیر	بوچر	"	۱۵	گما	گیا
۲۶۲	۱۲	کی	×	۳۷۳	۱۰	جھریا	جھریا
۲۶۷	۶	فرمائیشات	فرمائشات	۳۷۴	۵	کمایوں	کمایون
۲۶۹	۴	تغاد	تعداد	۳۷۹	۸	گھڑسے	گھڑے
۲۷۱	۲۰	نسم	قسم	"	۱۲	نہزلزل	تزلزل
۲۷۲	۱۰	لے	کے	۳۸۳	۷	ٹنوں	ٹن
باب چہارم ۲۷۷	۲۵	ستفرق	متفرق	"	۱۲	سنگ بھوم	سنگ بھوم
۲۸۳	۱۴	تھیں لہ	تھی لہ	"	حاشیہ سطر ۱	قلعی دار	قلعی دار
۲۸۵	۱۴	پیدائیش	پیدائش	"	" " (۲)	بور	بعد
باب نہم ۳۰۰	۸	نیچ	نیج	۳۸۴	۱۱	اشارا	اشارہ
۳۲۱	۱	سیلے	مثلے	"	۱۷	مین	میں
"	۱۰	گڈھ ڈیوزن	گڑھ ڈیویژن	۳۹۳	۱۰	بہار واڑلیسہ	بہار واڑیسہ
"	۲۵	فکہ	بلکہ	"	۲۰	پیوانش	پوٹاش
۳۲۴	۱۲	معائینے	معائنے	"	۲۱	اگمی	اگئی
۳۳۰	۱۹	کے	کہ	۴۰۵	۲۳	روئی وانبے	روئی بانے
۳۳۱	۱۷	حالی ہی تیار	حال ہی میں تیار	۴۲۳	۱۹	مزمن	مزمن
۳۳۳	فٹ نوٹ ۱	تحقیر و ذرائع	تحقیر و ذرائع	۴۲۶	۱۳	تعصب	تعجب
۳۴۵	۱۳	تخفیف	تخفیف	"	۲۵	کردلے	کردیے
۳۵۰	۱۲	اشتمعی	اجتماعی				
۳۵۳	۸	اقرار رہی	برقرار رہی				
۳۶۳	۱۷	فولاد سکا	فولاد کا				